گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

فروری 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

ناہید سلطانہ اختر، عمیرہ احمد، نمرہ احمد،

عطیہ عمر، لبنیٰ عروج، ثمینہ عظمت علی

اور دیگر مقبول مصنفات کے قلم سے

دلکش افسانے، ناول اور ناولٹ

اندرونی صفحات میں ملاحظہ کریں





اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

افسانے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

جلد 39 • شمارہ 11 • فروری 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

ہر شخص مجھ سے محبت کرے، میرا احترام کرے اور میرے خیالات سے اتفاق کرے۔ ہر شخص میرے لباس کی تعریف کرے۔ ہر شخص مجھے پسند کرے...... ان خیالات کو احمقانہ کہا جاتا ہے۔

جس لمحے لوگ ہم پر تنقید کرنا چھوڑ دیں...... ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم مر چکے ہیں۔ جب تک آپ اس دنیا میں متحرک زندگی گزار رہے ہیں...... جب تک آپ اس دنیا میں کچھ کر رہے ہیں لوگ آپ سے اختلاف کرتے رہیں گے۔

اس دنیا میں کام کے آدمی صرف وہ ہیں جو دوسروں کی تنقید کی پروا نہیں کرتے۔

اپنے آپ پر اعتماد کیجیے۔ اپنے کام میں مصروف رہیے، اپنے مقصد حیات کے لیے جدوجہد کرتے رہیے...... اور پھر یاد رکھیے جن لوگوں پر تنقید نہیں ہوتی وہ صرف ایسے لوگ ہیں جو کچھ نہیں کرتے یا جن کی مستقل آرام گاہ قبرستان ہے۔

آپ نے اپنے خلاف بار بار زہریلے نشتر بھی سنے ہوں گے، آئندہ جب کبھی کوئی ایسی تلخ تنقید کرے تو صرف مسکرا دیجیے، یہ جملے اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ کامیابی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

حسد اور محبت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے...... اگر کوئی حاسد اپنے حسد کو محبت کے ریپر میں بھی استعمال کرے تو ہمیں تب بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس دنیا میں ہمیں حقیقت پسند بن کر رہنا چاہیے۔ جھوٹی تعریف ہو یا نقلی محبت...... اس کو پہچاننے کی ہم میں پرکھ ہونی چاہیے۔

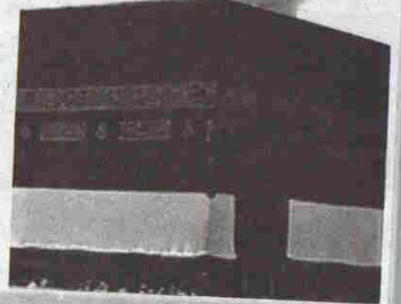
اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ آسمان سے تارے توڑ لانے کا عزم اچھا ہے لیکن محاورے کی حد تک...... عملی زندگی میں اپنی توقعات کو حقیقت پسندانہ رکھیے۔ جی ہاں......

مدیرہ
انجم انصار

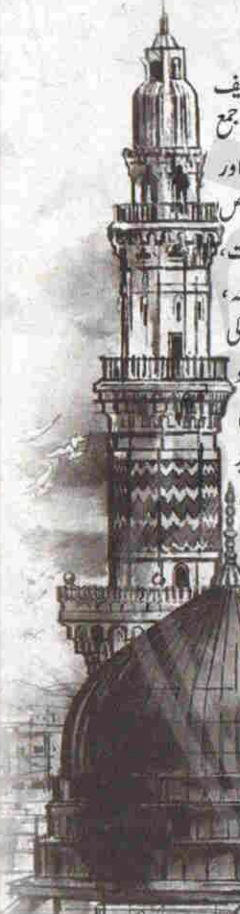


خبر دار ہو تم اے لوگو! دنیا کی زندگی میں تم ان کی طرف سے جھگڑ لیے (مگر) پھر ان کی طرف سے قیامت کے دن اللہ سے کون جھگڑا کرے گا یا (اس روز اللہ کے سامنے) کون ان کا وکیل بنے گا (۱۰۹) اور (جو شخص ان کی طرفداری سے توبہ کرے اللہ اس کو بخش دے گا اس لیے کہ) جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر اللہ سے معافی چاہے (تو بے شک) وہ اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ (۱۱۰) اور جو شخص کچھ گناہ کرتا ہے تو وہ اپنی (ہی) جان پر اس (کے وبال) کو (جمع) کرتا ہے (کسی کا کیا نقصان) اور اللہ دانا اور حکمت والا ہے (۱۱۱) اور جو شخص کچھ خطا کرے یا کوئی گناہ (عمداً اس سے ہو جائے) تو کسی بے گناہ کو اس سے متہم کرے تو بے شک اس نے (بڑا) بہتان اٹھایا اور ایک صریح گناہ (کا مرتکب ہوا) (۱۱۲) اور (اے نبی ﷺ) اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو بے شک ان (بدمعاشوں) میں سے ایک گروہ (جو) تمہیں گمراہ کرنا چاہتا تھا (وہ تمہیں گمراہ کر دیتا) اور (چونکہ تم پر اللہ کی مہربانی ہے اس لیے وہ) اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور تمہارا کچھ نقصان نہیں کر سکتے اور اللہ (کی مہربانی ہی کا ثمر ہے کہ اس) نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اور جو (علم) تم نہ جانتے تھے تمہیں تعلیم کیا اور اللہ کا فضل تم پر (بہت) بڑا ہے (۱۱۳)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۰۹ تا ۱۱۳)

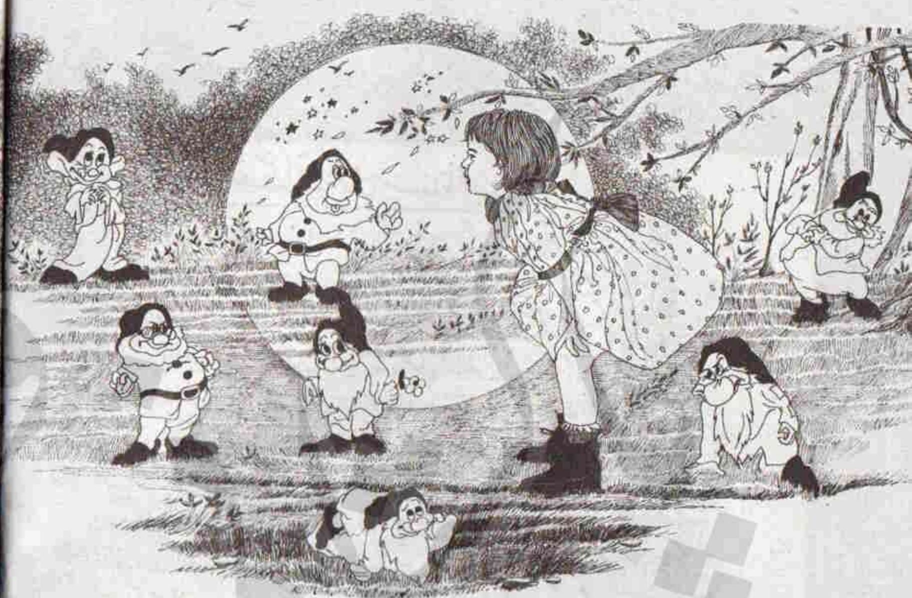


آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ



۷۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کی بزرگی اور قدر و تعریف کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں بہترین خصوصیات اس طرح جمع ہیں کہ جن کے کمال کی کوئی انتہا نہیں اور احاطۂ گفتگو میں نہیں آ سکتیں اور جو کوشش اور سبب سے پیدا نہیں کی جا سکتیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی خاص کسی کو عطا فرما دے مثلاً فضلیت، نبوت، رسالت، خلت، محبت، برگزیدگی، سیر ملکوت دیدار، قرب، نزدیکی، وحی، شفاعت، وسیلہ، درجۂ بلند (مقامِ محمود) براق، معراج، تمام دنیا کی طرف بعثت انبیا کی امامت انبیا اور ان کی امتوں پر شاہد، لواء الحمد کے حقدار، سید اولاد آدمؑ، رحمت اللعالمین صاحبِ کوثر، گزشتہ و سابقہ امور سے معافی، شق صدر، ذکر کا بلند ہونا، فتح کی عزت دینا، سکینہ کا اتارنا، ملائکہ کی تائید ہونا، کتاب و حکمت کا ملنا، امت کو پاک کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف ملانا، فرشتوں کا ان پر درود پڑھنا، لوگوں میں فیصلہ کرنا، اللہ کا آپ ﷺ کے نام اور زندگی کی قسم کھانا، مستجاب الدعوات ہونا، پتھروں و حیوانوں کا آپ ﷺ سے باتیں کرنا، آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے پانی کا پھوٹ نکلنا۔ رعب سے مدد دیا جانا، بادل کا سایہ ہونا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، ایسے علوم کا عطا ہونا جن کا احاطہ عقل نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے لیے دارِ آخرت میں ایسے بڑے درجے اور نیکیاں ہیں جو ماورائے عقل ہیں۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



قسط 7

عکس

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکا دینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے اِک فاصلہ مسلسل ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوف زدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے۔ جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط وضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔ ایک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیر دل کے کولیگ فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایبک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی مما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیر دل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے منگنی کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی غنی سے شادی متوقع ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میگنٹک چیس دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ شیر دل عکس مراد علی کو اکیڈمی میں ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے ایک ہفتے بعد دیکھا اور کچھ دنوں میں اسے لگا کہ عکس مراد علی کا من کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ عکس، شیر دل کے گھر ڈنر پر آتی ہے تو اس کی ملاقات شہر بانو سے ہوتی ہے۔ ڈی سی خیر دین کو نوکری سے نکال دیتا ہے اور اس کا ذمے دار چڑیا اپنے آپ کو سمجھتی ہے۔ خیر دین کی تھانے سے رہائی کے بعد خیر دین، چڑیا اور حلیمہ کو لے کر گاؤں چلا جاتا ہے۔ گاؤں میں جب سب کو خیر دین کی نوکری ختم ہونے کا پتا چلتا ہے تو ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ چڑیا کے اسکول کا نتیجہ جب خیر دین دیکھتا ہے تو سوچ میں پڑ جاتا ہے، باربی ڈول اپنی ممی کو بتاتی ہے کہ پاپا نے اسکول آکر سسٹر ایگنس سے چڑیا کو اسکول سے نکالنے کا کہا ہے۔ فاطمہ ایبک کو ڈیبٹ کے لیے اسٹیج پر جاتا دیکھ کر نروس ہو جاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

اپنے تنے ہوئے جسم کو حتی الامکان ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پہلی بار اس آئینے کو دیکھا، وہ اب بھی ویسے ہی وہاں کھڑا تھا۔ اپنے اسی استقبالی، خیر مقدمی انداز میں...... اسی غرور اور طنطنے کے ساتھ...... اسی پُراسراریت میں لپٹے جس نے پہلی بار اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برآمدے میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آئینے پر ایک نظر اور دوڑائی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد 26 سال بعد ہوئی تھی اور ان 26 سالوں کو اس نے جیسے ایک مونو سیکنڈ میں calculate کر لیا تھا۔ گھر کے اندرونی دروازے کو اس کے انتظار میں کھڑے ملازم نے کھولتے ہوئے اسے سلام کیا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا پی اے اس گھر کی تفصیلات سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا وہ اسے روک دے۔ اسے اس گھر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر اس کی یادداشت کا انمٹ حصہ تھا جسے کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے اس کے قدم فریز ہو گئے تھے۔ وہ سیڑھیاں اب اس کے سامنے تھیں۔ سیڑھیاں، چیخیں اور......

''وہ وہاں کچن کا دروازہ ہے۔'' پی اے کا جملہ اسے جیسے کرنٹ کی طرح لگا تھا جو اسے حال میں واپس لے آیا تھا۔ اس نے چونک کر ان سیڑھیوں سے نظریں ہٹائیں اور پی اے کو دیکھا۔

''پانی مل سکتا ہے؟'' اپنے اعصاب اور حواس پر بیک وقت قابو رکھنے کی کوشش میں اس نے لگاتار بولتے پی اے کو ٹوکا۔ پی اے فوری طور پر اس کی پیاس بجھانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنے گرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند منٹوں کے لیے ہی سہی لیکن مل گئی تھی۔ جسم میں سے گزرتی خوف کی ایک لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت رکھتے ہوئے earth کیا۔ غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اسی غیر محسوس انداز میں ہاتھ جھٹکتے اور نظریں چراتے ہوئے اس نے پانی کا وہ گلاس تھاما جو اس کے سامنے ایک ٹرے میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سانس میں وہ گلاس خالی کیا تھا۔ وہ گھر اسے کس طرح ہیبت زدہ کرنے والا تھا یہ اس کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس نے وہاں پوسٹ نہ ہونے کی مقدور بھر کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسیب زدہ گھر 26 سالوں کے بعد جیسے اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

''مجھے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے دیں۔'' پی اے نے اس کے پانی کا گلاس رکھتے ہی دوبارہ بولنا شروع کیا ہی تھا...... کہ اس نے اسے ٹوک دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ماتحت عملے نے کچھ حیران نظروں کا تبادلہ کیا لیکن پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہو لیے۔

گھر بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہاں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جسے اس نے ایک ہی نظر میں نہ پہچان لیا ہو۔ اسے رہائشی عمارت کا جائزہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس گھر نے اس کی زندگی میں ideal اور idealism نام کی چیز کو چھین لیا تھا اور بہت سارے سوال دے دیے تھے جنہیں

اس کا دماغ بہت سالوں تک کھوجتا رہا...... الجھتا رہا...... ناکام ہوتا رہا...... اور پھر جب بالآخر اسے جواب ملا تھا تو بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت نے اگلے کئی سال اسے اپنے حصار میں رکھا اور بے یقینی وہ واحد شے نہیں تھی جو بہت عرصے اس کے ہمراہ رہی تھی...... ایک ناقابلِ بیان اذیت بھی، شرم اور دکھ کا ایک عجیب احساس بھی اور ان تمام احساسات کے درمیان وہ ایک چہرہ بھی جو اپنی آنکھوں میں خوف اور دہشت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ صرف چند سیکنڈز کے لیے ملنے والی وہ نگاہ جس کا تصور بھی اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔

اوپر والے فلور کے تقریباً تمام کمرے لاکڈ تھے۔ اس نے کسی کمرے کو نہیں کھلوایا۔ وہاں اب ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھنے کی اسے خواہش تھی۔ اس گھر کا ماسٹر بیڈ روم بھی لاکڈ تھا اور صرف وہ واحد کمرا تھا جس کے دروازے کے باہر اس کے قدم چند لمحوں کے لیے فریز ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کمرے میں جانے کی شدید خواہش نے اسے آن گھیرا تھا پھر اس نے اسی رفتار سے اس خواہش کو جھٹک دیا تھا۔

''باہر چلتے ہیں۔'' اس نے جیسے منٹوں میں عمارت کے اندرونی جائزے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اندر کھڑے بہت سی چیزوں اور یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو غرق ہونے سے بچانے کی جیسے ایک اور کوشش کی تھی۔

عمارت کے اردگرد موجود لان پہلی نظر میں اسے ویسا ہی لگا تھا...... اور دوسری نظر نے اسے وہ خاردار جھاڑیاں، کھوکھلے ہوتے تنے اور سوکھے ہوئے پیڑ پودے دکھانے شروع کر دیے تھے جو بظاہر اس تراش خراش کے دم پر کھڑے تھے جو یقیناً اس کی آمد سے ایک دن پہلے کی گئی تھی۔ 26 سال پہلے وہ لان اس حالت میں نہیں تھا...... نہ وہ لان نہ وہاں کے درخت اور پودے اور نہ ٹینس کا وہ کورٹ جس پر آخری میچ یقیناً سالوں پہلے کھیلا گیا تھا۔ سب کچھ بوسیدہ اور خستہ حال تھا ان تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے وہ کاٹ اور چبھن کھو چکی تھیں جس نے اس کے بچپن کے ایک بڑے حصے کو بے حد بے رحمی سے لہولہان اور مسخ کیا تھا۔

''اس طرف سرونٹ کوارٹرز ہیں۔'' پی اے نے اسے کسی رہنمائی کا انتظار کیے بغیر لان کے عقبی حصے میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ اس کو ڈی سی کے انداز میں اس عمارت کے لیے ایک عجیب سی familiarity (مانوسیت، واقفیت) نظر آ رہی تھی۔

''پتا ہے۔'' اس کے انداز میں واقعی ہی ایک عجیب سی مانوسیت تھی اس گھر کے لیے۔ کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا تب بھی اس کے لیے عمارت کے عقبی حصے میں اس جگہ جانا دشوار نہ ہوتا۔ اس کے قدم اب جس رستے پر تھے وہاں اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری تھیں۔ کچن کے عقبی دروازے سے کئی فرلانگ دور، عمارت کے بالکل عقب میں، وہاں اب وہ کوارٹر نہیں تھا۔ چند لمحوں کے

لیے اس نے اپنے آپ کو اسی شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے 26 سال پہلے اس رات محسوس کی تھی۔

وہ closure اب بھی نہیں ہوا تھا جس کی خواہش اسے وہاں تک لے آئی تھی۔ وہ آسیب اب بھی اس کے وجود کے اندر ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ایبک فرنٹ رو میں اس مباحثے کے دوسرے مقررین کے ساتھ بیٹھا اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتی فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلی بار ایچی سن کی ٹیم میں شامل ہو کر کسی انٹر کالجیٹ مقابلے میں شریک ہونے آیا تھا۔ کنیئرڈ کی ٹیم ہمیشہ سے ہی ایک سخت حریف رہی تھی ان کے لیے...... اور ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کے اضافی advantage کے ساتھ وہ اس بار کچھ اور بھی deadly ہو سکتی تھی۔ اس کے برابر بیٹھے اس کے ٹیم میٹ اکبر علی نے اسے اسٹیج پر چڑھتی ہوئی فاطمہ کے بارے میں انفارم کرنا شروع کیا۔ وہ کنیئرڈ کالج کا Ace تھی۔ کم سے کم اکبر کی باتوں سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ بہت سے مقابلوں میں اس لڑکی کے ہاتھوں ٹرافی گنوا چکا تھا۔ فلک شگاف تالیوں کی گونج میں اس سے آٹھ دس گز دور اس کے تقریباً بالمقابل اس لڑکی نے روسٹرم سنبھال لیا تھا۔

ہال میں اب پن ڈراپ سائلنس ہو گئی تھی۔ اس لڑکی پر نظریں جمائے ایبک کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ رینگی۔ یہ وہ پروٹوکول تھا جو آڈینس صرف ایک چیمپئن ڈبیٹر کو دیتا تھا۔ اس لڑکی کی تقریر میں اس کی دلچسپی اور تجسس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اب روسٹرم پر لگا مائیک ٹھیک کر رہی تھی اور اس وقت پہلی بار ایبک نے اسے نروس محسوس کیا...... اور اگر ایسا تھا تو ایک حریف کے طور پر یہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے کی سب سے اچھی خبر تھی۔ وہ اتنا ہی mean تھا جتنا کسی بھی مقابلے کے حریف ایک دوسرے کے لیے ہو سکتے تھے خاص طور پر اس صورت میں جب مدِمقابل صنفِ نازک ہو اور اس کی کامیابی کے قوی امکانات ہوں۔ ایبک کو وہاں نیچے بیٹھے اگر کسی بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا تو وہ یہ تھا کہ اس لڑکی کی نروس نیس کی وجہ وہ خود تھا۔ وہ اگر اسٹیج سے نیچے بیٹھا اس پر نظریں جمائے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا تو وہ روسٹرم کے سامنے کھڑی اس کو نہ دیکھنے کے باوجود اس کے وجود سے کسی پہاڑ میں دبے آتش فشاں کی طرح باخبر تھی۔

ایبک نے مباحثے کے آغاز میں چند ہی جملوں کے بعد اسے پہلی بار یک دم خاموش ہوتے دیکھا۔ وہ واضح طور پر تقریر بھولی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ غلطی نوٹس ہوتی کنیئرڈ کی ٹیم اور ہال میں بیٹھی آڈینس نے تالیاں پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ کسی مقرر کی غلطی کو کور اپ کرنے کا سب سے بہترین طریقہ...... ایبک اور وہاں بیٹھے دوسرے کالجز کے مقررین میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑی تھی۔ تقریر بھولنا اور شروع کے چند سیکنڈز میں ہی بھولنا کسی مقرر کے لیے کتنا demoralising تھا وہ سب جانتے تھے۔ فاطمہ کی تقریر میں سب کا انہماک پہلے ہی تھا۔ اب اشتیاق بھی بڑھ گیا تھا۔

تالیوں کی تھمتی گونج میں ایبک نے فاطمہ کو تقریر کا دوبارہ آغاز کرتے سنا۔ وہ پھر شروع سے تقریر کر

رہی تھی بجائے اسی جملے سے شروع کرنے کے جہاں سے وہ بھولی تھی۔ جس کا مطلب تھا اس کی تین منٹ کی تقریر اب چند سیکنڈز کے ضائع ہونے سے تین منٹ سے اوپر ہی جانے والی تھی، اگر وہ درمیان میں کہیں بے حد شاندار پرفارم کرتے ہوئے تیز رفتاری سے ان چند سیکنڈز کو کور نہ کر لیتی تو...... کنیئرڈ کی ٹیم یک دم ٹینس نظر آنے لگی تھی۔ ان کی ٹیم پرفارمنس کا آغاز کیپٹن کی غیر متوقع بری پرفارمنس سے ہوا تھا۔ 30 سیکنڈ کے بعد ان کی کیپٹن ایک بار پھر پہلے اٹکی تھی، پھر دوبارہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ ایبک نے بے حد ریلیکس انداز میں اپنی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگالی...... ویسا ہی اطمینان وہاں بیٹھے تمام شرکا کی باڈی لینگویج میں چھلکنے لگا تھا۔ اس لیول کے مقابلے میں تقریر کے دوران دو بار بھولنا، ایک بار اٹکنا آپ کو ٹاپ تھری پوزیشنز سے باہر کرنے کے لیے بہت کافی تھا...... اور فاطمہ اب پوزیشنز کی دوڑ سے باہر تھی۔

تقریر کے اختتام تک وہ دو اور غلطیاں بھی کر چکی تھی اور ہر غلطی کے بعد اس کی نروس نیس بڑھتی گئی تھی۔ ایبک نے اس کی باقی کی تقریر زیادہ دلچسپی کے بغیر سنی تھی۔ اسے اب کنیئرڈ کی دوسری ڈبیٹر کا انتظار تھا۔ فاطمہ جس شاندار استقبال کے ساتھ اسٹیج پر آئی تھی اتنی ہی خاموشی کے ساتھ وہ اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد اسٹیج سے ہٹی تھی۔ وہ پن ڈراپ سائلنس جو ایک چیمپئن ڈبیٹر کو پروٹوکول کے طور پر دی گئی تھی وہ اب اس کی غیر متوقع خراب پرفارمنس پر بے یقینی کی کیفیت اختیار کر گئی تھی۔ فاطمہ جھکے کندھوں اور سر کے ساتھ بے حد خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اتر رہی تھی۔ اس وقت دوسری بار ایبک کو لگا وہ اس چہرے کو پہلے کہیں دیکھ چکا تھا...... کہاں؟ ایک لمحے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے وہ الجھا۔ اسے یاد نہیں آیا...... شاید کہیں...... ایسی ہی کسی debate یا declamation (مقابلہ خطابت) میں کہیں۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو جواب دینے کی کوشش کی۔ کسی مقابلے کے علاوہ وہ کنیئرڈ کی کسی لڑکی سے کہاں مل سکتا تھا، لیکن مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایبک نے بہت کم تقریری مقابلوں میں کسی تماشائی کے طور پر شرکت کی تھی اگر اس نے فاطمہ کو کسی جگہ ایک مقرر کے طور پر دیکھا ہوتا تو وہ اسے کسی نہ کسی حد تک یاد ہوتی...... اور اس سب کے باوجود اس لڑکی کا چہرہ اسے بہت شناسا لگا تھا۔

''کیا ہو گیا تم کو آج؟'' اپنی سیٹ سنبھالتے ہی اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی نوین کو کہتے سنا۔ فاطمہ جواب نہیں دے سکی۔ اسٹیج پر اب نوین کا نام لیا جا رہا تھا۔ وہ اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ فاطمہ گم صم اس کو اسٹیج پر چڑھتا دیکھتی رہی۔

''کیا ہوا؟'' مسز انیلا غفران اس کے پاس آکر چند لمحوں کے لیے بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی۔ انہوں نے کبھی فاطمہ کو اس سے پہلے اسٹیج پر آج جیسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ فاطمہ کے پاس اپنی اس خراب کارکردگی کے لیے کوئی ایکسکیوز نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

وہ نوین صلاح الدین کا دن تھا۔ اس نے اسٹیج پر وہ کسر پوری کر دی تھی جو فاطمہ نے چھوڑی تھی۔ کنیئرڈ ٹرافی ایبک اور اکبر کی ٹیم کے ہاتھوں ہارا تھا لیکن پہلی پوزیشن نوین نے لی تھی۔

فاطمہ نے ایبک کو دوسری پوزیشن لیے اکبر کے ساتھ شیلڈ اور ٹرافی لینے کے لیے دوبارہ اسٹیج پر آتے دیکھا تھا۔ ہر بار اسے دیکھتے ہوئے وہ درد کے ایک سمندر سے گزر رہی تھی۔ وہ مقابلہ، وہ ٹرافی، وہ تقریر...... کچھ معنی نہیں رکھتی تھی اس کے لیے۔ اس کے نزدیک اہم صرف ایک شے تھی اسے پہچانا نہ جائے...... وہ اسے شناخت نہ کرے۔ اس نے تین منٹ کی وہ تقریر جیسے ایک شناخت پریڈ کے دوران اپنی ایک خواہش کے ساتھ ایڑیاں رگڑتے گزارے تھے۔ وہ فاطمہ کی زندگی کی آخری انٹر کالجیٹ ڈبیٹ تھی۔

☆☆☆

''تم کیوں چاہتے ہو کہ چڑیا اسکول چھوڑ دے؟'' سوال اتنا اچانک اور ڈائریکٹ تھا کہ کچھ دیر کے لیے وہ جواب ہی نہیں دے سکا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈنر کے بعد اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے آئے تھے۔ جب اس نے اپنی بیوی کے منہ سے یہ بات سنی۔ کوئی تردید یا جھوٹ فی الحال خطرناک ثابت ہوتا خاص طور پر جب اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اس کی بیوی کو یہ بات کس سے پتا چلی ہے اور وہ کس حد تک ''کیا'' جانتی تھی۔ پہلا شک اسے باربی ڈول پر ہوا تھا اور اگر وہ اس کی بیوی کی source of information تھی تو پھر معاملہ خطرناک نہیں ہوا تھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ وہ اس اسکول میں پڑھے جہاں میری بیٹی پڑھتی ہے۔'' اس نے کسی سوال جواب کے بغیر اپنی بیوی سے کہا تھا۔ اس کی بیوی کے لیے اس کا جہاں اتنی آسانی سے اسے سوال کا سیدھا جواب دے دینا غیر متوقع تھا وہاں جواب اس سے زیادہ شاکنگ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بے یقینی سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ چند مہینے پہلے تک یہی شخص خیر دین کو ڈیوٹی آورز کے دوران اپنی نواسی کو اسکول سے لانے، لے جانے کی اجازت دیے ہوئے تھا اور اب یک دم یہ......

''کیوں؟'' اس نے اس شاک سے جیسے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں نہیں چاہتا وہ میری بیٹی سے ملے۔'' جواب اب بھی اتنا ہی احمقانہ تھا۔

''تم اگر یہ چاہتے ہو کہ ہماری بیٹی اس سے نہ ملے تو تمہیں یہ بات اپنی بیٹی کو سمجھانی چاہیے چڑیا کو اس کے لیے اسکول سے نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اس پر غور کروں گا۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنے شوہر سے کیا کہے۔ وہ آج زندگی میں دوسری بار اسے بے تکی اور احمقانہ باتیں کرتا نظر آیا تھا۔ پہلے بھی یہ خیر دین کا معاملہ تھا جس پر اس نے اپنے شوہر کو بدحواس پایا تھا اور آج پھر یہ اس کی نواسی کا مسئلہ تھا جس پر اسے اپنا شوہر کچھ عجیب بوکھلایا نظر آیا تھا۔

''تم مجھ سے اپنا پرابلم شیئر کیوں نہیں کر رہے؟'' وہ بالآخر جیسے اس بلی چوہے کے کھیل سے تنگ آگئی تھی یا پھر اس معمے کو خود حل کرتے کرتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

''کیا شیئر کروں تم سے؟'' وہ اس کے سوال نما اعتراض پر عجیب سے انداز میں ٹھٹکا تھا۔

''وہ صرف تم جانتے ہو کہ تم کیا شیئر نہیں کر رہے مجھ سے...... لیکن معاملہ صرف خیر دین کا چور ہونا اور چڑیا کا اس کی نواسی ہونا نہیں ہے۔'' وہ چند لمحے جیسے ہونقوں کی طرح اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اسے اپنی

بیوی کی بات سمجھ ہی نہ آپائی ہو...... یا سمجھ میں آنے کے بعد بھی وہ یہ تسلیم نہ کر پا رہا ہو کہ اس کی بیوی اتنے واضح الفاظ میں اس پر اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کرے گی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟" ایک typical مرد کی طرح اس نے جواب نہ دے پانے پر بلند آواز میں اس پر چلا کر اسے خائف کرنے اور موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی بیوی کی آواز ہی نہیں نکل سکی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس پر چلایا تھا اور کس بات پر چلایا تھا۔ اس نے شدید بے عزتی محسوس کی تھی۔

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے سچ بولو۔" وہ اس بار اور ڈائریکٹ ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"سچ؟...... کیا جھوٹ بول رہا ہوں میں تم سے؟" اس نے اب بھی چلاتے ہوئے ہی کہا تھا۔

"یہ میں تم سے جاننا چاہ رہی ہوں کہ تم کیا جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے؟" اس نے بھی اسی انداز میں چلاتے ہوئے شوہر کو جواب دیا۔ شادی کے اتنے سالوں میں آج پہلی بار وہ ایک دوسرے پر یوں چلا رہے تھے۔

"مجھے پورا حق ہے کہ میں ایسے کسی شخص کی اولاد کو اپنی بیٹی سے دور رکھوں جس سے مجھے نقصان پہنچا ہو۔" اس کے شوہر نے ایک بار پھر اپنی اسی بات کو ترمیم شدہ الفاظ میں دہراتے ہوئے کہا۔

"تم نے ممی کو کہا ہے کہ وہ پاپا سے کہہ کر تمہاری ٹرانسفر یہاں سے کروا دیں کیونکہ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" وہ بول نہیں سکا۔ یہ ایک غیر متوقع وار تھا اس کی بیوی کی طرف سے۔

"میں نے تم سے کب کہا کہ پاپا کو کہہ کر یہاں سے اپنی ٹرانسفر کرواؤ؟" وہ اب بھی اسی انداز میں بول رہی تھی اور اپنے شوہر کے بدلتے تیور اسے بری طرح خفا کر رہے تھے۔

"تم سے کس نے کہا؟" اس کے شوہر کی آواز یک دم کمزور ہوئی۔ جواب معلوم ہونے کے باوجود اس نے پتا نہیں کیا سوچ کر اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔ چیزیں اگر کھلنے پر آتی ہیں تو کھلتی ہی کیوں چلی جاتی ہیں؟ اس نے ایک جھنجلاہٹ کے ساتھ سوچا تھا۔

"ممی نے بتایا ہے مجھے اور کون بتائے گا۔"

"میں نے پاپا سے بہت پہلے بات کی تھی ٹرانسفر کی...... اب نہیں کی۔" اس کے شوہر نے کہا وہ اب اپنے بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ ڈھونڈنے بیٹھ گیا تھا۔ جھوٹ کا سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ جاتا ہے۔ بڑے جھوٹ چھوٹے جھوٹ...... پھر ان سے چھوٹے۔ اس خاندان کا کوئی ایک فرد بھی مس ہو جائے تو پورا خاندان جھوٹ جھوٹ پکارنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی آج یہی ہو رہا تھا ایک جھوٹ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد اب اسے اس کے پورے خاندان کی ضرورت پڑ گئی تھی...... جھوٹ جھوٹ کی اس پکار کو دبانے کے لیے۔

"میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ تم یہاں سے ٹرانسفر کرواؤ۔ اس کی بیوی نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"اس گھر میں اثرات ہیں...... تمہیں ہی ایشو تھا...... تم ہی ہر وقت مجھے قصے سناتی رہتی تھیں کہ آج یوں ہوا اور آج یوں ہوا۔" اس کا شوہر ایک بار پھر اس پر الٹ پڑا۔ اسے اب اس قضیے کو لپیٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں ہزار اسٹوریز سنائی ہوں گی لیکن کبھی بھی تمہیں ٹرانسفر کے لیے نہیں کہا۔" اس کی خفگی کو شوہر کی تیز آواز نے ایک بار پھر بڑھایا۔

"میں اپنی بیٹی کی وجہ سے یہاں سے جانا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا اس گھر میں اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے۔" اس کے شوہر نے ایک بار پھر اپنا بیان بدلا۔ وہ ایک بار پھر اپنے شوہر کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

"ایک سال ہو رہا ہے اس گھر میں ہمیں...... تمہیں آج خیال آیا ہے کہ یہاں تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟" اس نے بے حد تلخی سے اپنے شوہر سے کہا۔ وہ اسے سچ نہیں بتا رہا تھا کم از کم اس کے لیے اسے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ چھپا کیا رہا تھا اس کا سر پیر بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"کافی بحث کر چکا میں تمہارے ساتھ...... اب مزید نہیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو اور مجھے یہ مت بتاؤ کہ مجھے کس معاملے میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ تمہاری ساری زندگی پاکستان سے باہر گزری ہے۔ تمہیں کیا پتا پاکستان میں کیسے رہا جاتا ہے اور کسی مسئلے کو کیسے حل کیا جاتا ہے۔" اس کے شوہر نے بالآخر زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک چیز انسانیت ہوتی ہے اور اسے سمجھنے اور پریکٹس کرنے کے لیے مجھے کسی خاص جگہ رہنا ضروری نہیں ہے۔" اس نے اسی تلخ انداز میں اپنے شوہر سے کہا تھا۔ وہ بھی اب اتنی ہی زچ ہونے لگی تھی اس جگسا پزل سے جو حل ہونے پر ہی نہیں آ رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کا شوہر پھر ٹھٹکا۔

"تم ایک آٹھ نو سال کی بچی کو ایک بڑے کی کسی غلطی پر سزا نہیں دے سکتے۔" اس نے دوٹوک انداز میں اپنے شوہر سے کہا۔

"وہ بھی چور ہے...... وہ بھی اچھی لڑکی نہیں ہے۔" وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔

"تب بھی...... تو بھی۔" اس کی خاموشی زیادہ دیر قائم نہیں رہی تھی۔ اس کے لہجے کی قطعیت نے اس کے شوہر کو عجیب طرح سے سلگایا۔

"تم چڑیا کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہی ہو؟ تم کو نوکروں کے بچوں اور ان کی سائیکی سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اس کے شوہر نے اپنی بیوی کی طرف داری کو بدلنے کی کوشش کی۔

"مجھے دلچسپی ہے بھی نہیں کسی کی سائیکی سمجھنے یا جاننے میں...... مجھے اگر دلچسپی ہے تو صرف ایک چیز میں...... اور وہ یہ کہ تم چڑیا کو اس اسکول سے نکالنے کی کوشش کرنا بند کر دو۔ خیر دین نے چوری کی ہے یا جو بھی کیا ہے اب اس chapter کو بند ہو جانا چاہیے کیونکہ یہ میری بیٹی کو affect کر رہا ہے۔ تم اپنی بیٹی کو اپ

سیٹ کر رہے ہو ان تمام چیزوں سے۔"

"میں اپنی بیٹی کو اپ سیٹ کر رہا ہوں؟" وہ جیسے بے یقینی میں بولا تھا۔ "میری اکلوتی اولاد ہے وہ...... میں اسے اپ سیٹ کروں گا؟ میں جو بھی کر رہا ہوں اس کے تحفظ کے لیے کر رہا ہوں۔"

"مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو...... کیوں چھپا رہے ہو صرف یہ نہیں پتا مجھے...... نہ ہی مجھے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ خیر دین کا حوالہ چڑیا کو میری بیٹی کے لیے اتنا خطرناک کیوں بنا رہا ہے کہ تم اسے اس اسکول میں بھی دیکھنا نہیں چاہتے جہاں تمہاری بیٹی ہے۔"

"میں اب اس ایشو پر تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔" اس کا شوہر یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں سونا ہے سو جاؤ...... بیٹھنا ہے بیٹھ جاؤ...... لیکن میرا دماغ چاٹنا بند کر دو۔" وہ بے حد درشتگی سے کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اوپر اپنی اسٹڈی میں جا کر ڈرنک کرے گا اور ایک دو گھنٹے کے بعد آ کر چپ چاپ سو جائے گا۔ غصے اور ڈپریشن میں وہ شاید آج زیادہ پیے گا...... لیکن وہ اس موڈ میں نہیں تھی کہ اسے منانے کی کوشش کرتی یا اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی...... شادی کے اتنے سالوں میں یہ ضرورت اسے کبھی پڑی بھی نہیں تھی۔ وہ کبھی خفا بھی ہوتا تو بہت دیر تک اپنی خفگی برقرار نہیں رکھ پاتا تھا۔ وہ اس کی کمزوری تھی...... وہ اس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

شادی کے اتنے سالوں میں اس نے کبھی بے مقصد اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑے کیے بھی نہیں تھے۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی اپنے شوہر کے regular drink کرنے کو بھی کبھی قابلِ اعتراض نہیں سمجھا تھا۔ وہ ساری عمر امریکا میں رہی تھی اور اس کی فیملی جتنی آزاد خیال تھی اس میں شراب کو ایک سوشل ڈرنک کے طور پر acceptance تھی۔ اس کا شوہر ویسے بھی شراب پی کر کبھی اتنا آؤٹ نہیں ہوا تھا کہ اسے اور اس کی ازدواجی زندگی کو کسی قسم کا خطرہ ہو جاتا۔

اب یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے رویے سے ناخوش ہو رہی تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ اسے اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑنا پڑ رہا تھا اور ایشو بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے نہیں پتا اس کا شوہر دوبارہ اس کی بیٹی کے اسکول گیا یا نہیں لیکن دو دن بعد اس نے ناشتے کی ٹیبل پر اسے اپنے ٹرانسفر کی خوش خبری سنا دی تھی۔ اس نے بے حد خاموشی سے کچھ بھی کہے بغیر ناشتا کرتے ہوئے یہ خبر سنی اور کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے شوہر نے چند منٹ چائے کے سپ لیتے ہوئے جیسے اس کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ میرا پی اے لے آئے گا۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اگلا جملہ بولا۔ اس بار وہ ناشتا کرتے ہوئے ٹھٹکی۔ اس ہدایت کا مفہوم تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ باربی ڈول کے اسکول جائے۔

"میں اسکول جا کر یہ کام خود کروں گی۔ یہ اس کا پہلا اسکول ہے، ٹھیک ہے وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رہی لیکن ہمیں جانے سے پہلے good will gesture کے طور پر اس کے ٹیچرز سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"تم چاہتی ہو میں بھی ساتھ جاؤں؟" اس کے شوہر نے جواباً کہا۔

"تمہاری مرضی ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی لیکن میں ضرور جاؤں گی۔" اس نے اپنے شوہر کو کسی قسم کا مشورہ دینے کے بجائے کہا۔

"میں بھی جاؤں گا۔" وہ حیران ہوئی۔ اسے اپنے شوہر سے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اس نے ساتھ ہی اطمینان کا سانس بھی لیا تھا۔

وہ ایک ہفتے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ اپنی بیٹی کا اسکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لینے گئی تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک پرنسپل آفس کے وزیٹرز روم میں بیٹھے رہے تھے لیکن سسٹر ایگنس نے انہیں ملاقات کے لیے اندر نہیں بلوایا تھا۔ اس کے شوہر کا پارا ایک بار پھر آسمان کو چھونے لگا تھا۔ وہ ساتھ نہ ہوتی تو اس دن اس کے شوہر اور سسٹر ایگنس کے درمیان ایک اور جھگڑا ہوتا۔ سسٹر ایگنس نے ان سے ملاقات نہیں کی تھی لیکن اس کی ہدایات پر اس کے ماتحت عملے نے اس کی بیٹی کا سرٹیفکیٹ فوری طور پر بنا دیا تھا۔

وہ دونوں سسٹر ایگنس سے ملاقات کا انتظار کر کر کے اٹھ کے وہاں سے آ گئے تھے اور باہر نکلتے ہی اس کے شوہر نے بے حد خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا نا کیسا attitude ہے اس سسٹر کا...... اور تمہیں شوق تھا good will gesture دکھانے کا...... میری اگر یہاں سے ٹرانسفر نہ ہو گئی ہوتی تو میں اس سسٹر کا دماغ درست کر دیتا۔" اس کا شوہر واپسی پر تمام راستے بکتا جھکتا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے اسکول میں ایڈمیشن کے دوران اور بعد میں کئی بار سسٹر ایگنس سے مل چکی تھی اور وہ اسے ہر بار بہت اچھی لگی تھی۔ وہ ویسی ہی ایک نن تھی جیسی نن سے وہ خود کچھ عرصے پڑھی تھی۔ مشفق، دوستانہ، صاف گو اور اصول پرست۔ اب اگر وہ اپنا اسکول چھوڑ کر جانے والی ایک بچی کے والدین سے ان کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی ملنے پر تیار نہیں ہوئی تھی تو وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ ان کا اور اس کے شوہر کا جھگڑا کس حد تک گیا ہوگا۔ وہ خاموش بیٹھی بوجھل دل کے ساتھ اپنے شوہر کی باتیں سنتے ہوئے سسٹر ایگنس کی خفگی دور کرنے کے لیے ایک آخری کوشش کرنے کا سوچتی رہی۔ اس شہر سے جانے سے پہلے اس نے فون پر سسٹر ایگنس سے رابطہ کرنے کی ایک آخری کوشش کی تھی۔ یہ کوشش بھی ثمر آور ثابت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسکول چھوڑ کر جانے سے پہلے باربی ڈول نے بھی چڑیا سے ملنے، بات کرنے اور اسے یہ بتانے کی بار بار کوشش کی تھی کہ وہ لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ اپنے باپ کی تمام تاکیدوں اور تنبیہوں کے باوجود

بھی ......لیکن وہ اس میں ناکام رہی تھی۔ چڑیا اب پہلے جیسی چڑیا نہیں رہی تھی۔ وہ باربی ڈول کو میلوں دور سے بھی دیکھ کر رستہ بدل جاتی تھی اور اگر وہ کسی بات پر جھنجلاتی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ باربی اس کی طرف کیوں آتی تھی۔ اپنا وقت اس کے کلاس روم کے باہر بار بار چکر لگانے میں کیوں ضائع کرتی تھی۔ باربی ڈول اس کی کلاس کے چکر لگانا شروع کرتی اور چڑیا کلاس کے اندر بیٹھی ٹینس ہونا شروع ہو جاتی۔ رائٹنگ بورڈ پر لکھی جانے والی چیزیں سمجھنا یک دم اس کے لیے مشکل ہونے لگتا۔ ٹیچر کی آواز سن کر بات سمجھنا ایک اور دشوار کام ہوتا۔ اور کلاس میں بیٹھی اپنی دوست کے جملوں کو نظر انداز کرنا اس سے بھی بڑا جو باربی ڈول کو کہیں نمودار ہوتے دیکھتے ہی اسے بڑے اشتیاق سے بتاتی۔ ''باربی ڈول آ گئی ہے۔'' اور پھر یہ جملہ باربی ڈول کے ہر چکر پر بولا جاتا۔

''تم باربی ڈول سے ناراض ہو گیا؟'' شروع کے چند دنوں کے بعد ہی اس کی دوست نے اس کا بدلا ہوا رویہ نوٹس کر لیا تھا۔

''وہ میری فرینڈ نہیں ہے پھر میں اس سے کیوں ناراض ہوں گی؟'' اس نے جواباً بہت سوچ کر کہا اور اس کے جواب نے اس کی دوست کو مزید حیران کیا۔

''لیکن تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ باربی ڈول تمہیں اچھی لگتی ہے اور تم نے اسے دوست بنا لیا ہے۔'' چڑیا نے اپنی دوست کی بات کا جواب خاموشی سے دیا تھا۔ وہ اپنی دوست کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کے لیے باربی ڈول کے نظر آنے پر اسے نظر انداز کرنا مشکل ترین اور بے حد صبر آزما کام تھا، وہ اپنے نانا کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی جو اَب باربی ڈول سے اس کا کسی بھی طرح کا رابطہ نہیں چاہتے تھے......اور وہ نو سالہ بچی روز اسکول آ کر دل اور دماغ کی ایک عجیب سی کشمکش میں الجھتی دن گزارتی۔ بچے بڑوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔ ان کی زندگی کی تکلیف، اذیت، حادثہ یا trauma کچھ بھی ان کو بڑوں جیسا سخت دل اور unforgiving (معاف نہ کرنے والا) نہیں کرتا تھا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں کسی بھی لاشعوری کوشش کے بغیر، چڑیا بھی شاید یہی کرتی اور نہ چاہنے کے باوجود وہ باربی ڈول سے بات کرنا شروع کر دیتی اگر تب ہی باربی ڈول کا باپ اس کی زندگی میں ایک بار پھر ایک سیاہ کردار کے ساتھ نمودار نہ ہو جاتا۔

☆☆☆

خیر دین کے گاؤں سے واپس شہر چلے جانے کے فیصلے کا اس کے خاندان نے بے حد گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ ان چند مہینوں میں شروع کے چند دنوں کے بعد اب دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے خاندان والے یک دم خیر دین سے خوش دلی سے بات چیت کر رہے تھے۔ اور یہ خوش دلی خیر دین کے چلے جانے تک قائم رہتی اگر خیر دین اپنی زمین بیچنے کے ارادے کا اظہار نہ کرتا۔ خیر دین زمین کو بیچنے کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی مجبور تھا۔ شہر جا کر دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کے لیے اسے تھوڑے بہت سرمائے کی ضرورت تھی اور وہ رقم اسے وہ زمین ہی دے سکتی تھی جو اس کی ملکیت ہونے کے باوجود عملی طور پر اس کے بھائیوں اور بھتیجوں کے زیرِ استعمال تھی۔ خیر دین اس زمین کو انہی کے ہاتھوں بیچنا چاہتا

چاہتا تھا چاہے تھوڑی کہ رقم کے عوض ہی سہی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ مفت میں ملنے والی چیز کو کوئی کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں خریدتا۔ خاندان والوں نے شروع میں اسے بالواسطہ طور پر اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بھائی بار بار اسے اپنی کمزور مالی حالت کا جتا کر یہ بتاتے رہے کہ وہ زمین خریدنے کے قابل نہیں ہیں۔ چاہے وہ انہیں کم رقم کے بدلے ہی وہ زمین ملے تب بھی اور چاہے وہ زمین کا معاوضہ قسطوں کی صورت میں لینے پر تیار ہو جائے تب بھی۔ ان کے رویّے سے مایوس ہو کر خیر دین نے جب گاؤں میں اپنے چند دوستوں کے ذریعے زمین کے اور گاہک ڈھونڈنے شروع کر دیے تو خاندان والوں کی چھریاں پہلی بار بغلوں سے باہر آ گئیں۔ انہوں نے خیر دین کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس زمین کو بیچ دینے کا خیال چھوڑ دے کیونکہ وہ مر کر بھی اس زمین کو نہیں چھوڑیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ خیر دین اس زمین کو بیچنے کا سوچ کر بھی بے حد خود غرض ہو رہا تھا۔ غربت کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ بعض گناہ انتخاب نہیں مجبوری بن جاتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان کو دنیا کے دکھتے دوزخ یا آخرت کے چھپے ہوئے دوزخ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جنت یقین اور ایمان کے جس لنگر کے ساتھ منسلک ہوتی ہے وہ آپشنز میں ہوتا ہی نہیں۔

خیر دین کی زمین بک جانے کا مطلب اس کے خاندان کی مالی حالت کو کچھ مزید خراب ہونا تھا اور اس صورتِ حال کا سامنا کرتے ہی خاندان حادثہ یا ایک دم عجیب بدحواسی کا شکار ہو گیا تھا۔ خیر دین ان کا رزق گھٹانے آیا تھا۔ شاید پہلی بار ان میں سے اکثر کو صحیح معنوں میں خیر دین کی نوکری جانے اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا افسوس ہوا تھا۔ نہ یہ سب ہوتا نہ وہ گاؤں واپس آتا اور نہ انہیں زمین کے لالے پڑتے۔ انہیں خیر دین سے ہمدردی تھی یا نہیں تھی بہرحال اس بات پر وہ سب متفق تھے کہ وہ اس زمین کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے چاہے اس کے لیے ایک خونی رشتہ جاتا رہے۔

ایک مہینا خیر دین ہر روز پٹواری کے چکر کاٹتا رہا۔ وہ نہیں ملتا تھا، ملتا تھا تو اس کا کام ٹالتا تھا......اور پھر جب بالآخر وہ رجسٹر نکال کر اسے دکھانے پر تیار ہوا تو خیر دین دم سادھے رہ گیا تھا۔ وہ زمین اب اس کے نام نہیں تھی۔ وہ پچھلے ہفتوں کی تاریخ میں اس کے بھائیوں کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ وہ جب تک ڈی سی کا خانساماں تھا گاؤں میں موجود نہ ہونے کے باوجود کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس کی زمین کے ساتھ کچھ کرتا اور سرکاری لیبل ہٹتے ہی وہ بے سروسامان ہی نہیں بے زمین اور لاوارث بھی ہو گیا تھا۔ اس کے اپنے ہی اس کو نوچنے کے لیے گدھوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے تھے۔ پتا نہیں اس کاغذ پر خیر دین کا انگوٹھا لگانے کے لیے اس کے اپنوں میں سے کون خیر دین بنا تھا۔ پٹواری کو کتنی رشوت دی گئی تھی کہ خیر دین کی شکل سے شناسا ہونے کے باوجود اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

خیر دین جتنا لڑ سکتا تھا وہ پٹواری سے لڑا......لیکن وہ قسمت سے نہیں لڑ سکا جو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ جب انسان کے اپنے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے لگیں تو انسان دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ خیر دین کس کس کے ساتھ لڑتا......اپنے حالات کے ساتھ، خالی جیب کے ساتھ، اپنوں کی سرد مہری اور بے حسی کے ساتھ یا آنے والے

دنوں میں چڑیا اور اس کی بیٹی کے حوالے سے جھانکتے آسیبوں کے ساتھ۔

وہ لڑنے جھگڑنے کے بعد زمین کی رجسٹری بغل میں دبائے روتا ہوا واپس گھر آ گیا تھا۔ وہ زمین کا ٹکڑا اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ تمام جمع پونجی جسے اس نے اندھے اعتماد کے سہارے اپنے خونی رشتوں کو سونپ دیا تھا۔ وہ اعتماد واقعی اندھا ثابت ہوا تھا اور اب چاروں شانے چت پڑا تھا۔ پٹواری کے ہاں جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا جو گھر پر ہوا تھا۔ خیر دین رنج اور صدمے کے ساتھ ساتھ شدید غصے میں بھی تھا اور گھر پہنچنے کے بعد اس نے گاؤں میں اپنے چند جاننے والے لوگوں کی مدد لے کر اپنے بھائیوں کے ساتھ اس معاملے پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا تھا وہ خیر دین کے دل پر لگنے والا ایک اور چرکا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اپنے بیٹوں کو اکٹھا کر کے خیر دین کو اسی وقت گھر سے چلے جانے کا کہا اور دوسری صورت میں اس کا سامان باہر پھینک دینے کا اعلان کیا۔

چند ماہ کے عرصے میں چڑیا نے خوف سے کانپتے ہوئے دوسری بار اپنے نانا کی ایسی تذلیل اور بے قدری دیکھی تھی۔ اس کی ماں اور نانا نے بہتی آنکھوں کے ساتھ اس ایک کمرے میں پڑا اپنا وہ تمام سامان اٹھا لیا جو ان کا تھا۔ اس گھر سے نکلتے ہوئے خیر دین قسم کھا کر گیا تھا کہ وہ اس گھر میں دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے چند دنوں کے لیے گاؤں میں ہی اپنے ایک پرانے دوست کے ہاں پناہ لی۔

اس رات چڑیا نہیں سو سکی تھی۔ اس نو سالہ بچی نے بڑے آرام سے اپنے نامہ اعمال میں اپنا ایک اور گناہ تحریر کر لیا تھا، یہ سب بھی اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ امتحان میں پاس ہو جاتی تو نانا واپس شہر جانے کا نہ سوچتے اور پھر اس کے نانا کو وہ گالیاں اور دھکے اور دھمکیاں نہ ملتے جو اس نے دیکھے تھے۔

اس رات خیر دین کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ اس کے بالوں میں کچھ اور سفیدی اتر آئی تھی۔ اپنوں کا غم انسان کو باہر سے نہیں اندر سے مارتا ہے۔ خیر دین کو بھی اس نے مار دیا تھا۔ وہ اپنے اسی دوست سے کچھ رقم قرضہ لے کر واپس اسی شہر آ گیا تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ شہر میں آتے ہی کسی واقف کار کے ذریعے ایک کمرے کا گھر کرائے پر لیتے ہی اس نے سب سے پہلا کام چڑیا کو اسکول لے جانے کا کیا تھا۔

چڑیا کا نام اسکول سے کٹ چکا تھا لیکن سسٹر ایگنس چڑیا کے لیے ہمیشہ سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے کانونٹ کے قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بچی کو دوبارہ اسکول میں ایڈمیشن دلایا تھا۔ خیر دین کی نوکری ختم ہو جانے کا سن کر انہوں نے کہے بغیر چڑیا کی فیس کو ایک چوتھائی کر دیا تھا۔ خیر دین نے انہیں چڑیا کے ساتھ ہونے والے حادثے سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود سسٹر ایگنس نے چڑیا میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹس کیا تھا۔ چڑیا وہ پُراعتماد بچی نہیں تھی جسے وہ جانتی تھیں۔ وہ ایک خوف زدہ آنکھوں، زرد رنگت، کمزور جسم اور بے مقصد انگلیاں چٹخانے والی ایک بچی تھی جو خیر دین اور سسٹر ایگنس کی اس پوری ملاقات کے دوران گم صم کسی مسکراہٹ کے بغیر سسٹر ایگنس کو دیکھتی رہی تھی۔ اسے جیسے یہ خوف تھا کہ سسٹر ایگنس اسے دوبارہ اسکول میں داخل نہیں کرے گی اور اسے اس ہیبت ناک اسکول میں دوبارہ جانا پڑے گا اور اسے یہ خوف تھا کہ ابھی کسی بھی لمحے خیر دین بلک بلک کر رونے لگے گا اور پھر سسٹر ایگنس کو وہی سب کچھ بتائے

گا اور پھر...... اس پھر کے آگے چڑیا کو تاریکی کے سوا کچھ نہیں دکھتا تھا۔ وہ اس اسکول میں ستارہ تھی گرہن نہیں بننا چاہتی تھی۔ خیر دین نے سمجھداری کی تھی اس نے سسٹر ایگنس کو چڑیا کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا، نہ چڑیا کے حوالے سے نہ ڈی سی کے ساتھ ہونے والے اپنے جھگڑے کے حوالے سے جس کے نتیجے میں اسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

سسٹر ایگنس صرف یہی جان سکی تھی کہ ڈی سی نے کچھ لوگوں کو ملازمت سے مختلف وجوہات کی بنا پر فارغ کر دیا تھا اور ان میں خیر دین بھی تھا۔ وہ چڑیا کے حوالے سے اس ڈی سی کا ایک بار سامنا کر چکی تھی اور وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اسے ناپسند کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنی بیٹی کے ایڈمیشن اور اسکولنگ کے لیے اسکول آتا رہا تھا لیکن انہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کبھی اس طرح رُوڈ ہو کر بدتمیزی پر اتر سکتا ہے جس طرح وہ چڑیا کے نام اسکول کا ایک وارننگ لیٹر اس کی بیٹی کے ہاتھ گھر بھجوائے جانے پر ہوا تھا اور ایسا شخص کسی ملازم کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ سسٹر ایگنس نے بڑے آرام سے یہ نتیجہ نکال لیا تھا۔

ایک مسئلے کا حل نکالنے کے بعد خیر دین کو ڈاکٹر فرح اور ان کے شوہر سے رابطے کا خیال آیا۔ اتنے مہینوں میں اس نے ان دونوں میاں بیوی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے ان کا خیال چند بار آیا بھی تو اس نے سر سے جھٹک دیا۔ ایک شخص کی برائی نے خیر دین کو جیسے اس سارے نظام اور اسے چلانے والوں سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اب اپنی اور چڑیا کی بقا کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اسے پھر وہ میاں بیوی یاد آ گئے تھے۔

اس نے ڈاکٹر فرح کے شوہر عابد کو فون کیا اور تب اسے یہ افسوسناک خبر ملی کہ دو ماہ پہلے کینسر کی وجہ سے فرح کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ خیر دین کو شدید صدمہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر فرح ایک بہت نفیس اور مہربان عورت تھیں۔ چڑیا کی زندگی کے شروع کے سالوں پر ان کی بلاواسطہ اور بالواسطہ بہت گہری چھاپ تھی۔ اگر ان کی کوشش نہ ہوتی تو چڑیا کبھی اس اسکول میں نہیں پڑھ سکتی تھی جہاں وہ پڑھ رہی تھی۔ عابد کے منہ سے ڈاکٹر فرح کی ڈیتھ کا سن کر خیر دین کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ کچھ دیر تک تو وہ بول ہی نہیں سکا تھا۔ اس کی خاموشی محسوس کر کے گفتگو کا دوبارہ آغاز بھی عابد نے ہی کیا تھا۔

''میں نے سنا ہے تم نے جاب چھوڑ دی اور واپس گاؤں چلے گئے۔ تمہارے صاحب نے فرح کا بھیجا ہوا منی آرڈر واپس کرتے ہوئے مجھے فون پر بتایا تھا۔ فرح کو تو یہ جان کر بھی بڑا افسوس ہوا تھا کہ تم نے اس کی اتنے سال کی محنت ضائع کرتے ہوئے چڑیا کو اسکول سے اٹھا لیا تھا۔'' عابد نے مزید بات کرتے ہوئے کہا۔ بیوی کا یوں اچانک آنے والا ذکر اسے اداس کر رہا تھا۔

''بس سر کچھ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ میں گاؤں جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔'' خیر دین نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر فرح کے بارے میں یہ ہولناک خبر سن کر وہ چند لمحوں کے لیے اپنی زندگی بھول گیا تھا۔

عابد نے چڑیا کے دوبارہ اسکول میں داخلے پر جیسے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور ساتھ دوبارہ اسکول کی فیس

بھجوانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ جیسے اپنی بیوی کی ایک خواہش کا احترام کرنا چاہتا تھا۔ خیر دین نے اس بار انکار کر دیا تھا۔ فوری طور پر شدید مالی بحران کا شکار ہونے کے باوجود بھی اسے یہ گوارا نہیں ہوا تھا کہ وہ سسٹر ایگنس کے چڑیا کے تعلیمی اخراجات کو تقریباً معاف کر دینے کے بعد اس مد میں کسی سے مزید رقم وصول کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے عابد سے چند ہفتوں میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور عابد نے اس کی یہ درخواست قبول کرتے ہوئے اسے کبھی بھی آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

ڈاکٹر فرح کا سن کر صرف خیر دین کو صدمہ نہیں ہوا تھا، حلیمہ اور چڑیا کو بھی اتنی ہی تکلیف پہنچی تھی۔
خیر دین چند دنوں بعد عابد سے تعزیت کے لیے اپنی بیٹی اور چڑیا کے ساتھ اس شہر میں گیا تھا جہاں وہ پوسٹڈ تھا۔ عابد اور اس کے بچے ڈاکٹر فرح کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو بھرنے کے لیے نبرد آزما تھے۔ چڑیا کو اس نے اپنے بچوں سے ملوایا تھا لیکن وہ بچے بھی ماں کو کھونے کے بعد ابھی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے تھے۔ زندگی پہلے جیسی نہ چڑیا کے لیے رہی تھی نہ ان کے لیے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چڑیا کے ساتھ بیٹھ کر چند رسمی باتیں کر کے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ چڑیا کی زندگی کی اداسی میں ڈاکٹر فرح کی موت نے اضافہ کر دیا تھا۔ ایک اور جیتا جاگتا کردار اس کی زندگی میں صرف ماضی کی ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔

''نانا میں ڈاکٹر ہی بنوں گی بس...... اور میں بہت زیادہ پڑھوں گی...... محنت سے...... دل لگا کر۔'' چڑیا نے واپس اپنے شہر آتے ہوئے بس میں خیر دین سے کہا تھا۔ خیر دین نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی تھی، اتنے مہینوں میں یہ پہلا موقع تھا جب چڑیا کی چپ خود بخود ٹوٹی تھی اور اس نے اپنی زندگی اپنی تعلیم کے حوالے سے کوئی بات کی تھی پہلے کی طرح۔ خیر دین کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ چڑیا کا سر تھپکتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

''تم صرف ڈاکٹر مت بننا بیٹا...... ایک اچھی انسان بھی بننا...... بالکل ڈاکٹر فرح کی طرح۔'' چڑیا نے سر ہلایا تھا۔ زندگی میں برے انسانوں کے ایک ہجوم سے ملنے کے بعد اسے ایک اچھا انسان بننے کی ضرورت کا زیادہ احساس ہو گیا تھا۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ اچھے اور برے انسانوں کا ادراک کرنے لگی تھی۔ اس سے پہلے اس نے زندگی میں صرف اچھے انسان دیکھے تھے لیکن زندگی اور دنیا صرف اچھے انسانوں سے نہیں بنتی اور نہ ہی ان کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا احساس اسے برے انسانوں سے مل کر ہوا تھا۔ باربی ڈول کا پاپا اور اس کے نانا کے بہن بھائی...... اور گاؤں کے اسکول کے ٹیچرز اور کلاس فیلوز۔ چڑیا نے زندگی میں کبھی اچھے انسانوں کی فہرست نہیں بنائی تھی لیکن اس نے برے انسانوں کی فہرست بنانا سیکھ لی تھی۔ یہ اس نے زندگی میں بعد میں سیکھا تھا کہ اچھے انسانوں کی تو فہرست بنائی جا سکتی ہے برے انسانوں کی نہیں۔ وہ بے شمار ملتے ہیں اور ہر جگہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

''کتنے ویکس کا کورس ہے؟''
''ٹو ویکس کا۔''

''میں سوچ رہی ہوں ان ٹو ویکس میں، میں ممی کے پاس States ہو آؤں...... انہوں نے بھی کتنی بار کہا ہے پچھلے سال وزٹ کے لیے۔'' شہر بانو نے شیر دل سے کہا۔ وہ کسی پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا اور شہر بانو اور مثال کو وہ اکیلا وہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ انہیں لاہور اپنے پیرنٹس کے پاس چھوڑ کر جاتا لیکن شہر بانو نے لاہور جانے کے بجائے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ اپنے لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے شیر دل نے شہر بانو کی بات سنی جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے پر مساج کرتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔

''تم ٹو ویکس کے لیے جاؤ گی؟'' شیر دل نے کام کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں تھری ویکس کے لیے، پھر اب جا رہی ہوں تو کچھ دن رہ لوں...... ویسے تو تمہاری بیٹی نے جان کھانا شروع کر دینا ہے دوسرے ہی دن سے تمہارے لیے۔ وہ کہاں رہ سکتی ہے تمہارے بغیر زیادہ۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور کہا۔

''صرف میری بیٹی ہی نہیں رہ سکتی میرے بغیر یا میری بیٹی کی ماں بھی؟'' وہ شہر بانو کو چھیڑ رہا تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے مسکراتے ہوئے شیر دل کو گھورا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اپنے laptop پر ہاتھ چلا رہا تھا۔

''تم کو پتا ہے۔'' اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں مجھ کو نہیں پتا...... تم بتاؤ۔'' وہ اسی طرح کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا۔ شہر بانو کے اظہارِ محبت کو وہ ہمیشہ انجوائے کرتا تھا۔ ایک عجیب مردانہ تسکین ملتی تھی اسے۔

''میں بار بار نہیں بتا سکتی تمہیں پتا ہے......'' شہر بانو نے بظاہر بے پروائی سے کہا اور کن انکھیوں سے اس کو پھر آئینے میں دیکھا۔ شیر دل بستر پر بیٹھا اسی طرح laptop پر کام کرتا رہا پھر اس نے بظاہر بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''تم رہ سکتی ہو میرے بغیر...... I know it for a fact now۔'' شہر بانو جانتی تھی وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر کریم کا مساج کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ غیر محسوس انداز میں ہاتھوں پر لگی کچھ زائد کریم کو اس نے شیر دل کے چہرے پر لگا کر رگڑنا شروع کر دیا۔

''مت کرو۔'' شیر دل نے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے گردن ایک طرف کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''کیوں؟'' شہر بانو نے جیسے اسے کچھ حیران ہو کر دیکھا تھا۔

''جب تم میرے بغیر رہ سکتی ہو اور مجھے مس بھی نہیں کرتیں تو پھر مت کرو نا۔'' اس نے شہر بانو کو جتاتے ہوئے کہا لیکن اس بار اس نے laptop کی اسکرین پر نظریں جمائے رکھیں اور شہر بانو کو کریم چہرے پر رگڑنے دی، وہ اس کی اس ناز برداری کا عادی تھا۔

''ٹھیک ہے میں نہیں جاتی پھر۔'' شہر بانو نے اب اس کی ٹھوڑی اور گردن پر ہاتھ رگڑنا شروع کیا۔

''اس کام کے لیے ویسے ٹشو پیپر استعمال کیا جاتا ہے۔'' شیر دل نے یک دم خفگی سے کہا۔ وہ بے اختیار اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کریم ضائع ہوتی یار۔" وہ بھی اب شیر دل کو چھیڑ رہی تھی۔

"ظاہر ہے میں تو important ہوں نہیں تمہارے لیے...... تو تم جو چاہے کرو میرے ساتھ۔" شیر دل نے کام کرتے ہوئے اسکرین پر اسی طرح نظریں جمائے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ شہر بانو نے ہنستے ہوئے اسے ایک لمحہ کے لیے hug کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم بالکل بھی important نہیں ہو میرے لیے...... تم بس میرے بوائے فرینڈ ہو۔" وہ اب بیڈ کے کراؤن سے اسی کی طرح ٹیک لگائے اس کے کندھے پر سر رکھے laptop کی اسکرین پر excel شیٹس کو اوپر نیچے ہوتے دیکھنے لگی۔

"obviously۔" شیر دل نے کہا۔

"obviously۔" شہر بانو نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر تم اپنی ممی کے پاس ہی رہنا۔" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

"تم مر جاؤ گے میرے بغیر۔" شہر بانو نے اس کے بازو پر ایک ہلکا سا مکا مارا۔ شیر دل ہنس پڑا۔

"اور تم؟" اس نے جواباً شہر بانو سے پوچھا۔

"میں بھی۔" وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

"Good۔" شیر دل جیسے اس کے جواب سے محظوظ ہوا۔

"کوئی song ہی لگا دو۔" اس کے کندھے سے سر ٹکائے اس نے شیر دل سے فرمائش کی۔ شیر دل کے laptop میں ان دونوں کے پسندیدہ میوزک کی ایک لمبی چوڑی playlist تھی۔ وہ جب بھی رات کو بیڈ روم میں بیٹھا کام کر رہا ہوتا تو ہینڈز فری کے ساتھ میوزک بھی سنتا۔ اگر شہر بانو جاگ رہی ہوتی تو وہ دونوں کام اور باتوں کے ساتھ song سنتے رہتے...... بعض دفعہ وہ گھنٹوں اسی طرح اس کے کندھے سے سر ٹکائے اس کو laptop پر کام کرتا دیکھتی رہتی اور میوزک سنتی رہتی۔ اس کے لیے جیسے شیر دل کے ساتھ اس طرح خاموشی سے بیٹھ کر وقت گزارنا بھی کافی تھا۔ شیر دل نے اس کی فرمائش پر کام کرتے کرتے رک کر میڈیا پلیئر پر کوئی نمبر ڈھونڈ نکالا اور اسے لگا دیا۔ بیڈ روم میں جگجیت کی غزل...... تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا...... گونجنے لگی تھی۔ اس کے کندھے سے ٹکے ٹکے وہ ہلکی آواز میں گنگنانے لگی۔ شیر دل مسکراتے ہوئے کام کرتے اسے گنگناتے سنتا رہا۔

"تم بھی گاؤ۔" شہر بانو نے یک دم اس سے فرمائش کی۔ وہ مسکرا دیا لیکن اس نے شہر بانو سے کچھ کہا نہیں۔

"گاؤ بھی۔" شہر بانو نے پھر اصرار کیا۔ شیر دل بہت اچھا گا لیتا تھا۔

"یار بزی ہوں آج۔" اس نے شہر بانو کے اصرار پر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بس مجھے نہیں پتا...... دو لائنز ہی گاؤ...... لیکن میرے لیے گاؤ۔" شہر بانو نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"او کے لیکن کوئی اور گاتا ہوں...... یہ نہیں۔" شیر دل نے یک دم playlist کو چیک کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں یہ کیوں نہیں؟" شہر بانو نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "مت change کرو یار...... یہ اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے playlist میں اسکرولنگ کو روکنے کے لیے شیر دل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔ شیر دل رک گیا۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ تم گھنا سایہ

"گاؤ بھی شیری۔" شہر بانو نے اصرار کیا۔ وہ اسے عجیب مشکل میں پھنسا رہی تھی اور ہمیشہ یہی کرتی تھی سوچے سمجھے جانے بوجھے بغیر...... پتا نہیں اس کو بعض چیزیں وہی کیوں اچھی لگتی تھیں جو عکس کو پسند تھیں اور جن کو شیر دل صرف عکس کے حوالے سے یاد رکھتا تھا۔ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر اس نے شہر بانو کی فرمائش پوری کرنا شروع کی۔ وہ اب مسکراتے ہوئے اس کے بازو کے گرد اپنا بازو لپیٹے بڑی طمانیت کے عالم میں اس کے کندھے پر گال ٹکائے جگجیت کے بجائے اس کی آواز سن رہی تھی اور شیر دل جگجیت کی وہ غزل گنگناتے ہوئے عکس کی آواز کی بازگشت کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ اس نے پہلی بار اس غزل کو عکس ہی سے سنا تھا...... جگجیت کی غزل تو اس نے بہت بعد میں سنی تھی، کہیں اور جگجیت کی غزل سنتے ہوئے بھی اس کو عکس ہی یاد آتی رہی تھی۔

وہ دونوں اکیڈمی میں میوزک کلب کے ممبر تھے اور کسی سوشل ایوننگ میں اس نے پہلی بار عکس کو کسی ساز و سازندے کے بغیر یہ غزل گاتے سنا تھا۔ اکیڈمی میں بہت کم لوگ گا سکتے تھے یا گانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس سوشل ایوننگ کے پروگرام میں ایک غزل کے لیے عکس کا نام دیکھ کر جیسے سب کو کرنٹ لگ گیا تھا...... اس کی آواز خوب صورت تھی، جس طرح اکیڈمی کی بہت سی لڑکیوں کی تھی۔ اس میں نرمی اور ملائمیت بھی تھی لیکن کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کامن کی topper یہ شوق بھی رکھتی تھی۔

اس کے اسٹیج پر آ کر مائیک کے ہاتھ میں لینے تک وہاں بیٹھے تمام کامنرز کو بے حد دلچسپی تھی اس کی اس قابلیت اور ٹیلنٹ کو جانچنے میں لیکن ہال میں مائیک پر اس کی آواز بلند ہوتے ہی وہاں دلچسپی، اشتیاق، تجسس نام کی ہر چیز غائب ہو گئی تھی...... وہاں صرف عکس مراد علی کی آواز کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سانس لینا، نظریں ہٹانا، حرکت کرنا یک دم ہر ایک کے لیے بے حد اضافی اور غیر ضروری سے کام ہو گئے تھے...... اور شیر دل اس ساکت اور ٹرانس میں آئے ہوئے کراؤڈ کا حصہ تھا۔

آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا

وہ اپنی آواز کی ملائمیت سے وہاں بیٹھے ہر شخص کے دل کو کاٹ رہی تھی...... کسی اضافی نشتر کے بغیر۔ ایک پلین ڈارک بلیو کرتے اور سینے پر پھیلے ہوئے شیفون کے سفید دوپٹے اور سفید چوڑی دار پاجامے کے نیچے ایک بلیو کولہاپوری چپل پہنے، ماتھے پر بار بار پھسل کر آ جانے والے بالوں کو ہلکے سے جھٹکتے کانوں میں ہلکورے لیتے بڑے بڑے سلور بالوں کے ساتھ مائیک ہاتھ میں لیے ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی پکچر پرفیکٹ تھی۔

تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے
ہم نے کیا کھویا ہم نے کیا پایا

”اس عورت کو سنگر ہونا چاہیے تھا۔ یہ اکیڈمی میں کیوں وقت برباد کر رہی ہے۔“ شیر دل نے وہاں بیٹھے دوسرے مردوں کی طرح ایک بے حد chauvanistic ذہن کے ساتھ سوچا۔

غزل کب ختم ہوئی تھی اس کا احساس کسی کو نہیں ہو پایا تھا۔ جگجیت کی اس غزل میں کتنے شعر تھے۔ ہر ایک یک دم گنتی بھول گیا تھا۔ عکس کے خاموش ہونے پر بھی ہر ایک جیسے اگلے مصرعے کے انتظار میں تھا۔ وہاں کسی نے تالی تک نہیں بجائی تھی۔ پر اس کے مائیک کو واپس اسٹینڈ پر سیٹ کرنا تھا جس نے یک دم پورے ہال کو زندہ کر دیا تھا۔ ایک Thunderous aplause (والہانہ داد/ستائش) تھی جو اسے ملی تھی۔ کچھ مرد کامنرز نے کھڑے ہو کر اس کے لیے تالیاں پیٹی تھیں۔ وہ بڑے اطمینان سے میلا لوٹ کر اسٹیج سے غائب ہو گئی تھی۔

دوسری فرنٹ رو میں بیٹھا شیر دل شاید اس ہال میں بیٹھا واحد کامنر تھا جس نے عکس کے لیے تالی نہیں بجائی تھی۔ وہ مرعوب تھا۔ متاثر تھا، ٹرانس میں تھا...... سب کچھ تھا لیکن وہ الو کا پٹھا نہیں تھا اس لیے وقتی طور پر اس نے گدھا نظر آنا زیادہ بہتر محسوس کیا ایک ساتھی کے ٹیلنٹ کو داد دیتے ہوئے ساتھیوں کے درمیان قدرے بے تاثر چہرے کے ساتھ۔ اس نے پہلے گھڑی پر وقت دیکھا تھا پھر ہاتھ میں پکڑا پروگرام چارٹ...... وہاں ایک اور گانے کے بعد اس کی پیانو پرفارمنس تھی۔ اس نے پورے پروگرام کو پڑھا...... اپنے نام کے spellings تک کر کے پڑھ لیے۔ تالیاں تب بھی بجتی رہی تھیں۔ اور جب بالآخر تالیاں تھم گئیں اور اسٹیج سیکریٹری اگلی پرفارمنس کو اناؤنس کرنے لگا تو اس نے پہلی بار اپنی سیٹ سے ذرا سا آگے ہو کر دائیں کان کی لو کھجاتے ہوئے بائیں طرف گردن موڑ کر اس دوسری فرنٹ رو کے آخر میں بیٹھی ہوئی عکس مراد علی کو پہلی ستائشی نظر سے دیکھا۔

وہ اسٹیج پر آنے والے اگلے کامنر کے لیے مسکراتے ہوئے تالیاں بجانے میں مصروف تھی۔ اس کی طرح نہ گھڑی دیکھ رہی تھی نہ پروگرام چارٹ اور نہ اپنے دائیں بائیں۔

وہ اکیڈمی کے ہر کامنر کو اس کی کسی اچھی پرفارمنس پر بلا جھجک داد دیتا تھا۔ یہ صرف عکس مراد علی تھی جس کو شیر دل نے ہمیشہ نظر انداز کیا اس معاملے میں...... اس کے نزدیک عکس کے لیے ستائشی کلمات کہنا، احساسات رکھنا اور داد دینا کیوں اتنا مشکل ہو گیا تھا وہ خود کبھی نہیں سمجھ سکا۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی سے خائف تھا...... اس کے رعب میں تھا...... اور بری طرح اس کی طرف اٹریکٹ ہو رہا تھا اس سے بچنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی...... اور یہ سب اسی طرح چلتا رہتا اگر ان دونوں کے درمیان غنی حمید نہ آ جاتا۔

”شیری کیا سوچ رہے ہو تم؟“ وہ یک دم شہر بانو کی آواز پر چونکا تھا۔

”کچھ نہیں...... کیا ہوا؟“

”تم مجھے گانا سنا رہے تھے۔“ شہر بانو نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں تو سنا دیا نا یار...... تم نے کہا تھا بس چند لائنز سنا دو میں نے سنا دیں۔“ وہ ایک بار پھر اپنا کام کھول کر بیٹھ گیا...... ضروری تھا کہ وہ اب یہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتا...... فائدہ نہیں تھا اب یہ سب کچھ یاد رکھنے کا...... لیکن وہ کئی بار کوشش کے باوجود بھی یہ سب بھولنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔

”میں نے سوچا ہے امریکا سے واپس آنے کے بعد ہی اس گھر کو renovate کروں گی۔“ شہر بانو ایک بار پھر اسے ماضی سے حال میں لے آئی۔ وہ ابھی دو دن پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ پر آیا تھا۔ شہر بانو نے شیر دل سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن اسے اس جگہ میں بے حد دلچسپی تھی جہاں چند مہینے وہ عورت رہی تھی جو اس کے شوہر کا کوئی ڈارک سیکرٹ تھی۔ اس گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی اسے یہ فرق نظر آیا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... یا کم سے کم اس حد تک نہیں دیکھا تھا جس حد تک وہ وہاں نظر آیا تھا۔ گھر بلا کا صاف ستھرا رکھا گیا تھا اور صفائی ستھرائی کا یہی عالم اس نے ملازموں میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے کسی ملازم کے گندے بڑھے ہوئے بے ترتیب بال، ناخن، دانت اور بے ہنگم شیو نہیں دیکھی تھی۔ نہ ہی کسی کو میلے، سلوٹ زدہ بوسیدہ لباس میں دیکھا تھا نہ کسی کے پاؤں میں خراب جوتے دیکھے تھے۔ شہر بانو نے اس سے زیادہ مستعد عملہ بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے بیرونی گیٹ پر موجود گارڈز سے لے کر اندرونی حصے میں کام کرنے والے ملازمین تک وہ کہیں کم سے کم حلیے اور مستعدی میں کوئی خامی نہیں دیکھ پائی تھی۔ گھر کے عملے پر گھر سے زیادہ توجہ دی گئی تھی اگر یہ عکس نے کیا تھا تو...... اور فوری طور پر وہ اس کا کریڈٹ عکس کو دینے سے جھجک رہی تھی۔ کوئی بھی صرف چند مہینوں میں صفائی اور مستعدی کا یہ معیار حاصل نہیں کر سکتا تھا اور عکس کو وہاں صرف چند مہینے ہوئے تھے۔

وہ پہلا سرکاری گھر تھا جس میں داخل ہوتے ہی اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کم سرکاری رہائش گاہوں کے لانز کو اس طرح maintained دیکھا تھا۔ اس کے اپنے گھر کا لان بھی ایک exception تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اس نے کتنی جان ماری تھی...... گھر کے کسی فرد کی ذاتی دلچسپی کے بغیر صرف مستعد عملے کے سر پر بھی وہ سب نہیں ہو سکتا تھا جو وہ وہاں دیکھ رہی تھی۔ وہ بہار کا موسم نہیں تھا لیکن کم سے کم اس لان کے سبزے اور رنگینی کو دیکھتے ہوئے اسے یونہی لگا تھا جیسے وہ بہار کے موسم میں ہی

اس گھر میں آئی تھی۔ شہر بانو کو حسرت ہی رہی تھی کہ وہ اس لان میں کہیں مٹی اور جالوں سے اٹے پودے اور اداس درخت دیکھ پاتی۔ کہیں اسے خراب اور بے ڈھنگی تراش خراش میں کچھ پودے نظر آجاتے۔ کہیں سوکھی اور پیلی گھاس، خشک اور گلے سڑے پتوں کا کوئی ڈھیر، ٹوٹے گملوں والے پودے یا کیڑا لگی ہوئی بیلیں ہی مل جاتیں...... وہاں کمال کا نظم ونسق تھا...... جو بھی کچھ تھا عدم توجہی یا بے نظمی کا شکار نہیں تھا...... اس نے یہ کریڈٹ بھی عکس کو دینے سے گریز کیا...... نئے پودوں کی پنیریوں کی قطاریں اور کیاریوں میں ننھے ننھے پودوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے بھی۔

گھر کے اندرونی حصے میں کوئی نئی تعمیر اور مہنگی تزئین و آرائش نظر نہیں آئی تھی...... آرائشی اشیا کا کوئی بے ہنگم ڈھیر نظر نہیں آیا تھا۔ وہاں زیادہ تر چیزیں وہی تھیں جو یقیناً ہمیشہ سے اس ڈی سی ہاؤس میں زیر استعمال تھیں...... لیکن اس پرانے فرنیچر اور آرائشی اشیا کو خستہ اور بوسیدہ حالت میں نہیں رکھا گیا تھا۔ پردے بھی پرانے تھے لیکن وہ تمام چیزیں بے حد صاف ستھری اور چمک رہی تھیں...... پرانے قالین یقیناً بہت اچھی طرح سے دھلوائے اور صاف کروائے جاتے تھے ان پر اگر کہیں پہلے کے کوئی نہ مٹنے والے داغ تھے تو بھی وہ بہت ہلکے تھے اور بعض چھوٹے داغوں پر چھوٹے چھوٹے rugs ڈال کر جیسے ان قالینوں کے ایسے نشانوں کو کور کر دیا گیا تھا۔ شہر بانو بھی یہ کبھی نہ جان پاتی اگر وہ وہاں آنے کے دوسرے ہی دن اتفاقی طور پر کسی ملازم کو ایک rug اٹھا کر صفائی کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتی۔ rug کے نیچے قالین پر شاید کسی paint کا ایک داغ تھا۔ ملازم سے پوچھنے پر اسے پتا چلا تھا کہ ان چھوٹے اور سستے rugs کو عکس کی ہدایات پر خرید کر وہاں مختلف جگہوں پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہ نئی تزئین و آرائش کے نام پر بے مقصد اخراجات سے بچنے کی ایک بے حد عمدہ ترکیب تھی۔ اس گھر میں مختلف جگہوں پر ایسے بہت سے "رفو" کیے گئے تھے۔ شہر بانو ہر بار ایسے کسی نئے ٹونکے کو دیکھ کر اور سن کر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ کبھی کسی گھر کو ان طریقوں سے maintain نہیں کر سکتی تھی یہ اس کا طریقہ ہی نہیں تھا۔

کچن اس گھر کے لان کے بعد حیران کن طور پر سب سے زیادہ صاف حصہ تھا اور اس گھر میں آنے کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ شہر بانو awe (رعب) میں آئی تھی۔ اس کے لیے گرد سے پاک چمکتا فرش، صاف ستھرے کاؤنٹر اور چکنائی اور میل کچیل سے پاک دھلے ہوئے چمکتے سنک۔ صاف ستھری منظم کچن کیبنٹس اور آٹے اور چکنائی کی رطوبتوں سے پاک کوکنگ رینج دیکھنا جیسے خواب دیکھنے کے برابر تھا۔ پینٹری بھی اتنی ہی صاف ستھری اور منظم تھی جتنا کچن کا باقی حصہ۔ فریج اور فریزر کو کھول کھول کر دیکھنے پر بھی شہر بانو کو گندگی نظر نہیں آئی تھی اور ایسا کیوں تھا؟ کیونکہ عکس ناشتا اور رات کا کھانا باقاعدگی سے اسی کچن میں رکھی دو کرسیوں والی ایک چھوٹی میز پر کھاتی تھی۔ اکثر رات کو وہ اسی فریج میں سے دودھ خود نکال کر چائے بناتی تھی اور اسی کوکنگ رینج پر کبھی کبھار نائٹ اسنیکس تیار کیا کرتی تھی۔

"اچھا یہ صاف نہیں ہو سکتا؟" اس گھر کے خانساماں نے عکس کے حوالے سے شہر بانو کو ایک کے بعد ایک قصہ سناتے ہوئے اسے ایک واقعہ quote کیا جب اس گھر میں آنے کے بعد اس کوکنگ رینج پر جمی چکنائی پر عکس نے اعتراض کیا تھا اور خانساماں برکت نے اسے کہا تھا کہ وہ بس اتنا ہی صاف ہو سکتا تھا اور چمک اس

لیے نہیں رہا تھا کہ وہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے ساتھ ہی عکس سے نئے کوکنگ رینج کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ اس نے شہر بانو کو عکس کا جواب بتایا تھا۔

"اچھا یہ صاف نہیں ہو سکتا...... یہ چمک نہیں سکتا؟ کیونکہ یہ پرانا ہے؟" عکس نے اس سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"پکی بات ہے؟" برکت نے بڑے اعتماد سے اس کے سوال پر سر ہلاتے ہوئے ہاں کہا۔ اسے اپنی پھیلائی ہوئی گندگی کے durable (ہمیشہ رہنے) اور پکا ہونے پر جیسے اندھا اعتماد تھا۔ عکس نے جو اگلی بات کی تھی اس نے برکت اور دوسرے ملازمین کو بھونچکا کر دیا تھا۔ اس نے اسٹین لیس اسٹیل وول، گرم پانی، سرکہ اور ڈیٹرجنٹ مانگا تھا۔ برکت اور ملازمین نے کچھ خفت اور شرمندگی کے عالم میں گھبرائے بوکھلائے انداز میں اسے روکتے ہوئے خود اس کوکنگ رینج کو دوبارہ صاف کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن عکس نے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ وہ سب گنگ اس گھر میں آنے والی پہلی خاتون ڈی سی کو اسٹیل وول اور ڈیٹرجنٹ کے ساتھ رگڑ رگڑ کر وہ کوکنگ رینج صاف کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کچن میں برکت کے دو مددگار دوسرے ملازمین بھی ڈی سی کو کوکنگ رینج صاف کرتے دیکھ کر اس کے دوسرے حصوں پر سے وہ گندگی اور غلاظت صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے جو اس سے پہلے اترتی ہی نہیں تھی یا کم از کم اس عزم اور نیت سے کبھی نہیں اتر پائی تھی جو کام کے حوالے سے ان کا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ پرانا کوکنگ رینج اس طرح چمک رہا تھا کہ برکت اس میں اپنا، ڈی سی اور کچن کا عکس دیکھ سکتا تھا۔

"ایک گھنٹا اسے صاف کرنے میں اس لیے لگا کیونکہ یہ شاید سالوں سے اچھی طرح صاف نہیں کیا گیا...... اگر ہمیشہ سے صاف ہوتا تو یہ ہر روز صرف دس منٹ لیتا صفائی کے لیے اور اس چمک کے لیے۔" ڈی سی نے سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے اس تولیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا جو ایک ملازم نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"اگر کسی چیز کو بدل دینے کا معیار یہ ہے کہ وہ پرانی اور گندی ہو گئی ہے تو میں اس معیار پر یقین نہیں

رکھتی۔ پرانی چیز زیادہ کارآمد ہوتی ہے...... گندی چیز صاف کی جاسکتی ہے...... میں کسی چیز کو صرف تب بدلوں گی جب وہ بے کار ہو جائے اور وہ رزلٹ نہ دے جو ہم چاہتے ہوں اور ان میں چیزوں کے ساتھ ساتھ انسان بھی شامل ہوسکتے ہیں۔'' شستہ انداز اور تمیز سے دی گئی وارننگ بجلی کے 440 وولٹ کے کرنٹ کی طرح ان سب کو لگی تھی۔ ان میں سے کوئی مر کر بھی اس ڈی سی ہاؤس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس شہر میں کوئی دوسرا ڈی سی ہاؤس نہیں تھا۔ کمشنر ہاؤس تھا جہاں پہلے سے موجود عملہ ان کو آنے دینے والا نہیں تھا یا پھر چھوٹے موٹے دوسرے سرکاری اداروں کے سربراہان کے گھر تھے جہاں جانا ان کے لیے سولی پر لٹکنے کے برابر تھا...... ڈی سی ہاؤس میں کام کرنا جیسے خود ڈی سی ہونے کے برابر تھا۔

شہر بانو کو برکت نے باقی جذبات اور خیالات نہیں بتائے تھے۔ شہر بانو خود جان سکتی تھی کہ اس دھمکی کے بعد اس گھر میں کیا ہوا ہوگا...... عملے کی وہ مستعدی، جانفشانی اور صفائی ستھرائی اب جیسے اس کے لیے ایک راز نہیں رہی تھی۔

''میڈم نے کبھی ہمیں ڈانٹا نہیں۔'' برکت اب بھی میڈم کے لیے رطب اللسان تھا۔ شہر بانو ایک گہری سانس لے کر اس کچن سے باہر آئی تھی۔ اسے شیر دل کی وہ بات اب سمجھ میں آئی تھی جو اس نے کبھی عکس کے حوالے سے اپنے کسی بیچ میٹ کو کہی تھی۔

''She is a lethal administrator۔'' وہ lethal administrator اب شہر بانو کے سامنے ہوم ایڈمنسٹریشن کے نئے اسٹینڈرڈ سیٹ کر رہی تھی۔

اس گھر میں اخراجات کے نام پر کہیں سرکاری پیسے کا زیاں نہیں کیا گیا تھا۔ نہ وہ یہ کام خود کرتی تھی نہ اپنے عملے کو کرنے دیتی تھی۔ ملازمین کو اس حوالے سے بہت صاف اور سخت ہدایات تھیں۔ وہ اپنے کام کے حوالے سے ملازمین پر بہت زیادہ ڈیپینڈنٹ نہیں تھی۔ بہت کم ہی کبھی اس نے رات کے وقت گھر میں کام کرنے والے عملے کو اپنے کسی ذاتی کام سے بلایا تھا۔ وہ بہت سادہ کھانا کھاتی تھی۔ عام دنوں میں ون ڈش مینو اور ویک اینڈ پر ذرا زیادہ اہتمام اور ایک آدھ اور لوازمات...... گھر پر ہونے والی دعوتوں اور فیملی کے آنے پر بھی گھر کا مینو ہمیشہ budgeted ہوتا تھا۔ ایک گوشت کی ڈش، ایک سبزی، ایک دال اور سویٹ ڈش...... اور یہ کھانا صرف اس مقدار میں پکتا تھا جو مہمانوں کی تعداد اور کچن کے عملے کے لیے مناسب ہوتا۔

دو دن میں ہی اس گھر میں رہتے ہوئے شہر بانو کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ملازمین عکس کے بارے میں بات کرنا پسند کرتے تھے۔ اسے quote کرنا جیسے ان کی پسندیدہ سرگرمی تھی اور اس کے حوالے سے کچھ بتاتے ہوئے ان کے لہجے میں ایک عجیب سی ایکسائٹمنٹ جھلکتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی یہ شہر بانو نہیں جان سکی۔ اس پوسٹ پر پہلی خاتون آفیسر کے طور پر اس گھر میں آنا...... نوکروں کو دی جانے والی خاص مراعات خاص طور پر ان کے بچوں کے حوالے سے...... یا پھر عکس کا دوستانہ مزاج...... وجہ جو بھی تھی اس گھر میں دو دن اس نے صرف ''عکس نامہ'' سنا اور دیکھا تھا اور یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والی وہ اکیلی نہیں تھی۔ شیر دل دوسرا victim تھا لیکن اس کے لیے یہ سب پہلا تجربہ نہیں تھا...... عکس اپنے ساتھیوں کے لیے بلاوجہ خائف کرنے والی شے

نہیں بنی تھی۔
"تمہیں نیند آرہی ہے شبی؟" وہ اس کے کندھے سے لگی اونگھنا شروع ہوگئی تھی جب شیر دل نے کام کرتے ہوئے اچانک اس کو دیکھ کر کہا۔ شہر بانو نے چونک کر آنکھیں کھول کر اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں تو۔"
"آرہی ہے یار...... سو جاؤ۔" شیر دل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں آرہی۔" شہر بانو نے ایک بار پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ "میں song سن رہی ہوں۔" اس نے شیر دل کو جیسے جتانے والے انداز میں کہا۔
"سنو پھر۔" شیر دل نے جیسے اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ یہ بھی روٹین کی بات تھی۔ وہ کام کرتا رہتا وہ اسی طرح میوزک سنتی ہوئی اس کے کندھے سے لگے سو جاتی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ جب تک کام سے فارغ ہوا وہ گہری نیند میں تھی۔ اپنا laptop بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے شیر دل نے سب سے پہلے اسے بڑی احتیاط سے خود سے الگ کرتے ہوئے بستر پر لٹایا، وہ چند لمحوں کے لیے کسمسائی اور اس نے نیند میں کچھ کہا پھر وہ جیسے نیند میں ہی کسی چیز سے ڈری۔ شیر دل نے کسی ننھے بچے کی طرح اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اسے تھپکا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ بے حد جاذب نظر تیکھے نقوش اور ملائم جلد والا ایک معصوم چہرہ...... وہ سوتے ہوئے ہمیشہ بچوں جیسی معصومیت اور بے خبری سے سوتی تھی۔ اس بات سے بے پروا کہ وہ کہاں تھی اور کہاں نہیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے پر آئے بالوں کو نرمی سے ہٹا کر سمیٹتے ہوئے اسے دیکھتا گیا۔ اس نے زندگی میں شہر بانو سے زیادہ بے ضرر اور سادہ طبیعت لڑکی ... نہیں دیکھی تھی۔ اپنے حال میں مگن مزے سے اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینے والی...... اس نے شادی سے پہلے اور بعد اتنے عرصے میں کبھی شہر بانو سے کسی دوسرے کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی تھی۔ وہ اس سے بہت باتیں کیا کرتی تھی مگر دوسرے آفیسرز کی بیویوں جیسی باتیں کرتے اس نے شہر بانو کو بہت کم ہی دیکھا تھا۔ وہ بے حد حساس تھی اور شیر دل کو اس بات کا اندازہ شادی سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ اس نے شہر بانو کا ہمیشہ اس سے زیادہ خیال رکھا تھا جتنا وہ رکھ سکتا تھا۔ وہ جذباتی طور پر اس سے کس قدر اٹیچڈ تھی اور کس حد تک اس پر ڈیپنڈنٹ تھی شیر دل اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ شیر دل ساری زندگی بے حد اسٹائلش، اسمارٹ، خوب صورت اور تیز طرار لڑکیوں کی طرف اٹریکٹ ہوتا رہا تھا انہی کی کمپنی پسند بھی کرتا تھا۔ شہر بانو اور اس کے درمیان کیا کنکشن بنا تھا...... کیا common پوائنٹس نکل آئے تھے۔ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آیا...... شہر بانو بے حد حسین اور اسٹائلش تھی لیکن وہ easy- going آرام طلب نہیں تھی نہ ہی تیز طرار۔ وہ لیے دیے رہنے والی ایک لڑکی تھی اور اس کے باوجود شیر دل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اس حد تک کہ وہ اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنا بیٹھا تھا اور ان تمام سالوں میں وہ جب بھی اس فیصلے کے بارے میں سوچتا وہ اسے اپنی زندگی کے سب سے اچھے فیصلوں میں سے ایک سمجھتا تھا۔
نیند میں ہی شہر بانو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لاشعوری طور پر اس کی شرٹ کو اپنی مٹھی میں لیا تھا۔ شیر دل ایک

لمحے کے لیے چونکا پھر وہ ایک بار پھر اس کے گہری نیند میں جانے کا انتظار کرنے لگا تا کہ اس کا ہاتھ اپنی شرٹ سے ہٹا کر بستر سے اٹھ سکے۔ وہ ہمیشہ سوتے ہوئے اسے اسی طرح پکڑ کر سوتی تھی۔

''میں جب تمہارے پاس ہوتی ہوں نا تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔'' وہ اکثر اس سے کہتی تھی۔

''کس چیز کا ڈر؟'' وہ شروع، شروع میں اس سے پوچھا کرتا تھا۔

''کسی بھی چیز کا ڈر۔'' وہ جواباً کہتی۔

''مثلاً؟'' شیر دل کو curiosity (تجسس ہوتی۔)

''تمہارے کہیں چلے جانے کا ڈر۔'' اس نے پہلی بار اس کے پوچھنے پر چند لمحے خاموش رہ کر کہا تھا۔ شیر دل اس جواب پر حیران رہ گیا تھا۔ اسے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

''میں کہاں جاؤں گا یار......؟'' اس نے اسی حیرانی میں پوچھا تھا۔

''مجھے چھوڑ کر۔'' شہر بانو کے اگلے جملے نے اسے اور حیران کیا۔ وہ چند لمحے اس کی شکل دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔

''تمہیں چھوڑ کر......؟'' کیا بے وقوفی کی بات ہے شیبی، میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ؟'' اس نے تب بھی شہر بانو کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔ شہر بانو نے اس کو جواب دینے کے بجائے اس کے سینے میں منہ کو چھپا لیا تھا۔ شیر دل کو لگا تھا وہ اس کا یہ اندیشہ دور کرنے میں کامیاب رہا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ اسے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ شہر بانو شدید قسم کے عدم تحفظ کا شکار تھی اور اس وقت سے تھی جب اس کا باپ اس کی زندگی سے پہلے parents کی divorce (طلاق) کی صورت میں نکل گیا...... بعد میں خودکشی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے...... وہ باپ کی زندگی تک اس کے پاس ایک اکلوتی اولاد کی شکل میں خوش وخرم رہی تھی۔ ایک خوش باش، پُراعتماد بچی...... فیملی کے ٹوٹنے نے اس بچی کی شخصیت کو بہت مسخ کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے باپ کی خودکشی نے...... زندگی شہر بانو کے لیے دوبارہ ویسی نہیں ہو سکتی تھی جیسے اس کے باپ کے ساتھ تھی...... وہ خلا وہ ساری عمر ساتھ لے کر چلی تھی اور اس خلا نے اس کے اندر بہت سارے خلا پیدا کر دیے تھے۔ شیر دل اس کی زندگی میں مرہم کے ایک پھاہے کی طرح آیا تھا۔ سمیٹنے اور سہارا دینے والے ہاتھوں کی طرح اور بہت صحیح وقت پر آیا تھا...... شیر دل نے واقعی اسے سمیٹ لیا تھا...... وہ شہر بانو کے بارے میں overprotective (حد سے زیادہ نگہبان) تھا۔ محبت اور شادی کے رشتے میں بندھ جانے کے بعد بھی بہت وقت لگا تھا اسے شہر بانو کو یہ یقین دلانے میں کہ وہ صرف اس کا تھا اور کوئی بھی چیز اسے اس سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ شہر بانو کو چھوڑ جانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عکس شیر دل کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی، شہر بانو دوسری، شیر دل کے لیے ہمیشہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ ان میں سے کس سے زیادہ محبت کرتا تھا کس کو اپنی زندگی سے الگ رکھ کر خوش رہ سکتا تھا۔ عکس اس کی زندگی کا حصہ نہیں تھی۔ اس سے مہینوں رابطہ نہ ہونے کے باوجود کوئی دن شیر دل کی زندگی میں ایسا نہیں گزرا تھا جب شیر دل کو اس کا خیال نہ آیا ہو۔ وہ لاشعوری طور پر اس کو سوچتا تھا اسے مس کرتا تھا۔ اپنی

زندگی میں ہونے والی ہر نئی development کو سب سے پہلے اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ کسی بھی مسئلے میں پھنس جانے کے بعد سب سے پہلے اس کے ساتھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے نہ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ چلتی تھی، ساتھ رہتی تھی، ساتھ جیتی تھی۔ ایک عکس کی طرح جو زندگی کی ہر منعکس کرنے والی شے پر ابھرتا تھا۔

شہر بانو اس کی زندگی کا کلمہ تھا جو ہر وقت اس کی زبان پر رہتا تھا۔ وہ اس سے جو کہتی تھی جو کر رہی ہوتی تھی وہ شیر دل کی زبان پر آ جاتا تھا۔ اس کی خوشی، خفگی شیر دل کے دن بناتے بگاڑتے تھے۔ وہ عکس سے اظہارِ محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شہر بانو سے اظہارِ محبت سنے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

سسٹر ایگنس کو لگا ڈی سی پاگل تھا یا اس کا ذہنی توازن خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ چند مہینے پہلے اس بات پر وہاں ہنگامہ کر کے گیا تھا کہ ایک نوکر کی نواسی کو بھیجا جانے والا وارننگ لیٹر اس کی بیٹی کے ہاتھ کیوں بھیجا گیا تھا اور وہ آج پھر وہاں اس مطالبے کے ساتھ آیا تھا کہ اس بچی کو اسکول سے نکال دیا جائے۔ اس کا نانا چور تھا اور اسے ڈی سی ہاؤس سے اسی وجہ سے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ خیر دین کے حوالے سے یہ انکشاف سسٹر ایگنس کے لیے شاکنگ تھے لیکن اس سے زیادہ شاکنگ اس ڈی سی کا رویہ تھا جس نے پہلے یہ مطالبہ اپنے آفس میں بیٹھے اپنے پی اے کے ذریعے اس تک پہنچایا تھا پھر خود فون پر یہ مطالبہ دہرایا تھا اور اب اسے اطلاع دیے بغیر اس کے آفس میں آن دھمکا تھا۔

سسٹر ایگنس کے لیے اپنا غصہ کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے اسکول میں ایڈمیشن کے لیے انتظامی مشینری کا دباؤ برداشت کرتی رہی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب کسی بچی کو اسکول سے نکلوا دینے کے لیے انتظامی مشینری سرگرم نظر آ رہی تھی۔ اس نے ڈی سی کے ساتھ جتنی نرمی اور تہذیب کا مظاہرہ کرنا ممکن تھا کیا لیکن ایک پوائنٹ پر آ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"I cant takeit any more - Please leave my office right away" (میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ اسی وقت میرے آفس سے چلے جائیں) باربی ڈول کا باپ بری طرح بھڑکا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ دوسری بار ہوا تھا جب کسی نے اس سے اس طرح بدتمیزی سے بات کی تھی اور دونوں دفعہ یہ کارنامہ اسی عورت نے سرانجام دیا تھا جو اس کے سامنے ایک اسکول کی پرنسپل والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"you dare not talk to me like that if you want to continue this job. You have no idea what I can do to remove you from this post" (اگر تم اپنی نوکری جاری رکھنا چاہتی ہو تو تم مجھ سے اس طرح بات کرنے کی جرات بھی مت کرنا، میں تمہیں اس پوسٹ سے ہٹانے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہوں تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے) وہ بالکل ہی [illegible] سے اکھڑ گیا تھا۔

Mr DC if this is a challenge then. I take it .Please leave my office immediately. I have to meet some other visitors as

well."

(ڈی سی صاحب، اگر یہ ایک چیلنج ہے تو میں اسے قبول کرتی ہوں۔ برائے مہربانی آپ فوراً میرے آفس سے نکل جائیں۔ مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقات کرنی ہے)

وہ اب کچھ بھی کہے بغیر سرخ چہرے کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ اب بھی وہ کھڑا نہ ہوتا تو سسٹر اینگلس وہاں سے اٹھ جاتی۔ اس نے مزید سسٹر سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس تقریباً دروازہ توڑنے والے انداز میں کھول کر وہ وہاں سے نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سسٹر اینگلس بہت دیر پریشانی کے عالم میں وہاں بیٹھی رہی۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈی سی کے اختیارات اور پاورز کیا تھیں وہ کیا نہیں کر سکتا تھا' اس کے اسکول اور اس کو مشکل میں ڈالنے کے لیے۔ اسے یقین تھا آج نہیں تو کل اسے کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے فون آنے ہی والا تھا۔ وہ اسے اتنی دھمکیاں دے کر گیا تھا، کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی...... لیکن اسے یقین تھا کہ کیتھولک بورڈ کا اسٹینڈ بھی اس ایشو پر وہی ہوگا جو اس کا تھا لیکن اس معاملے کے مزید بگڑنے سے پہلے اس کا خیر دین کے معاملے کو Interrogate (چھان بین) کرنا ضروری تھا۔ اس نے خیر دین کو دوسرے دن ہی اسکول بلوا لیا تھا اور جب اس نے ڈی سی کا مطالبہ اور الزامات خیر دین کے سامنے دہرائے تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

بعض دفعہ انسان لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنا پردہ نہیں رکھ پاتا، وہ جیسے بیچ چوراہے میں جا کر پھوٹتا ہے اور خیر دین کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ اس نے سسٹر اینگلس کو اپنی صفائی دینے کی کوشش کی اور پھر جیسے خود پر قابو نہ پاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

اس دن جو کچھ سسٹر اینگلس نے خیر دین سے سنا تھا اس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چڑیا ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹس میں سے تھی اور انہیں وہ سب کچھ سنتے ہوئے جیسے دلی رنج ہوا تھا۔ وہ اب چڑیا کی اس حالت کو سمجھ سکتی تھیں جسے وہ پہلے سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ خیر دین ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے روتے ہوئے سر جھکائے انہیں سب کچھ بتاتا رہا اور وہ تاسف سے سر ہلاتی رہیں۔ ان کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن میں وہ خیر دین سے ہمدردی کا اظہار کرتیں یا اپنے رنج کو بیان کر پاتیں۔

☆☆☆

ایک آدمی نے ریڑھی پر پڑا پھل بڑے بڑے لفافوں میں بھر کر گاڑی کے اندر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے نے دال کا دیگچہ اٹھا کر وہیں فٹ پاتھ پر الٹا دیا تھا۔ خیر دین نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔ ان کو روکا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا...... وہ تعداد میں زیادہ تھے اور سرکار کے آدمی تھے...... اور چڑیا اس سب کے دوران بے حد خوف زدہ روتے ہوئے خیر دین اور اپنے اوپر ٹوٹنے والی ایک اور قیامت دیکھتی رہی۔ وہ ان کا رزق تھا جو وہ چھین کر لے گئے تھے۔ ریڑھی پر اب کچھ بھی نہیں تھا جو تھا وہ زمین پر بکھرا ہوا تھا صرف لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

شجرِ وفا

عطیہ عمر

لینڈ کروزر سبک روی سے چلی جا رہی تھی۔ سالوں بعد ان راستوں پر سفر کر رہا تھا لیکن کوئی خوشی یا جوش و خروش میرے ساتھ محوِ سفر نہ تھا۔ ویسے بھی اس عمر میں تازہ امنگیں یا ولولے تو پیدا ہونے سے رہے۔ ہاں آج سے پچیس، تیس سال پہلے جب ان راستوں پر سفر کرتا تھا، تب یہ سڑک کچی ہوتی تھی تو میرے دل میں کہکشاؤں پر سفر کرنے کی آرزو مچلتی تھی۔ چاند تارے مجھے اپنی مٹھی میں محسوس ہوتے تھے۔

میں اس علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار سربلند خان کا چھوٹا بیٹا معظم خان ہوں۔ مجھ سے بڑے تین بھائی اور بھی تھے۔ مکرم خان، شجاع خان اور نادر خان اور ایک بہن شاہدہ۔ علاقے کے دوسرے جاگیرداروں کے برعکس ہمارے والد خود بھی پڑھے لکھے تھے اور ہم سب بھائیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے اور ان کے بیٹوں نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ مکرم خان نے زراعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، وہ زرعی زمین اور باغات کی نگرانی کرتے تھے۔ شجاع خان، کاروباری ذہن کا مالک تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے شوگر مل لگائی اور پھر نادر خان کے ساتھ مل کر مختلف کاروبار بڑھاتا گیا۔ ساتھ ہی دولت بھی بڑھتی گئی۔ والدین اور بھائی مجھے شہزادوں کی طرح سمجھتے تھے تو میں نے بھی خود کو شہزادہ ہی سمجھنا شروع

کر دیا۔ پڑھنے میں اچھا تھا، میڈیکل میں بہ آسانی داخلہ ہو گیا۔ ایم بی بی ایس کے بعد میں نے لندن جانے کی خواہش ظاہر کی۔ تو سب نے میری خواہش کو سراہا۔ شاہدہ باجی اگر چہ دو بھائیوں سے چھوٹی تھیں لیکن ان کی شادی سب سے پہلے ہو چکی تھی اور ان کے بعد مکرم خان اور شجاع خان بھی شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔

ماں جی کو جب میری خواہش کا پتا چلا تو کہنے لگیں۔ ”جو تیری مرضی پتر...... پر جانے سے پہلے شادی کر کے جا۔“

”جانے دیں ماں جی، کیا پتا آپ کی ایک بہو انگریز آجائے۔“ نادر بھائی نے ہنس کر کہا تو ماں جی دہل کر بولیں۔

”اللہ نہ کرے پتر کہ ہماری نسل خراب ہو، اسی ڈر سے تو اس کا بیاہ کر کے بھیج رہی ہوں۔“

میری دونوں بھابیاں، ماں جی اور بابا کی پسند سے آئی تھیں، اچھے خاندانوں کی پڑھی لکھی لڑکیاں مگر میں فی الحال شادی کے حق میں نہیں تھا۔ بابا اور بھائیوں نے ماں جی کو سمجھایا کہ فی الحال اس کو جانے دیں، سال بھر بعد جب چھٹی پر آئے گا تو شادی کر دیں گے، ابھی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے گھر اور بیوی کو توجہ نہیں دے سکے گا۔

☆☆☆

میرے تعلیمی مراحل طے ہوتے گئے، میرے نام کے ساتھ ڈگریاں بڑھتی گئیں...... کئی بار پاکستان آیا مگر ماں جی کی خواہش پوری نہ کر سکا۔ پہلے ماں جی پھر بابا دنیا سے چلے گئے۔ یو کے سے میں یو ایس اے چلا گیا۔ میری اپنی بہت اچھی ملازمت تھی۔ بھائی آبائی جائداد میں سے میرا حصہ دینے کو تیار تھے لیکن میں نے کبھی خود سے نہیں مانگا۔ وہ خود ہی میرے اکاؤنٹ میں کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے۔ کئی بار وہ مجھ سے ملنے بھی آئے۔ انہیں میری تنہائی پسند نہ تھی۔ شادی کے لیے کہتے رہتے۔

جب میں لندن میں تھا اور طالب علمی کا زمانہ تھا تو مجھے جینی بہت اچھی لگی۔ ہماری دوستی کافی عرصہ رہی لیکن ہم نے شادی کا کبھی نہیں سوچا۔ پھر جینی کو ایلن مل گیا۔ ان کی شادی ہو گئی اور مجھے...... پہلے لنڈا پھر مارگریٹ...... پھر جب میں امریکا آیا تو میرے کولیگ اور پاکستانی فواد نے مجھے شادی کے لیے کہنا شروع کر دیا۔ ان دنوں شجاع بھائی میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ میری بھابیوں اور شاہدہ باجی نے کئی لڑکیوں کی تصویریں بھیجی تھیں مگر میرے دل میں کوئی تصویر سما نہ رہی تھی۔

فواد کے گھر پر دعوت تھی...... اس کے بیٹے کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ بچوں کی اس تقریب میں ہمارا کوئی کام نہ تھا مگر فواد کہنے لگا ”یار! اتنی مصروفیت میں مل بیٹھنے کا، باتیں کرنے کا ایک موقع ہے آجاؤ...... اور ہاں شجاع بھائی کو بھی لے کر آنا۔“

اور اس تقریب میں مجھے مشعل دکھائی دی...... وہ فواد کی بیوی کی سہیلی کی بہن تھی اور پڑھنے کے لیے پاکستان سے آئی تھی...... حسین چہرے تو بہت دیکھے تھے مگر اس کے حسن میں ایک تمکنت تھی۔ جس نے مجھے اسیر کر لیا۔ یا وہ لمحہ ”لمحۂ اسیری“ تھا۔

فواد نے اس سے میرا بھی سا تعارف کرایا تھا مگر مجھے محسوس ہوا کہ میری نگاہوں کی حدت اس کی آنکھوں سے ہوتی دل تک پہنچ رہی ہے کیونکہ اسی شب میں نے شجاع بھائی سے کہہ دیا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ مشعل سے میری شادی کرا دیں۔“ اور جب شجاع بھائی نے فواد کے ذریعے مشعل کے بہن بہنوئی سے بات کی تو

وہاں سے بھی رضامندی کے اظہار میں زیادہ وقت نہ لگا۔ میں کسی دھوم دھڑکے کے حق میں نہیں تھا مگر پھر بھی شجاع بھائی نے اپنا قیام بڑھا دیا، مکرم بھائی اور بھابی بھی آگئے اور اچھی خاصی دھوم دھام سے میری شادی ہو گئی۔ بھابی میری دلہن کے لیے بہت قیمتی اور روایتی ملبوسات اور زیور لائی تھیں۔ جو مشعل کو پسند بھی آئے اور جب اس نے پہنے تو اور بھی زیادہ خوب صورت اور قیمتی لگے۔

☆☆☆

شادی کے ابتدائی سال بہت یادگار گزرے۔ جب بھی چھٹیاں ہوتیں ہم خوب سیر و تفریح کرتے...... مشعل کے والد ایک اہم سرکاری افسر تھے۔ مشعل ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ جب ہماری شادی ہوئی تب ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ بعد میں فوت ہو گئیں۔

شادی کے بعد ایک بار میں مشعل کے ساتھ پاکستان آیا۔ مشعل کو گاؤں ایک پکنک اسپاٹ کے طور پر تو اچھا لگا مگر وہ دوبارہ آنے کے لیے کبھی پُرجوش نہیں ہوئی۔

شادی کے پہلے پانچ، چھ سال تو مشعل بچہ نہیں چاہتی تھی پھر ہماری خواہش کے باوجود یہ نعمت ہمارے گھر نہیں آرہی تھی۔ کافی عرصے علاج کے بعد ہمارے ہاں ایک بیٹا ہوا۔ میں نے اس کا نام عیسیٰ رکھا۔ عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے ہم میں جھگڑے ہونے لگے۔ میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ تو میں یوسفِ ثانی تھا، نہ ہی کوئی یونانی دیوتا...... لیکن میری شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ عورتیں میری طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہونے کے باوجود میں نوجوان، غیر شادی شدہ لڑکوں سے زیادہ مقبول تھا

سیر و تفریح

ایک شخص کو ایک لاوارث بندر ملا۔ وہ اسے پولیس اسٹیشن لے گیا۔ انسپکٹر نے کہا۔ ”اسے چڑیا گھر لے جاؤ۔“

اگلے روز انسپکٹر نے اس شخص کو بندر کے ساتھ بس اسٹاپ پر دیکھا۔

انسپکٹر: ”اسے چڑیا گھر نہیں لے کر گئے؟“

وہ آدمی بولا: ”کل گئے تھے، خوب گھومے...... بڑا مزہ آیا۔ آج مینارِ پاکستان جا رہے ہیں۔“

از: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

اور یہ بات مشعل کو پسند نہیں تھی۔

”تمہاری بھی تو سب تعریفیں کرتے ہیں۔ عورتیں، مرد سب۔ میں نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔“ میں اسے کہتا مگر پھر بھی وہ خوب چیختی چلاتی...... اگرچہ وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد میں نے کبھی حد پار نہیں کی اگر میں اپنی دوستوں کو تحفے تحائف دیتا تھا تو مشعل کے شاہانہ اخراجات سے بھی کبھی منہ نہیں موڑا۔

عیسیٰ کے بعد ہمارے اور بچے نہ ہوئے۔ ہمارے جھگڑے اتنے بڑھ گئے تھے کہ کئی دن ہماری بات بھی نہیں ہو پاتی...... اس رشتے کا اختتام یوں ہوا کہ میں اپنی جاب کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا...... تین دن کا قیام تھا لیکن کسی وجہ سے مجھے ایک ہی دن کے بعد واپس آنا پڑا۔ میرے پاس گھر کی

چابی موجود تھی۔ میں رات کے ڈیڑھ بجے اپنے گھر میں داخل ہوا۔ پہلے عیسیٰ کے کمرے میں گیا، وہ سو رہا تھا۔ اب وہ پانچ برس کا ہو رہا تھا۔ اس کی ٹیچر اس کی بہت تعریف کرتی تھیں مجھے بہت فخر محسوس ہوتا۔ میرا بیٹا میری طرح قابل ہوگا۔ پھر میں اپنے بیڈروم میں گیا اور میں نے دیوار کا سہارا لینا چاہا۔ فلمی کہانیوں میں ایسا ہوتا تھا۔ شوہر یا بیوی اچانک گھر آئے تو......

میری اور مشعل کی جتنی بھی لڑائی ہوئی ہو لیکن میں نے کبھی اسے چھوڑنے کا نہیں سوچا تھا اور یہ تو میرے وہم وگمان میں نہ تھا کہ مشعل مجھ سے بے وفائی کرے گی۔ آخر وہ میری بیوی تھی۔ ایک مسلمان، پاکستانی بیوی......

لیکن اس وقت میرے بستر پر ایک اور شخص تھا۔ وہ دراز قامت، مضبوط جسم کا شخص جو کوئی بھی تھا اس وقت مجھے اپنے جسم کے ٹکڑے کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید کسی آہٹ سے مشعل کی آنکھ کھلی اور مجھے دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔

''تم جیسی دوغلی، جھوٹی اور مکار عورت کو میں قتل کرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ تم میری زندگی سے نکل چکی ہو۔ کل ہی میرا وکیل طلاق نامہ تیار کر کے تمہیں دے دے گا۔'' وہ شخص بھی اب اٹھ کر میری طرف دیکھ رہا تھا...... مشعل کا چہرہ اب پُرسکون تھا اور وہ جیسے شاپنگ کی تفصیل پوچھ رہی تھی۔

''اور عیسیٰ؟''

''وہ میرے پاس رہے گا۔'' میرے جواب پر وہ کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے۔''

ہماری طلاق ہوگئی...... مشعل جاتے ہوئے سب چیزیں لے گئی عیسیٰ کی پیدائش پر میں نے ایک فلیٹ اس کے نام خریدا تھا لیکن مجھے ان چیزوں کی پروا نہیں تھی۔ البتہ مشعل کی بے وفائی کا دکھ ضرور تھا۔ میں نے پھر شادی نہیں کی...... فواد سے بھی میرا رابطہ نہ رہا۔ میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا...... میرا تجربہ، میرا نام، ایک بلند مقام حاصل کرتا گیا۔ عیسیٰ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ ماں کی جدائی نے اسے خاموش طبع بنا دیا۔ وہ ہم دونوں کو ہی ذمے دار سمجھتا ہے۔ میں نے اس کی ماں کی بے وفائی کا قصہ اسے نہیں سنایا۔ میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تین سال پہلے مجھے ہارٹ اٹیک ہوا۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ اپنی صحت کی صورتِ حال اچھی طرح جانتا ہوں، پچھلے کچھ دنوں سے مجھے اپنا گاؤں یاد آ رہا تھا۔ میں نے اپنی سب جائداد، بینک بیلنس عیسیٰ کے نام کیا، اپنے وکیل کو سب تفصیلات دیں۔ ایک مخصوص رقم ہر ماہ عیسیٰ کو دینے کی ہدایت کی۔ جب تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی بلکہ شادی نہیں ہو جاتی اور عیسیٰ کی شادی سے مجھے اپنی ماں جی یاد آئیں...... کاش میں نے ان کی دعاؤں کے ساتھ شادی کی ہوتی...... تو کیا عیسیٰ بھی میری طرح مشعل کی طرح...... نہیں، ہرگز نہیں...... میں بے چین ہو کر پاکستان چل پڑا۔ مکرم بھائی اس دنیا میں نہیں تھے۔ شجاع بھائی کی بھی سنا ہے طبیعت کافی خراب ہے۔ میرے سب بھائیوں کے، بہن کے کئی بچے تھے جو سب ہی شاید شادی شدہ تھے۔

نادر بھائی نے تو کہا تھا کہ وہ خود آئیں گے یا کسی بچے کو مجھے لینے کے لیے بھیجیں گے لیکن میں نے منع کر دیا۔ میں تنہائی چاہتا تھا۔ گاڑی اب حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی عورت ایک چھوٹے

سے بچے کو اٹھائے گاڑی کے دائیں طرف سے گزری اور جیسے میرے ذہن میں ایک جگنو چمکا۔

☆☆☆

ان دنوں میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا اور ہماری حویلی کا باغ پھولوں، پھلوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ یہ شوق ماں جی کا تھا۔ وہ وہیں بیٹھی تھیں، میں کسی کام سے ان کے پاس آیا تو ایک نو عمر لڑکی کو ان کے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ پندرہ، سولہ برس سے زیادہ عمر کی نہ تھی اس کا قد نہ تو بہت لمبا تھا، نہ چھوٹا اور اس کی رنگت جیسے بہار کے سارے رنگوں اور پھولوں کو یکجان کر دیا گیا ہو۔ عام سے دیہاتی انداز کے تیز رنگوں والے سوتی کپڑوں میں وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔

ماں جی نے مجھے دیکھا تو کہنے لگیں۔ ''صاحب خاتون، تم جاؤ۔ کل رکھی تمہارے گھر کپڑا اور دھاگے دے جائے گی۔''

''اچھا، بی بی جی۔''

''لڑکی، تم کون ہو؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چلی گئی۔ ماں جی قدرے خفگی سے بولیں۔

''یہ کیا انداز ہے، مولوی صاحب کی بیٹی ہے، مجھے کام تھا اسی لیے بلایا تھا۔''

پھر وہ لڑکی مجھے نظر نہیں آئی...... سال بھر کے عرصے بعد شجاع بھائی کی بیگم کے ساتھ وہ مجھے نظر آئی۔ بھابی اسے بٹھا کر شاید اپنے کمرے میں گئیں، میں اس کے پاس چلا آیا۔

''صاحب خاتون! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، تم ہمارے نئے باغ میں آسکتی ہو؟''

''خان جی! آپ بھی عزت دار آدمی ہیں اور میں بے شک غریب مولوی کی بیٹی ہوں لیکن عزت ہماری بھی ہے۔ یہ مناسب نہیں۔'' گاؤں کی جاہل، کم عمر لڑکی نے مجھے نظرانداز کر دیا۔ یہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

عرصے تک میں نہ بھول سکا۔ صاحب خاتون کی آنکھوں کے رنگ، میری نیند اڑا دیتے۔ کیسا رنگ تھا اس کی آنکھوں کا۔ سیاہ، بادامی، سرمئی یا نیلا؟

پھر جب مشعل کے ساتھ پاکستان آیا تو میں نے اسے دیکھا وہ اور زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ ایک بچے کو اٹھائے دوسرے کی انگلی پکڑے وہ ایک سانولے سے درمیانی جسامت کے مرد کے ساتھ باغ میں سے گزر رہی تھی۔ میں مکرم بھائی کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ وہ خود ہی بتانے لگے۔

''یہ گاؤں کے مرحوم مولوی صاحب کی بیٹی ہے، اس کا شوہر شجاع کی شوگر مل میں کام کرتا ہے۔'' بھابی نے صاحب خاتون کو بلایا تھا۔ وہ کڑھائی کا کام بہت اچھا کرتی تھی اور کبھی کبھار ہی کرتی تھی۔ بھابی، یہ بات مشعل کو بتا رہی تھیں اور پھر کہنے لگیں۔

''مشعل تم اپنی پسند کے رنگ بتاؤ...... صاحب خاتون تمہارا سوٹ بنا دے گی۔''

''تھینکس بھابی! میرے پاس بہت شلوار قمیص ہیں اور وہاں اتنے استعمال بھی نہیں ہوتے۔ اس لیے رہنے دیں۔'' میں صاحب خاتون کو دیکھ رہا تھا۔ حسبِ معمول اچھی طرح سے چادر میں خود کو چھپائے، وہ آج بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ حالانکہ مشعل بہت خوب صورت تھی۔ شاید صاحب خاتون سے زیادہ لیکن صاحب خاتون میں کیا تھا، کوئی انفرادیت تھی...... میری ڈھیروں ڈھیر گرل فرینڈز میں کسی میں یہ بات نہ تھی، اس نے آج بھی نگاہ اٹھا کر میری طرف نہ دیکھا۔ مجھے عجیب سا لگا۔

جاہل عورت، میری اتنی خوب صورت بیوی

موجود ہے۔ مجھے تمہاری کیا پروا؟ لیکن آج میں سوچ رہا تھا کہ کچھ تو ہے جو آج برسوں بعد ایک نظر میں میں نے اسے پہچان لیا... مگر کیا ہے؟

☆☆☆

شجاع بھائی، نادر بھائی، شاہدہ باجی، مکرم بھائی کے بچے سب نے میرا بہت اچھا استقبال کیا۔ شاہدہ باجی بار بار عیسیٰ کا پوچھ رہی تھیں۔ ایک بار آہستہ سے کہنے لگیں۔

''معظم کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم اور مشعل عیسیٰ کی خاطر اکھٹے رہتے؟'' میں خاموش رہا۔

عیسیٰ سے کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی...... آب و ہوا کی تبدیلی سے مجھے بخار رہنے لگا۔ سب میرا خیال رکھ رہے تھے۔ شجاع بھائی کا بیٹا دانیال مجھے شہر لے گیا...... اور اسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہیں مجھے دوسری بار ہارٹ اٹیک ہوا۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو خاندان کے سب افراد کو اپنے گرد دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ شاہدہ باجی میرا سر چومتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''پریشان نہ ہو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں گھر گیا...... سب لوگ میرا خیال رکھتے...... خاص طور پر نادر بھائی کی سب سے چھوٹی بیٹی مریم نے تو جیسے میری ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ وہ مجھے بھی بہت پیاری لگتی...... بیٹی کتنی پیاری ہوتی ہے۔ کاش میری بھی ایسی بیٹی ہوتی اور میری آنکھوں کے سامنے مشعل آ جاتی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

☆☆☆

دوپہر کو میں سو رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ باہر برآمدے میں مریم بیٹھی تھی۔ اس کی میری طرف پشت تھی اور دوسری کرسی پر اسی کی طرح پشت کیے ایک اور عورت بیٹھی تھی۔ مریم کی آواز آئی۔

''خالہ! آپ شنو کو سمجھائیں، بے چاری جوائی کتنی پریشان ہے۔ اس کا شوہر، بیٹے کسی صورت شنو کی شادی صابر سے کرنے کو تیار نہیں، وہ کہتے ہیں صابر ہماری ذات کا نہیں اور ویسے بھی وہ پہلے سے شوکت کو زبان دے چکے ہیں۔ جوائی کہتی ہے کہ پہلے تو شنو کو اعتراض نہیں تھا۔ اب نہ جانے کیوں صابر کا راگ الاپ رہی ہے۔ جوائی بہت روتی ہے خالہ... بہت پریشان ہے۔''

''ہاں، دھیئے، میں بات کروں گی شنو سے، اگر جو اس کی سمجھ میں آ گئی...... مریم، دھیئے، ہر انسان وفا کی ڈوری سے بندھا ہے۔ بیٹی ہے تو ماں، باپ، بہن، بھائی کی عزت سے وفا، بیوی ہے تو شوہر اور ماں ہے تو بچے سے وفا، اپنے شہر، ملک سے وفا اور مسلمان ہے تو اپنے سچے رسول ﷺ اور اس کے رب سے وفا۔ جیسے ایک درخت کا مُڈھ (تنا) ہوتا ہے پھر اس پر شاخیں اور پتے آتے ہیں، اسی طرح سوہنے سچے رب سے بندے کی جو وفا ہے وہ جڑ ہے پھر اس کے رسول ﷺ سے وفا (تنا) مُڈھ ہے اور باقی دنیا کے رشتوں سے وفا اس کی شاخیں اور پتے ہیں...... پہلے اپنے رب اور اس کے رسول ﷺ سے وفا کرو تو سب رشتے تم سے اور تم ان سے وفادار رہو گے۔'' مریم خاموشی سے سن رہی تھی پھر کہنے لگی۔

''مگر خالہ! غیر مسلم بھی تو اپنے رشتوں سے وفادار ہوتے ہیں۔''

''ہاں! مگر دھیئے...... آکاس بیل درخت کو سکھا دیتی ہے، میں نہ تو پڑھی لکھی ہوں، نہ زیادہ عقل ہے، بس اپنے مرحوم باؤ جی سے قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھا۔ تھوڑے بہت مسئلے مسائل پڑھے اور بس...... تم تو خود پڑھی لکھی سیانی بیانی ہو۔''

''اچھا خالہ میں معظم چچا کو دیکھ لوں، آپ بھی ان کے لیے دعا کرنا۔''

''ہاں دھیئے، اللہ تیرے چاچا کو صحت دے، ہمیشہ کا بھلا ہو...... اب مجھے تو ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا میری بہو ہے نا رفعت...... وہ تمہاری قمیص پر کڑھائی کر دے گی۔'' میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ صاحب خاتون تھی۔ اور آج اس کی آنکھیں دیکھے بغیر مجھے معلوم تھا کہ اس کی آنکھوں کا رنگ کیوں اتنا حسین تھا اور کیسا تھا۔ وہ وفا کا رنگ تھا۔

مریم کے آنے سے پہلے میں غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل کرتے ہوئے میرے آنسو بہتے رہے۔ جائے نماز پر سر رکھتے ہوئے میں زار و قطار رو یا۔

''بے شک میں بے وفا تھا لیکن تو میرا رب ہے، گنہگاروں کے گناہ معاف کرنے والا، ان کے پردے رکھنے والا، میں تیرے حضور حاضر ہو، میرے دامن میں کچھ بھی نہیں لیکن تیرے خزانے، تیرا دامن، تیری سلطنت لامحدود...... اور میرا بیٹا...... وہ تیرا بندہ ہے...... تو داتا ہے......''

مغرب کی نماز کے بعد میں سو گیا...... ہلکے سے شور سے میری آنکھ کھلی تو یقین نہیں آیا۔ شجاع بھائی کے بیٹے دانیال کے ساتھ عیسیٰ کھڑا تھا۔ وہ میرے سینے سے لگ گیا۔ دانیال کہنے لگا۔

''چاچو! کیسا سرپرائز ہے؟''

''محبت خود جا کر لے کر آیا ہے۔'' مکرم بھائی کا محب ہنس رہا تھا۔ رات کو میرے پاس بیٹھا عیسیٰ مجھے بتا رہا تھا۔

''ڈیڈ! میری ماما سے ملاقات ہوئی...... ان کی تصویروں کی وجہ سے میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ابھی بھی بہت خوب صورت ہیں مگر بہت بیمار ہیں، ایک سپر اسٹور پر ملی تھیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ آپ دونوں کو جب ساتھ نہیں رہنا تھا تو میری کیا ضرورت تھی مگر جیسے ہی میں نے کہا، کیا آپ مشعل ہیں، ڈاکٹر معظم خان کو جانتی ہیں؟ تو ان کے آنسو بہنے لگے۔''

''ہاں...... پلیز، مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہیں اور تم کون ہو، جب میں نے کہا۔ میں عیسیٰ ہوں تو گلے لگا کر بہت روئیں کہنے لگیں۔ اپنے ڈیڈ سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔ ہماری شادی ختم ہوئی تو میری غلطی سے۔''

''صرف ان کی نہیں، ہم دونوں کی غلطی تھی...... مگر عیسیٰ تم ایسی غلطی نہیں کرنا...... اپنی ماما سے رابطہ رکھنا...... اور کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا جو وفا کرنا جانتی ہو اور وفا کرنا سکھا دے۔''

''ایسی لڑکی کہاں ملے گی ڈیڈ......؟'' عیسیٰ مسکرا رہا تھا اور مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے بہت کم اسے ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ تبھی مریم کمرے میں داخل ہوئی۔

''چاچو! آپ کیسے ڈاکٹر ہیں، بالکل اپنا خیال نہیں رکھتے، اتنی رات کو کیوں جاگ رہے ہیں اور عیسیٰ بھائی آپ بھی اب صبح چاچو کے کمرے میں آئیں گے۔''

''مریم اور عیسیٰ......'' میرے ذہن میں روشنی سی ہوئی۔ میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ صبح جب میں عیسیٰ اور پھر سب گھر والوں سے...... مریم سے بات کروں گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔

مریم اور عیسیٰ مل کر شجرِ وفا کی آبیاری کریں گے تو آنے والے پتے سرسبز رہیں گے۔





قسط 2

زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوکِ شمشیر یہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ، بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں... جب محبت دستک دیتی ہے... اور اس کی خوشبو میں روشنی کی تابناکی بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ... مکر وفریب... سفاکی اور تنگ نظری کے سائے... ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی تڑپ کی ڈگی بھی حکم کے اکّے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول...... جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی......

یکے بعد دیگرے پانچ دکانوں کے شوکیس اپنی نگہ انتخاب سے گزارنے کے بعد بالآخر حجاب کو امی کے لیے جوتوں کا ایک جوڑا پسند آ ہی گیا تھا۔ امی کے لیے ان کے ذاتی استعمال کی کوئی چیز خریدتے ہوئے وہ انتہائی محتاط ہوجایا کرتی تھی۔ چیز دیکھنے میں بھی بھلی بلکہ غیر معمولی لگے، آرام دہ بھی ہو اور امی کی پسند کی بھی۔ امی کے لیے خریداری کرتے ہوئے کفایت کو وہ طاق پر اٹھا دھرتی۔ امی کے لیے پیسے خرچ کرکے اسے ہمیشہ تسکین اور راحت کا احساس ہوتا۔ امی کے لیے جوتے لے کر وہ دکان سے نکل ہی رہی تھی کہ شوکیس میں آراستہ سینڈلز کے ایک جوڑے نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ایسے سبک اور چھوٹی چھوٹی ایڑیوں والے سینڈلز کی تو اسے خود اپنے لیے کافی دنوں سے تلاش تھی۔ وہ دکان میں واپس پلٹ گئی اور سلیز مین سے اپنے سائز کا وہی سینڈل دکھانے کو کہا۔

"آپ بیٹھیں میں دکھاتا ہوں۔" سیلز مین بولا۔ وہ بیٹھ گئی۔

سیلز مین نے چھت کے رخ دیکھتے ہوئے مطلوبہ سینڈل کے ڈیزائن اور سائز کی صدا لگائی۔ چند ہی سیکنڈ بعد اوپر سے جوابی صدا سنائی دی۔ "لیڈی بامنی سکس سائز اکا کلر" اور جوتوں کا ایک ڈبا دکان کی چھت میں موجود موکھے سے فرش پر بچھے دبیز قالین پر آ گرا۔ سیلز مین نے ڈبا کھولا اور اس کے رُوبرو بیٹھ کر اسے سینڈل دکھانے لگا۔ اس نے پاؤں میں پہنا جوتا اتارا اور سینڈل پاؤں میں ڈالا۔

"لائیں میں پہنا دوں۔" سیلز مین نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"شکریہ...... میں خود ہی پہن لوں گی۔" سینڈل پاؤں میں پہننے کے بعد وہ اسے دائیں بائیں، آگے پیچھے تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"دونوں سینڈلز پاؤں میں پہن کر چل کر دیکھیں۔ بہت آرام دہ جوتا ہے۔" سیلز مین نے کہا۔

اس نے دوسرے پاؤں میں بھی سینڈل پہنا اور اٹھ کر سبک خرامی سے دکان میں لگے ایک قدِ آدم آئینے کے رُوبرو جا کھڑی ہوئی اور دونوں پاؤں میں پہنے سینڈلز کا جائزہ لینے لگی۔ سینڈلز کو ایڑیوں کے رخ پر رکھ کر ہمہ تن آئینے کی جانب مڑی تو ایک شخص کو انتہائی محویت سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ براہِ راست اس شخص کی جانب دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ یہ اس کے لیے کوئی پہلا تجربہ نہ تھا۔ اپنی غیر معمولی خوب صورتی کے باعث وہ اکثر یونہی مرکزِ نگاہ بن جایا کرتی تھی۔ مرد کیا عورتیں بھی اسے رشک سے دیکھنے لگتی تھیں۔ وہ دوبارہ سیلز مین کے رُوبرو جا بیٹھی اور پاؤں سے سینڈلز اتارنے لگی۔

"کیا پرائس ہے اس کی؟"

"دو سکس ففٹی۔" سیلز مین نے جوتے کے ڈبے پر لکھی قیمت دیکھ کر بتایا۔

"کوئی اور کلر ہوگا اس میں؟"

"جی نہیں بس یہ ایک ہی کلر کا آیا ہے۔" حجاب سوچ میں پڑ گئی۔ بے ساختگی میں نظر دوبارہ اسی شخص پر جا پڑی وہ ایک شوکیس کے سامنے کھڑا تھا مگر اس کی نظریں اسی پر لگی تھیں۔

"لاحول ولاقوۃ کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میڈم لے جائیں بہت کمفرٹیبل جوتا ہے۔" سیلز مین بولا۔

"جی مجھے یہ کلر نہیں چاہیے۔"

"او کے...... جیسے آپ کی مرضی۔"

کلف دار براق شلوار قمیص میں ملبوس اس شخص کے نزدیک سے گزرنا مجبوری تھی۔ حجاب اس کے پاس سے گزری تو انتہائی نفیس خوشبو کا جھونکا اس کے مشامِ جاں کو معطر کرگیا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی اور دکان سے باہر نکلتے ہوئے اس نے جی ہی جی میں سوچا۔ "آخر ہوں نا عورت۔ دن بھر پبلک ڈیلنگ رہتی ہے۔ خواتین بھی آتی ہیں مرد بھی۔ میڈم میڈم کہتے جن کا منہ نہیں دکھتا اور میں بھی بڑے کروفر اور اعتماد سے ان سے بات چیت کرتی ہوں مگر باہر عوامی جگہوں پر میں بھی ایک عام سی لڑکی، ایک عام سی عورت بن جاتی ہوں جسے غیر مردوں کی نظریں خائف کردیتی ہیں...... عجیب تماشا ہے میڈم پرنسپل!" وہ زیرِ لب مسکرادی۔ رکشا خاصی دیر سے ملا۔ امی کی ایک جاننے والی کو تنہا ٹیکسی میں سفر کے دوران ایسا نامناسب واقعہ پیش آیا تھا کہ امی نے ان سب بہنوں کو سختی سے ہدایت کررکھی تھی کہ اکیلے ٹیکسی میں سفر نہ کریں۔ گھر پہنچی تو امی منتظر تھیں۔

"آج دیر کیوں ہوگئی؟" جواب میں اس نے شاپنگ بیگ سے جوتے کا ڈبا نکالا اور ڈبا کھول کر امی کو جوتوں کا جوڑا دکھاتے ہوئے بولی۔

"یہ دیکھیں کیسے ہیں؟"

"پھر فضول خرچی......؟" امی نے کہا۔

"جی نہیں...... کوئی فضول خرچی نہیں......" اس نے پیار سے امی کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کردیں۔ "کل میں نے دیکھا آپ کے جوتے کا بکل ڈھیلا ہو رہا تھا۔"

"ارے تو کیا وہ اکلوتا جوتا ہے۔ یہ دیکھو اس وقت دوسرا پہنے ہوئے ہوں...... اور بھی ہیں اور اگر بکل ڈھیلا ہو بھی رہا تھا تو کیا ٹوٹے جوتے کو گٹھوایا نہیں جاتا۔"

"اچھا بس میری خوشی...... میں آخر کماتی کس لیے ہوں۔"

بچا کر رکھو وقت پر کام آئے گا...... اور کچھ نہیں تو تمہاری شادی پر۔"

"آپ کو تو بس ہر وقت میری شادی کی پڑی رہتی ہے۔"

"ہر ماں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اولاد اس کی زندگی میں ٹھکانے لگ جائے۔"

"ٹھکانے لگنا بڑا خطرناک محاورہ ہے۔" وہ مسکرائی "ویسے ہمیں اور آپ کو اتنی رواں اردو بولتے دیکھ کر کوئی سوچ تو نہیں سکتا کہ ہم پختون ہیں۔"

"اردو ہماری قومی زبان ہے بیٹا۔ مجھے تو اپنی مادری زبان کی طرح پیاری لگتی ہے۔"

"اچھا ذرا آپ یہ شوز پہن کر دیکھیں۔"

"لے آئی ہو تو پہننا پڑیں گے، پہن لوں گی۔"

"مجھے ایک دفعہ پہن کر دکھادیں۔"

"اچھا بابا......" امی نے جوتے پہن لیے۔

"کیسے ہیں؟"

''اچھے ہیں۔''
''ذرا چل کر تو دکھائیں۔
''لو چل کر بھی دکھا دیتی ہوں۔''
''تھینک یو......''
''السلام علیکم!'' رباب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے صدا لگائی۔
''ہیں......تم گھر میں ہو، کیا جلدی آ گئیں؟'' حجاب نے چونک کر اسے دیکھا۔
''آج چھٹی ماری ہے۔'' رباب مسکرائی۔
''کیوں؟''
''اسائنمنٹ مکمل کرنی تھی۔''
''بہانہ!'' حجاب نے اسے محبت سے گھورا...... ''جب چھٹی کرنا ہوتی ہے اسائنمنٹ کا بہانہ کر کے گھر بیٹھ جاتی ہو۔'' پھر اس نے امی سے شکوے کے لیے روئے سخن ان کی طرف کیا۔ ''ہمیں تو آپ ایک دن بھی چھٹی نہیں کرنے دیتی تھیں۔ بیماری میں بھی گھر سے چلتا کر دیتی تھیں۔ اسے کیوں نہیں کہتیں کہ چھٹی نہ کیا کرے۔''
''تمہارے زمانے میں تو مجبوری تھی۔''
''میرا زمانہ! آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں زمانہ قدیم کی مخلوق ہوں۔ میری دو مرتبہ ڈبل پروموشن اور اس کی اور میری عمر میں لمبے وقفے نے گڑبڑ کر دی ورنہ میں بھی اس کے آگے پیچھے ہی ہوتی۔''
امی دھیرے سے مسکرائیں اور رباب کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''فریج میں سکنج بین بنا کر رکھی تھی میں نے اس کے لیے۔ ایک گلاس لا کر تو پلاؤ اسے تاکہ اس کا غصہ کچھ کم ہو۔ میں تو سمجھی تھی پرنسپل بننے کے بعد یہ میچور ہو گئی ہو گی مگر یہ تو عام لڑکیوں کی طرح ایج کانشس نکلی۔''
''ناٹ ایٹ آل...... ناٹ ایٹ آل ڈیئر مدر، میں ایج کانشس نہیں ہوں۔ ذرا یہ تو بتائیں کہ ہمارے زمانے میں آخر ایسی کیا مجبوری تھی جو آپ ہمیں چھٹی نہیں کرنے دیتی تھیں۔''
''بتانے کی ضرورت ہے کیا!'' امی کی آنکھوں اور آواز دونوں میں دھیما سا کرب تھا۔
''بالکل ہے۔'' وہ امی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
''تم لوگوں کو گھر پر اکیلا چھوڑتے سو طرح کے وہم ستاتے تھے۔ نوکری مجبوری تھی۔ مجھے بھی اپنے اسکول جانا ہوتا تھا۔ میں سوچتی تھی تم لوگ اپنے اپنے اسکول کالج ہو گے تو مجھے گھر کی فکر نہیں ستائے گی، اسکول میں اپنی ذمے داریاں اطمینان سے پوری کر سکوں گی۔ ملازمت کرنے والی عورتوں کے بہت مسائل ہوتے ہیں۔ گھر میں ہوتی ہیں تو فکر ملازمت کی لگی رہتی ہے۔ ملازمت کی جگہ ہوتی ہیں تو دھیان بھٹک بھٹک کر گھر کی طرف جاتا رہتا ہے۔ بڑا مشکل وقت تھا۔ اب میں گھر میں ہوتی ہوں تو جی چاہتا ہے کوئی ہو جو میری تنہائی بٹائے جس سے میں باتیں کروں۔ خاموشی کانوں میں چبھتی ہے اب۔'' امی کے لہجے میں دھیما سا دکھ تھا۔ حجاب کو ان کی آنکھوں میں آبی رو جھلکتی دکھائی دی۔
''ویسے اماں ریٹائرڈ لائف مزے کی ہوتی ہے۔'' حجاب نے اپنی دانست میں ان کا دل ہاتھ میں لینے کی

کوشش کی۔ ''ہوتی ہے نا؟ اپنی مرضی سے سونا، اپنی مرضی سے جاگنا۔ نہ صبح دیر ہو جانے کی وحشت نہ واپسی پر سواری نہ ملنے پر جھنجلاہٹ بس آرام ہی آرام۔ جو مرضی آئے پہنو، باہر نکلو تو یہ فکر نہیں کہ ہاتھ منہ سنوار لو کوئی جاننے والا مل سکتا ہے۔ بڑی عیاشی ہوتی ہے ریٹائرمنٹ میں یار...... آپ نے نہ جانے کیسے پچیس سال نوکری گزار دی۔ میں تو ابھی سے سوچتی ہوں بس حد سے حد بیس سال نوکری کرنی چاہیے خواتین کو۔ یا بیس سال نوکری ورنہ چالیس سال عمر بس اس کے بعد کم از کم خواتین کو تو ریٹائر کر دینا چاہیے۔ یہ کیا یار کہ ساٹھ برس کے ہو کر کمر جھکائے ہائے ہائے کرتے گھر واپس لوٹ رہے ہیں۔ عورتوں کے لیے نوکری کی حد بس بیس سال ہونی چاہیے۔''
''بیس سال کی بھی کیا ضرورت ہے۔'' رباب سکنج بین کے دو گلاس چھوٹی ٹرے میں رکھے دوبارہ کمرے میں وارد ہوتے ہوئے بولی۔
''آئیڈیا یہ بھی برا نہیں۔'' حجاب مسکرائی۔
''سن رہی ہیں امی۔'' رباب نے امی کی جانب دیکھا۔
''سن رہی ہوں۔ ملازمت کرنے والی ماؤں کے بچے اکثر یونہی خلاف ہوا کرتے ہیں عورتوں کی ملازمت کے۔''
''آپ کی تو مجبوری تھی۔ گھر چلانے میں بابا کا ہاتھ بٹانا تھا۔ بعض خواتین تو بلا سبب، بلا ضرورت گھروں سے نکل پڑتی ہیں۔ صرف شوق میں...... محض گھر کی ذمے داریوں سے فرار حاصل کرنے یا گھر والوں کو اپنی نوکری کے رعب میں رکھنے کی خاطر۔'' حجاب بولی۔
''بہت کم، بہت کم ایسا ہوتا ہے بچے۔ زیادہ تر عورتیں ضرورت کے تحت ہی گھر سے نکلتی ہیں۔'' امی نے حجاب کی بات کی تردید کی۔
''مجھے تو اگر اب بھی کوئی ریٹائرمنٹ دینے کو تیار ہو تو میں گھر بیٹھنے میں ایک منٹ کی دیر نہ لگاؤں۔'' حجاب نے ٹھنڈے مشروب کا ایک گھونٹ بھرا۔
''امی ڈھونڈیے کوئی ان کے ریٹائرمنٹ آرڈرز جاری کرنے والا۔'' رباب کے لبوں پر شوخ مسکان تھی۔ حجاب نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کان اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔
''پلیز چھوڑ دیں...... دو ہی ہیں۔''
''فکر مت کرو، میں چار بنا دوں گی۔''
''اِنَّ اللہ مع الصابرین۔'' رباب کے لہجے میں خشیت بھی تھی شوخی تھی۔
''یہ کیوں نہیں کہتیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔''
''وہ بھی کہنا پڑے گا اگر کچھ دیر اور میرا بے چارہ کان آپ کے ہاتھ میں اسی طرح رہا۔''
''چھوڑ دو۔'' امی نے سفارش کی پھر بولیں۔ ''کوئی دیکھے تو کہے یہ ہیں پرنسپل۔''
''کیوں پرنسپل کے سینگ ہوتے ہیں کیا۔''
''اب تو خیر نہیں ہوتے، تمہاری طرح کے بچھڑے بھی پرنسپل بننے لگے ہیں۔ ہمارے زمانے میں گھاٹ

گھاٹ کا پانی پیے، سینگوں والے ہی پرنسپل کی سیٹ پر بٹھائے جاتے ہیں۔"
"ویسے امی!" حجاب نے آہستگی سے رباب کا کان اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ "یہ نیا ٹرینڈ اچھا ہے۔"
"کون سا ٹرینڈ؟"
"جوانوں کو پرنسپل بنانے کا..... کولیگز اور اسٹوڈنٹس جھانک جھانک کر دفتر میں دیکھتی ہیں کہ آج ہماری پرنسپل کیا پہن کر آئی ہیں۔ کس شیڈ کی لپ اسٹک لگائی ہے۔ بڑھے پرنسپلوں کو کون دیکھے بھلا۔" حجاب بولی۔
"بیٹا! تجربے کا کوئی مول نہیں، آپ جیسے جوان، خوبرو، خوش لباس اور فیشن ایبل پرنسپلوں کی سج دھج ایک طرف اور ایک جہاندیدہ اور تجربے کار پرنسپل کا پروفیشنل ازم ایک طرف۔ آپ اس کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتے۔"
"یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" حجاب نے تائید کی۔
"اچھا چلو جا کر چینج کر و تا کہ مل بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھائیں۔"
"رباب آج تو تم گھر پر تھیں امی کو وقت پر کھانا کھلا دیا ہوتا۔"
"ارے بیٹا ساتھ کھانے کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہم تین تو جی ہیں اس گھر میں۔"
"آپ نے بھائی اور بھابی کو شادی کے بعد علیحدہ نہ کر دیا ہوتا تو ہم پانچ بھی ہو سکتے تھے۔" حجاب بولی۔
"بچے! ارم ساتھ رہ کر خوش ہونے والوں میں سے نہیں تھی اور جب ساتھ رہ کر خوش رہنا مشکل لگے تو علیحدہ ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ وہ بھی خوش ہم بھی خوش۔"
"مگر بھائی کو اس علیحدگی کا اب بھی دکھ ہے۔"
"کوئی بات نہیں۔ اس کی فیملی اب اس کے بال بچے ہیں اسے ان کے ساتھ خوش رہنا چاہیے۔ ہمارا کیا ہے ہم تو جہاں بھی رہیں دامن پسار پسار کر اس کے لیے دعائیں ہی کرتے رہیں گے۔"
"یو آر گریٹ مدر....." حجاب نے امی کا ہاتھ چوما۔ "مشکل معاملات سے اتنی آسانی سے کیسے مفاہمت کر لیتی ہیں آپ۔"
"تمھیں کیا پتا آسانی سے یا....." امی کے اس ادھورے جملے میں گہرا حزن و ملال تھا۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ جب سے مونس کا کول گیا تھا رات دس بجے کے بعد فون کی گھنٹی بجتی تو اہل خانہ کا دھیان اسی طرف جاتا۔ اس وقت عموماً وہی فون کیا کرتا تھا۔ اماں اس کی فون کال کے انتظار میں اپنی وہیل چیئر پر بیٹھی جاگتی رہتیں۔
فون کال تقدیم نے ریسیو کی۔ "ہیلو....." اس کی آواز میں کسی آبشار کی سی ٹھنڈک اور نغمگی تھی۔
"ہیلو!"
"مجھے معلوم تھا تمہارا فون ہوگا۔"
"اچھا! الہام کب سے ہونے لگا آپ کو؟" اس کا لہجہ اس کی مسکراہٹ کا غماز تھا۔

"جب سے تم گئے ہو۔" وہ ہنس دیا۔

"اور سنائیں کیا ہو رہا ہے؟"

"اماں تمہارے فون کے انتظار میں حسبِ معمول بستر پر نہیں لیٹیں۔ میں صبح اسکول کے لیے اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ ابھی سب لوگ جاگ ہی رہے ہیں۔ میں فون اماں کے پاس لے جا رہی ہوں۔"

"او کے۔"

"مونس کا فون؟" تقدیم کو فون سمیت اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اماں کی نگاہوں میں ایک جوت سی جاگ اٹھی۔

"جی اماں...... بات کیجیے۔" تقدیم نے فون اماں کی جانب بڑھا دیا۔

"ہاں میرے لال کیسے ہو؟" مونس سے بات کرتے ہوئے اماں کا لہجہ یکسر بدل جایا کرتا تھا۔ مونس کے کاکول جانے سے بہت پہلے ابا نے ایک روز تقدیم سے کہا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں تم بہنیں سارا دن اپنی ماں کی خدمت گزاری میں لگی رہتی ہو مگر تم سب کی خدمت گزاری سے تمہاری ماں کی صحت پر وہ اثر نہیں پڑتا جو مونس کے ان کے پاس ذرا دیر آ کر بیٹھنے سے پڑتا ہے۔ مونس کے ان کے پاس بیٹھتے ہی ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ تکلیف میں بھی ان کی آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔"

تقدیم نے خاموشی سے مشاہدہ کیا تو ابا کی بات کو سو فی صد درست پایا۔ جب سے مونس کاکول گیا تھا اس کی ٹیلی فون کال اماں کے لیے امرت کا کام کرنے لگی تھی۔ طبیعت کسی ہی نڈھال کیوں نہ ہوتی مونس کا فون آتے ہی اماں کی طبیعت بہتر محسوس ہونے لگتی۔ مونس پر وہ اپنی طبیعت کا اضمحلال چنداں ظاہر نہ ہونے دیتیں بلکہ گھر والوں کو بھی ہدایت تھی کہ وہ گھر سے دور ہے اسے کبھی کوئی ایسی بات نہ بتائی جائے جس سے اس کے پریشان ہو جانے کا احتمال ہو۔ سو مونس کو گھر کے مسائل اور پریشانیوں سے ممکنہ حد تک لاعلم رکھنے کی مشق جاری تھی اور اسے سب اچھا ہے کی خبر دی جاتی۔

"سب مزے میں ہیں۔" ابا کہتے۔

"تم ہماری فکر نہ کیا کرو۔ یہاں اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔" اماں اطمینان دلاتیں۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟" تقدیم کو ہمیشہ اس کی ضروریات کی فکر رہتی۔ کبھی کوریئر سروس سے کبھی کسی آتے جاتے کے ہاتھ تقدیم اس کے لیے ضروریات اور استعمال کی چیزیں بھجواتی رہتی۔ اماں اور ابا کو خبر بھی نہ ہوتی۔ بہنوں کی جانب سے اسے مختلف مواقع پر کارڈز ارسال کیے جاتے۔ وہ جب گھر میں سب کے ساتھ تھا اہمیت تو اس کی تب بھی کچھ کم نہ تھی لیکن گھر سے دور جانے کے بعد تو وہ وی وی آئی پی بن گیا تھا۔

مونس خوش تھا کہ گھر سے اس کے دور آتے ہی گھر کی پریشانیاں اور مسائل کم ہو گئے تھے۔ فون پر اس سے بات کرتے ہوئے ابا کا لہجہ جوانوں کی طرح کھنکتا۔ اماں کا ہر جملے کے بعد کراہنا بند ہو گیا تھا۔ تمہید باجی خوشگوار لہجے میں بات کرتیں۔ تقدیم کی ارسال کردہ سوغاتیں اور تحائف اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے گردن اکڑانے کا جواز فراہم کرتے۔ بہنوں کی جانب سے آئے دن موصول ہونے والے کارڈز اسے احساسِ

تفاخر بخشتے۔ کبھی "آئی مس یو" کبھی ذرا سی بیماری پر "گیٹ ویل سون" اور کبھی کسی ٹیسٹ، کسی امتحان، کسی مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے پر مبارک باد کے کارڈز۔ جنم دن آیا تو سب نے علیحدہ علیحدہ کارڈز بھجوائے۔ اماں، ابا کی طرف سے بھی جہازی سائز کے علیحدہ علیحدہ کارڈز...... تقدیم نے کوریئر سروس سے پھول، کیک اور ایک بکس میں سب کی طرف سے علیحدہ علیحدہ تحائف بھی بھجوائے۔ کوریئر سروس سے پھول، کیک اور تحائف کا ڈبا بھجوانا قدرے مہنگا نسخہ تھا مگر مونس کو خوش کرنے اور اسے یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ ان سب کے لیے کس قدر اہم تھا وہ سب کچھ کرنا ضروری تھا۔

ویک اینڈ پر جب زیرِ تربیت نوجوانوں سے ان کے اہلِ خانہ اور دوست احباب ملنے کے لیے آتے تو وطنِ عزیز کے دور دراز علاقوں سے بھرتی ہو کر تربیت پر آنے والے بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح مونس بھی بشرطِ اجازت آؤٹ پاس پر باہر چلا جاتا۔ کچھ وقت اِدھر اُدھر گھوم گھام کر اور باہر ہی کھا پی کر وہ اکیڈمی لوٹ آتے۔ باہر سے آنے والوں کو اکیڈمی بہت مسحور و متاثر کرتی تھی۔ اس کی خوب صورتی اور شادابی، اس کی خاموشی اور سکون، اس کا نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط مگر یہ اس کے باسیوں کو ہی پتا تھا کہ اکیڈمی کے شاداب سبزہ زاروں میں کس کے کتنے آنسو جذب تھے۔ اس کی خاموشی میں کتنا اضطراب تھا اور قواعد و ضوابط میں بے رحمی کی حد تک سختی۔ سونے کو کندن بننے کے لیے کتنی تپش سہنا پڑتی ہے یہ کوئی اکیڈمی میں زیرِ تربیت نوجوانوں سے پوچھتا۔ باہر والے جو دفاعِ وطن کے سپاہیوں کو ملنے والی مراعات پر انگلیاں اٹھائے رکھتے ہیں انہیں کیا پتا کہ وہ کیسے کیسے جذباتی طوفانوں اور جسمانی سختیوں سے دوچار رہتے ہیں اور وہ تنہا نہیں بلکہ ان طوفانوں اور سختیوں کے تلخ گھونٹ ان کے اقربا کو بھی سہنا پڑتے ہیں، سو یہ مراعات اور سہولیات بجا طور پر ان کا استحقاق! اماں سے کوئی پوچھتا کہ وہ دن بھر میں کتنی مرتبہ مونس کو یاد کر کے چپکے چپکے رویا کرتی تھیں۔ ابا بھی انہیں روتے دیکھ لیتے تو سبب پوچھے بنا ان کے پاس بیٹھ کر تسلیاں دینے لگتے۔

"اِدھر وہ پچیس کا ہوگا اُدھر ہم اس کی شادی کر دیں گے۔ چھبیس سال کی عمر میں اسے وہ تمام مراعات حاصل ہونی چاہئیں جو ایک شادی شدہ فوجی افسر کا استحقاق ہوتی ہیں۔ میں بھی کبھی تمہیں کچھ دنوں کو اس کے اور خوش بخت کے پاس چھوڑ آیا کروں گا۔"

اماں بھیگی بھیگی آنکھوں سے ابا کو دیکھنے لگتیں۔

"ہاں، ہاں۔" اماں کی آنکھوں میں پھیلی بے چارگی ابا کو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے اور دلاسا دینے پر مجبور کر دیتی۔ "خوش بخت گھر کی بچی ہے تمہارا بہت خیال رکھا کرے گی۔ جب تمہارا جی چاہے گا میں تمہیں واپس گھر لے آیا کروں گا۔"

اماں اور ابا دونوں ہی خوش بخت کو مونس کی دلہن بنانے کا فیصلہ کر کے بڑے مطمئن اور شاد تھے مگر مونس اس کچی عمر کے نوجوانوں کی گھر سے دوری کبھی کبھی بڑے گمبھیر مسائل کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اپنے والدین کی دلی اور دیرینہ خواہش سے آشنا ہونے کے باوجود مونس کسی اور ہی راستے پر چل پڑا تھا۔

☆☆☆

عائزہ اکیڈمی میں اس کے پچ میٹ عقیل ہمدانی کی کزن تھی۔ عقیل بھی اس کی طرح کراچی سے آیا تھا۔

عائزہ کے والد صبور احمد وزارتِ داخلہ میں سترہ گریڈ کے ملازم تھے۔ اسلام آباد میں مقیم تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے ناتے انہیں سرکاری مکان ملا ہوا تھا۔ عقیل ان کی بہن کا بیٹا تھا۔ بھانجے کی خیر خبر لینے کے لیے وہ تیسرے چوتھے ہفتے ویک اینڈ پر کاکول جاتے رہتے تھے۔ اہلِ خانہ بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ اہلیہ، بیٹی اور دو بیٹے۔ پانچ نفوس پر مشتمل کنبہ ان کی سفید مہران میں بہ آسانی سما جاتا۔ بھانجے سے ملاقات بھی ہو جاتی اور فیملی کی آؤٹنگ بھی۔ صبور احمد کے بچوں میں عائزہ سب سے بڑی اور عقیل سے تقریباً سال بڑی تھی۔ عائزہ سے چھوٹا بھائی تھا منصور احمد اور اس سے چھوٹا ظہور احمد۔

صبور احمد سفید پوش آدمی تھے۔ سترہ گریڈ میں فی زمانہ ہوتا ہی کیا ہے۔ عائزہ کی والدہ طاہرہ اسکول ٹیچر ہوا کرتی تھیں لیکن ان سے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی صبور احمد نے انہیں ملازمت سے استعفا دلوا کر گھر بٹھا دیا تھا۔ طاہرہ ایک سمجھدار اور ذمے دار عورت تھیں۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں ان کا کردار نہایت نمایاں تھا۔ صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ سے مونس کی پہلی ملاقات انہی کے گھر میں ہوئی تھی۔ لانگ ویک اینڈ تھا اور عقیل ویک اینڈ اپنے ماموں کی فیملی کے ساتھ گزارنے کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا۔

"یار تو اچھا ہے ماموں نزدیک ہی رہتے ہیں، کبھی وہ آ جاتے ہیں کبھی تو چلا جاتا ہے۔ ہمیں تو گھوم پھر کر لانگ ویک اینڈ بھی یہیں گزارنا پڑتا ہے۔" مونس نے عقیل کو جو اس کا روم میٹ بھی تھا اسلام آباد جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر رشک سے کہا۔

"تجھے چلنا ہے تو چل میرے ساتھ۔" عقیل نے کہا۔

"نہیں یار! کیا کہیں گے تمہارے ماموں خود آیا تو آیا ایک اور کو ساتھ لے آیا۔ دن بھر کا معاملہ ہوتا تو میں چلا چلتا مگر تُو تو رات کو وہاں ٹھہرے گا۔ نہیں یار اچھا نہیں لگتا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں یار...... ماموں کے پاس سرکاری مکان ہے۔ ساتھ سرونٹ بھی ہے کمپلیٹ فیملی یونٹ، کمرا، کچن، باتھ سب کچھ ہے۔ دوسرے لوگ سرونٹ کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ کرایہ بھی لیتے ہیں، گیس بجلی کے بل کا شیئر بھی وصول کرتے ہیں مگر میرے ماموں نے اپنا سرونٹ خالی رکھا ہوا ہے۔ کوئی ایسا مہمان آ جائے جس سے مامی اور عائزہ باجی کو ریزرو رہنا ہو تو ماموں اسے سرونٹ میں ہی ٹھہراتے ہیں۔ میں بھی جب کبھی جاتا ہوں وہیں ٹھہرتا ہوں۔"

"مامی اور عائزہ باجی کو تجھ سے ریزرو رہنا ہوتا ہے۔" مونس نے اسے شوخی سے دیکھا۔

"او نہیں یار! اکیلے میں آدمی اپنی مرضی سے لیٹتا بیٹھتا ہے۔ منصور اور ظہور بھی وہیں آ جاتے ہیں۔ ہم مل کے خوب گپ شپ کرتے ہیں۔ گانے سنتے ہیں۔ لمبی تان کر سوتے ہیں۔ گرم گرم کھانا اور ناشتا ٹرے میں سجا کر وہیں پہنچا دیا جاتا ہے۔"

"کیا عیش ہیں جناب۔"

"دعوت دے رہا ہوں تجھے بھی۔"

"نہیں یار...... جی تو چاہتا ہے پر اچھا نہیں لگتا...... تیرے تو وہ ماموں ہیں میرے......"

"او یار چل تو سہی...... میرے ماموں تیرے بھی ماموں بن جائیں گے، بہت نائس بندے ہیں میرے

ماموں۔"

"آؤٹ پاس کا بھی مسئلہ ہوگا۔ لانگ ویک اینڈ پر آفیسرز کو بھی گھر جانے کے لیے اٹھنے کی جلدی رہتی ہے۔"

"کوئی بندوبست کر لیتے ہیں یار۔" عقیل نے آنکھ دبائی۔ سینئرز اور آفیسرز کی گڈ بکس میں رہنے کے لیے اس کا اکیڈمی میں خاص شہرہ تھا۔

عقیل نے بھاگ دوڑ کر کے اس کے لیے بھی آؤٹ پاس بنوا لیا۔ مونس کو ایک انجان گھر میں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی مگر وہ خوش تھا کہ اپنا نہ سہی عقیل کے ماموں کا گھر ہی سہی جہاں وہ لانگ ویک اینڈ گزارنے جا رہا تھا۔ فوجیوں کے بارے میں یہ کہاوت کتنی سچ ہے کہ فوجی گھر اور نیند کے بھوکے ہوتے ہیں۔

صبور احمد واقعی اچھے آدمی تھے۔ عقیل تو خیر ان کا بھانجا تھا انہوں نے مونس کو بھی بہت عزت اور محبت سے اپنے گھر کے سرونٹ میں جسے وہ مہمان خانہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے ٹھہرایا اور دو دن تک ان دونوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ منصور اور ظہور جلد ہی عقیل کی طرح اس سے بھی بے تکلف ہو گئے۔ پہلے دن صبور احمد نے اس سے خاصا تفصیلی تعارف لیا اور دوسرے دن دوپہر کا کھانا ٹرے میں لگا کر سرونٹ میں بھجوانے کے بجائے ان دونوں کو اپنے گھر میں بلا کر ڈرائنگ کم ڈائننگ میں پڑی کھانے کی میز پر تمام اہلِ خانہ کے ساتھ کھلایا۔ صبور احمد کی اہلیہ اور اکلوتی بیٹی عائزہ سے بھی مونس کا تعارف ہو کر وہ گویا پورے گھرانے سے واقف ہو گیا۔ عقیل نے اکیڈمی میں اس کی لیاقت کا ایسے موثر انداز میں نقشہ کھینچا کہ کھانے کی میز پر صبور احمد کی اہلیہ اس سے بڑی شفقت سے بات چیت کرنے کے ساتھ اسے اصرار کر کر کے اپنی پلیٹ میں اور کھانا نکالنے پر مجبور کرتی رہیں۔ عائزہ جو عام نک سک کی دبلی پتلی سی لڑکی تھی خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ صبور احمد نے مونس کو اس کے بارے میں خود بتایا۔

"یہ ہماری صاحبزادی عائزہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہیں۔ آخری سال ہے ان کا۔ ماشاءاللہ بہت قابل ہیں، اسکول کے زمانے سے اب تک اسکالر شپ لیتی رہی ہیں۔ میں تو انہیں خود کفیل بیٹی کہا کرتا ہوں۔" مونس خاموشی سے سنتا رہا۔ کچھ بولنے کی حاجت تھی نہ ضرورت۔

شام کو جب وہ دونوں اکیڈمی واپس جانے لگے تو صبور احمد نے بڑی اپنائیت سے اس سے کہا۔ "مونس بیٹے! اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ جیسے عقیل چھٹی گزارنے کے لیے یہاں آتا ہے تم بھی آ جایا کرو جب جی چاہے، بلا تکلف۔ ہم سادہ سے لوگ ہیں، نہ خود تکلیف میں پڑتے ہیں نہ دوسرے کو تکلف کرنے دیتے ہیں۔ روکھا سوکھا جو ہوتا ہے حاضر کر دیتے ہیں۔ ہم بھی خوش آنے والا بھی خوش، مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ پندرہ سال ہو گئے مجھے اس گھر میں رہتے، سرونٹ بھی کرائے پر نہیں اٹھایا، اسے مہمان خانہ بنا رکھا ہے جو آئے بسم اللہ...... پھر آنا، ضرور آنا بیٹا، مجھے خوشی ہوگی۔"

"بہت، بہت شکریہ۔" مونس نے کہا۔

"ارے نہیں بیٹا، شکریہ کی بھلا کیا بات۔ تم ہمارے لیے ایسے ہی ہو جیسے عقیل۔" صبور احمد کی اہلیہ بولیں۔

''منصور اور طہور تو دو ہی دن میں تمہارے فین ہو گئے ہیں۔'' صبور احمد نے مزید کہا۔
''اصل میں دونوں خود بہت فرینڈلی ہیں۔'' مونس نے انکساری سے کہا۔
''ہاں یہ تو ہے ہمارے تینوں ہی بچے بہت فرینڈلی ہیں...... ایک دو مرتبہ آؤ گے تو عائزہ بھی تم سے بے تکلف ہو جائے گی۔ بہت جینئس بچی ہے، تھرو آؤٹ اسکالرشپ ہولڈر۔'' بیگم صبور احمد کے لہجے میں احساسِ تفاخر تھا۔
''اچھا ماموں جان اجازت......'' عقیل نے کہا۔
''او کے بیٹا، دیکھو مونس کو پھر ساتھ لے کر آنا تمہاری ذمے داری ہے۔''
''جی ضرور......'' عقیل نے اپنے سینے پر دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔
راستے میں عقیل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''یار ماموں جان تو ایک ہی وزٹ میں تیرے فین ہو گئے۔''
''بہت اچھے ہیں تیرے ماموں اور ان کی فیملی۔''
''ہاں یار اس میں کوئی شک نہیں۔ اول درجے کے اونسٹ انسان ہیں ماموں جان، حالانکہ جس سیٹ پر وہ بیٹھے ہیں سنا ہے وہاں سے لوگ جھولی بھر کے اٹھتے ہیں۔''
''ایسے ہی لوگوں سے تو یہ ملک چل رہا ہے ورنہ یہاں تو اکثریت مادرِ وطن کو لوٹنے اور اپنی جیبیں بھرنے کے درپے رہتی ہے۔ میرے ابا بھی بہت ایماندار آدمی ہیں۔''
''ایسے لوگوں کو اللہ اچھی اولاد سے نوازتا ہے۔ اب دیکھ نا عائزہ باجی تھرو آؤٹ اسکالرشپ ہولڈر رہی ہیں۔ انجینئرنگ یونورسٹی میں بھی جہاں اب تو ہر سمسٹر میں مٹھی بھر فیس دینا پڑتی ہے عائزہ باجی کو کچھ نہیں دینا پڑتا۔ ہر سمسٹر میں آؤٹ اسٹینڈنگ رزلٹ۔''
''تو باجی کیوں کہتا ہے انہیں؟''
''یار ڈیڑھ سال بڑی ہیں۔''
''کیا فرق پڑتا ہے۔'' مونس نے معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔
''اوئے نہیں یار......'' عقیل اس کی مسکراہٹ کے معنی پا گیا تھا۔ ''میری مانگ تو میری خالہ کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔''
''اتنی اہم بات آج بتا رہا ہے۔'' مونس شاکی لہجے میں بولا۔
''پہلے کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔'' مونس کا جی چاہا اسے بتا دے کہ اس کی اپنی مانگ بھی چھوٹی پھپھو کے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی محتاط طبعی مانع رہی۔
اگلی بار جب وہ عقیل کے ساتھ اسلام آباد گیا تو صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ نے پہلے سے زیادہ تپاک سے خوش آمدید کہا۔ منصور اور طہور نے برسوں کی شناسائی کا مظاہرہ کیا۔ منصور کالج میں سال اول کا طالبعلم تھا۔ طہور نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ دونوں بہت شوخ مگر تمیز دار تھے۔ ان کی باتوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔
عائزہ اپنی یونیورسٹی میں ہونے والی سائنسی نمائش کے لیے کوئی ماڈل تیار کرنے میں مصروف تھی۔
''عائزہ بیٹی یہ دو نوجوان تمہاری مدد کے لیے آ گئے ہیں۔'' صبور احمد نے اس سے مذاقاً کہا۔
''کیوں شرمندہ کرتے ہیں ماموں جان! عائزہ باجی کے تو پاؤں کی دھول بھی نہیں ہیں ہم۔'' عقیل بولا۔

''تم صرف اپنی بات کر سکتے ہو عقیل۔'' عائزہ نے بے ساختہ کہا۔
''او...... یس۔'' عقیل نے اپنے کان کی لو کو چھوتے ہوئے مونس کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں، یہ جو حضرت میرے ساتھ ہیں آپ کی طرح یہ بھی تھرو آؤٹ ٹاپر رہے ہیں۔ اکیڈمی میں بھی ان کی لیاقت کا ڈنکا بجنا شروع ہو چکا ہے۔''
''پھر تو تمہیں سول لائف میں رہنا چاہیے تھا مونس بیٹے۔'' صبور احمد نے فوراً کہا پھر اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''ذہین لوگوں کے لیے سول لائف میں زیادہ مواقع ہوتے ہیں آگے بڑھنے کے۔''
''افواج میں بھی ایسا ہی ہے۔'' مونس بولا۔
''بلکہ فوج میں تو ذہین لوگ یوں اوپر جاتے ہیں۔'' عقیل نے چٹکی بجائی۔
''پاپا یہ تو رولنگ پارٹی ہے...... حکمران جماعت۔'' عائزہ مسکرائی۔
''ایگزیکٹلی!'' بیگم صبور احمد نے پُرزور انداز میں بیٹی کی تائید کی۔
''ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم کوشش کریں گے۔'' مونس نے عائزہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''تھینک یو ویری مچ...... میکینیکل سائڈ پر شاید مجھے آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑے۔''
''ہمیں خوشی ہو گی۔'' مونس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔
''تھینک یو۔''
''اب آپ نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ صرف اپنی بات کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے میں مدد کر سکتا ہوں مگر نہ کرنا چاہوں۔'' عقیل نے عائزہ سے کہا۔
''تمہیں اپنی خوبی بیان کرنے کی ضرورت نہیں، تم ہمیشہ کے ایسے ہی ہو...... نکمے کہیں کے۔'' عائزہ نے عقیل کو گھورتے ہوئے کہا۔
''ہا...... ہا...... ہا......'' عقیل منہ اوپر کر کے زور سے ہنسا۔
''اسے اکیڈمی میں تو خوب رگڑا ملتا ہو گا اس کی حرکتوں پر۔'' عائزہ نے مونس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
رگڑا تو سبھی کو ملتا ہے۔'' مونس نے کہا۔
''ایمان سے بڑی مشکل لائف ہے۔'' عقیل نے منہ بسورا۔
''بیٹا! زندگی تو ہر جگہ ہی مشکل ہوتی ہے۔ انسان کو اس میں اپنے لیے آسانیاں خود فراہم کرنا پڑتی ہیں۔ افسر بن جاؤ گے تو زندگی کا یہ دور یاد آیا کرے گا تمہیں۔'' صبور احمد کے لہجے میں دلسوزی اور بھانجے کے لیے پیار تھا۔ انہوں نے پل دو پل کو توقف کیا پھر بولے۔ ''پرسوں آپا جان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں میں نے سنا ہے اس سرد موسم میں سینئر اپنے جونیئر کو ٹھنڈے پانی سے باتھ لینے کو کہتے ہیں......''
''صرف!'' عقیل نے معنی خیز نظروں سے مونس کو دیکھا۔
''میں نے انہیں تسلی دی کہ ایسا ایک آدھ بار کسی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔'' صبور احمد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔
''ویسے اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے کیا؟''

''کولڈ باتھ کا؟''عقیل نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔
''ہاں میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔''
''جان بنتی ہے۔''عقیل مسکرایا اور اس نے مونس سے تائید چاہی۔''کیوں مونس؟''
''یہ سب کچھ ہمیں دشمن کے خلاف ناقابلِ تسخیر بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔''
''پھر تو ٹھیک ہے۔''
''جی ہاں دسمبر جنوری میں آدھی رات کو ایک مرتبہ کولڈ شاور لینا پڑ جائے تو نانی یاد آجاتی ہے۔''عقیل نے جھرجھری لی۔
''تم اپنی بات مت کرو۔ تمہیں تو ویسے بھی ہر وقت نانی یاد آتی رہتی ہوں گی۔''عائزہ مسکرائی۔
''واقعی عائزہ باجی بہت مس کرتا ہوں میں نانی کو...... جب میں گھر میں ہوتا تھا نانی ہی میرے برے وقت پر کام آتی تھیں...... یار کمال ہے صورت دیکھ کر سمجھ جاتی تھیں کہ آج اس کی جیب خالی ہے۔''
''اچھا اب آپ میرا دماغ خالی مت کریں۔ مجھے کام کرنا ہے۔ کمرے میں جائیں ماما سے کہتی ہوں آپ دونوں کے لیے اچھی سی چائے بنائیں۔''
''نہ نہ اس کی ضرورت نہیں فی الحال تو ہم دونوں آوارہ گردی کے لیے باہر جا رہے ہیں۔''
''دونوں نہیں تینوں......''منصور نے کہا۔
''چاروں۔''طہور نے گرہ لگائی۔
''او زندہ باد......''عقیل نے نعرہ لگایا۔
پھر یوں ہوا کہ صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ کا عقیل سے ملنے کے لیے کاکول آنا تقریباً موقوف ہی ہو گیا۔ چھٹی ملتی تو عقیل کے ساتھ مونس بھی اسلام آباد چلا جاتا۔ صبور احمد کے سرونٹ کوارٹر میں جسے وہ بطور مہمان خانہ استعمال کرتے تھے انہیں کھانا پینا، آرام دہ بستر غرض ضرورت کی ہر چیز اور گھر کا ماحول ملنے لگا۔ عقیل کے ساتھ صبور احمد کے گھر میں چھٹی گزار کر مونس اکیڈمی واپس لوٹتا تو صبور احمد کے گھر میں ملنے والے پروٹوکول نے اسے تازہ دم کر رکھا ہوتا۔ صبور احمد اور ان کے اہلِ خانہ اس سے اس قدر اپنائیت سے پیش آتے کہ اپنے گھر اور گھر والوں سے دوری کا احساس دھیما پڑ جاتا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ لوگ اسے عقیل سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ سب کے سب اس سے فون پر بھی رابطہ رکھنے لگے تھے۔ عائزہ بھی۔ ویک اینڈ سے پہلے ہی اسے صبور احمد، ان کی اہلیہ اور بچوں کی جانب سے دعوت ملنے لگتی۔
''مونس میاں ویک اینڈ پر گھر آ رہے ہو نا؟''صبور احمد کہتے۔
''مونس بیٹے جلدی سے بتاؤ، کیا پکاؤں میں تمہارے لیے؟''بیگم صبور پوچھتیں۔
''مونس بھائی آپ آئیں گے تو ہم لوگ کے ایف سی چلیں گے۔''منصور کہتا۔
''مونس بھائی! سنڈے کو میچ کھیلیں گے؟''طہور کرکٹ کا دیوانہ تھا۔
''ویک اینڈ پر آ رہے ہو نا؟''عائزہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں پوچھتی۔
اور وہ آؤٹ پاس لینے کے لیے بے تاب ہو جاتا۔ ایک آدھ بار تو یوں بھی ہوا کہ عقیل کی اکیڈمی میں کسی

مصروفیت کے باعث وہ اکیلا ہی صبور احمد کے گھر چلا گیا۔ نہ اسے اکیلے جاتے جھجک محسوس ہوئی نہ ان لوگوں نے برا منایا بلکہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اب تو وہ سب اس پر اتنے مہربان تھے کہ اسے بہانے بہانے مدعو کیا جاتا۔
''مونس میاں سنڈے کو تمہاری آنٹی سری پائے پکا رہی ہیں، تمہارا آنا لازم ہے۔''صبور احمد کہتے۔ کبھی کوئی چھوٹی موٹی تقریب اسے مدعو کرنے کا جواز بن جاتی۔
''کل طہور کا برتھ ڈے ہے مگر ہم لوگ سٹرڈے کو پارٹی کریں گے۔ تمہیں ضرور آنا ہے مونس بیٹے۔''صبور احمد کی بیگم کہتیں۔
''پوری کوشش کروں گا۔''
''لازم بیٹے تمہارا آنا ضروری ہے ورنہ طہور میاں کہتے ہیں... کیک اس ہفتے نہیں کاٹوں گا اگلے ہفتے جب مونس بھائی آئیں گے تب۔''
''آنٹی میری پوری کوشش ہوگی۔''
''اور ہاں دیکھو بیٹا کسی تکلف میں نہ پڑنا۔ گفٹ وفٹ کی قطعاً ضرورت نہیں۔''
''یہ کیسے ہو سکتا ہے آنٹی۔''
''ہماری خوشی بیٹا...... تم تو بہت اچھے، بہت سعادت مند بچے ہو۔ اپنی آنٹی کی بات نہیں مانو گے۔ تمہاری ماں سمان ہوں میں۔''
''اچھا آنٹی...... جیسے آپ کی مرضی۔''
''تھینک یو میرا بچہ......''بیگم صبور احمد بہت محبت سے کہتیں۔ کبھی کوئی تہوار کوئی مخصوص دن آ جاتا۔
''عائزہ گیارھویں شریف کی نیاز ہم لوگ سٹرڈے یا سنڈے کو کریں گے بیٹا...... تم مونس کو فون کر دینا۔''
صبور احمد کی بیگم مونس کو اپنے ہاں کسی خاص حوالے سے مدعو کرنے کی ذمے داری کبھی کبھی عائزہ کو تفویض کر دیتیں۔
''او کے ماما۔''
کبھی یوم آزادی پر چراغاں دیکھنے کے لیے رات کو باہر جانا مونس کے بلاوے کی وجہ بن جاتا تو کبھی کوئی بہانہ اسے مدعو کرنے کا سبب بنتا۔
سرکاری تعطیل کے علاوہ کسی اور موقع پر صبور احمد کے ہاں جانے کے لیے مونس کھانچے لگانے لگا۔ کبھی کھانچا فٹ ہو جاتا کبھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔
''تم آئے کیوں نہیں؟''عائزہ گلہ کرتی۔
''چھٹی نہیں ملی یار۔''
''یو فولش جنٹلمین! تمہیں اچھا سا بہانہ ہی نہیں ہاتھ لگا ہوگا۔''
''آئی ایم اونسٹ یار، مجھ سے زیادہ بڑا جھوٹ نہیں بولا جاتا۔''
''پاپا کی پرابلم بھی یہی ہے...... خیر میری ماما نے بھی تو ایک اونسٹ آدمی کے ساتھ گزارہ کر ہی لیا۔''

"یو مین تم بھی کرلوگی۔"

"مجبوری ہے۔" نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی اور مونس کے گھر والے اس سے قطعاً لاعلم تھے۔

☆☆☆

مدثر اور تسنیم کا عشق بھی دن دونی رات چوگنی زقندیں بھر رہا تھا۔ تسنیم گھر سے یونیورسٹی جانے کو نکلتی مگر راستے ہی میں مدثر اسے آلیتا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں، کبھی کسی پارک کے سنسان قطعے میں تو کبھی کسی ریستوران کے الگ تھلگ گوشے میں مدثر اسے اپنی لچھے دار باتوں سے مدہوش کیے جاتا۔ ایسے لوگوں کا وتیرہ یہی ہوتا ہے' معصوم اور سادہ لوح لڑکیوں کو اپنی چرب زبانی سے رجھاتے اور سنہری باغ دکھاتے ہیں۔ عقلمند اور عاقبت اندیش لڑکیاں ایسوں کو گھاس نہیں ڈالتیں۔ تسنیم کا مسئلہ یہی تھا کہ گھر میں تو وہ بہت مزاج داری دکھاتی تھی، ذرا ذرا سی بات پر نخرہ، بھائی بہنوں سے جھگڑا، والدین سے بدتمیزی اور سرکشی لیکن درحقیقت وہ ایک سادہ اور ناعاقبت اندیش لڑکی تھی۔ اسے دنیا کی اونچ نیچ، زندگی کے پیچ وخم کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا ورنہ مدثر کی باتوں میں نہ آتی۔ گھر میں ڈھیروں مسائل تھے۔ ابا قلیل آمدنی والے آدمی، اماں معذور، بھائی گھر سے دور۔ ویسے جب تک وہ گھر میں رہا تسنیم بہنوں میں واحد تھی جو اس سے بھی بات بے بات لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ بہنیں اپنے اپنے حصار میں محصور۔ تمہید باجی صبح سے رات تک گھر کے دھندوں میں الجھی رہتیں۔ تقدیم کو ملازمت اور ٹیوشنز سے فرصت نہیں ملتی۔ چھوٹی دونوں بہنوں کی موجودگی بھی عدم موجودگی کی طرح تھی۔ کسی کو ان بے چاریوں کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ ایسے میں تسنیم کا اپنے مدار سے ہٹ جانا کوئی انہونی بھی نہ تھی۔ ایسا ہوتا ہے گھر میں مسائل کا انبار ہو، توجہ نہ مل رہی ہو تو کبھی کبھی نوجوان لڑکے، لڑکیاں فرار...... کی کوشش میں یونہی بھٹک جاتے ہیں جیسے تسنیم بھٹک گئی تھی۔ کہاں کی یونیورسٹی اور کہاں کی پڑھائی۔ مدثر تو اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہوچکا تھا کہ اسے نہ اس کی ڈگری سے غرض تھی نہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد کسی عہدے سے۔ اسے تو فقط اسی کی چاہ تھی۔

"مجھے بس تمہارا ساتھ چاہیے تنویم۔" وہ کہتا۔

"کیوں میرا نام بگاڑتے ہو۔" وہ اسے تیکھی نظروں سے دیکھتی۔ وہ مسکرا دیتا۔

"نام تو نہیں بگاڑتا یار، تم اپنے گھر والوں کے لیے تسنیم ہوگی میرے لیے تو تم تنویم ہی ہو۔ تمہیں دیکھ کر ہوش کھونے لگتا ہوں یار۔ جسٹ نمب...... بولنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے گونگا ہوجاتا ہوں۔"

"ماشاءاللہ! گونگے پن پر آپ کا یہ عالم ہے۔" وہ اک ادائے دلبرانہ سے کہتی۔

"تم سے شادی کے بعد بس تمہارے ہی قصیدے لکھے جاؤں گا۔"

"جناب قصیدوں سے پیٹ نہیں بھرتے، یہ سوچیے کہ گزارہ کیسے ہوگا۔"

"جیسے منعم اور اس کی بیوی کا ہورہا ہے...... باپ کی کمائی پر بس اسی بدمعاش اور اس کی بیوی بچے کا حق تو نہیں، میرا اور میری بیوی بچے کا بھی ہوگا بلکہ زیادہ ہوگا کیونکہ میں بڑا ہوں۔"

مدثر ایک روز اسے اپنے باپ کے ہوٹل بھی لے گیا تھا۔ وہ بہت ہراساں تھی۔

"کیوں اتنی نروس ہورہی ہو یار!" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے بولا۔

"اس وقت تو تمہارے ڈیڈی یہاں نہیں ہیں انہیں پتا چل گیا تو......؟" اس نے ہوٹل کے فیملی روم میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا...... ڈیڈی بہت لبرل آدمی ہیں۔ وہ کہتے ہیں بچوں کو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ ڈیڈی کا مزاج ہی اور ہے۔ میری ممی کے علاوہ ایک کیپ بھی رکھی ہوئی ہے انہوں نے۔"

"کیپ! وہ کیا؟"

"بےوقوف!" وہ اس کی ناک کو اپنی انگشتِ شہادت سے چھوتے ہوئے مسکرایا۔ "کیپ کو ہندوستانی زبان میں رکھیل کہتے ہیں۔ رکھیل کا مطلب تو سمجھتی ہونا...... ایسی عورت جسے کسی مرد نے شادی کیے بنا گھر میں ڈال رکھا ہو۔ سالی کو ڈیڈی نے بنگلا لے کر دے رکھا ہے۔ ممی مائنڈ نہیں کرتیں، کہتی ہیں میں تمہارے باپ کے نخرے دیکھنے سے بچی رہتی ہوں۔ ڈیڈی ذرا ٹیپ ٹاپ والے آدمی ہیں ہر وقت سوٹ بوٹ میں رہنے والے اور مزاج بالکل پارے کی طرح، ان پری ڈکٹیبل یار...... آپ کہہ ہی نہیں سکتے کہ اگلے لمحے وہ کیا کریں گے۔ ممی سے کافی کی فرمائش کرتے ہیں اور گاڑی میں بیٹھ کر ہارن بجانے لگتے ہیں کہ باہر چلنا ہے۔"

وہ اپنی کہنیاں میز پر ٹیکے اپنے دلکش چہرے کا زیریں حصہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کی مچان پر دھرے ہرنی جیسی آنکھوں سے اسے دیکھتی اور چپ چاپ سنتی رہتی۔

"بٹ آئی لو ہم...... آئی لو ہم......"

"بی کاز ہی از یور فادر؟"

"یس......" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہی از ٹو انوسینٹ، بہت سادہ ہیں وہ سالی جو اُن کی رکھیل ہے دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے انہیں اور ڈیڈی لٹتے رہتے ہیں۔"

"تم ڈیڈی کا اس سے پیچھا کیوں نہیں چھڑاتے؟"

"یار! عورت سے مرد کا پیچھا صرف ایک عورت ہی چھڑا سکتی ہے اور ممی گو اَپ کرچکی ہیں۔ انہیں کچھ کہو تو وہ کہتی ہیں، مجھے تکلیف کیا ہے اور تمہارے بڈھے باپ نے بھلا جانا کہاں ہے۔ چار دن کا دم خم اور ہے۔ شام کو اپنے گھر ہی لوٹے گا اپنی بیاہتا بیوی اور بچوں کے پاس۔ ایک تو عورتوں کو اپنے بیاہتا بیوی ہونے کا نہ جانے کیوں اتنا زعم ہوتا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ "کیا تم بھی بیاہتا ہو کر میرے بارے میں ایسی ہی بے پروا ہو جاؤ گی؟"

"مدثر!" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر! کس بات سے؟"

"تمہاری ایسی باتوں سے۔"

"کم آن یار ڈیڈی ہماری پرابلم نہیں ہیں۔ ان کی فکر ممی کو ہونی چاہیے۔"

"میں ڈیڈی کی بات نہیں کررہی ہوں۔"

"تو پھر!" وہ چونکا۔

"جب تم کسی بھی طرح اپنی اور میری شادی کی بات چھیڑ دیتے ہو تو میں پریشان ہوجاتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں...... ممی، ڈیڈی دونوں میری پسند کو فوقیت دیں گے۔ جاب کی مجھے پروا نہیں جس

دن سر پر ذمے داری پڑے گی بندہ بن کر اپنے ہوٹل کے منیجر کاؤنٹر پر جا بیٹھوں گا۔"

"پرابلم تمہاری طرف نہیں میری طرف ہے، میرے گھر میں، جب تک تمہید باجی اور تقدیم باجی کی شادی نہیں ہو جاتی میں اپنی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم نہیں سوچ سکتیں میں تو سوچ سکتا ہوں۔ ممی، ڈیڈی کو کل ہی بھیج دیتا ہوں تمہارے گھر۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"کیوں؟"

"اماں، ابا نہیں مانیں گے۔ جب تک بڑی بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی۔ اماں ابا میرے بارے میں سوچیں گے بھی نہیں۔ ایک دو رشتے آئے تھے میرے لیے اماں ابا نے منع کر دیا۔ ساری پرابلم تمہید باجی کی وجہ سے ہے۔ وہ بے چاری قبول صورت سی ہیں۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے زیادہ پڑھ بھی نہیں سکیں۔ ان کے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہیں آتا۔ کسی اور بہن کے لیے آئے تو وہ خود رونا دھونا ڈال دیتی ہیں۔"

"سائیکی ہیں وہ۔"

"ہاں لگتا تو یہی ہے کہ حالات نے انہیں سائیکی کر دیا ہے۔"

"اور پاگل ہیں تمہارے اماں ابا۔"

وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"سوری! وہ نظریں چرا کر بولا۔ "تمہیں میری بات بری لگی ہوگی مگر ایسے والدین جو بڑی کی شادی کے انتظار میں اپنی چھوٹی بیٹیوں کی شادی کا وقت بھی نکال دیتے ہیں بے وقوف ہوتے ہیں۔ ارے بھئی جن کی ہو رہی ہے ان کی تو کرو۔ انہیں کیوں خوشیوں سے محروم کرتے ہو۔ دیکھو یار زندگی کی جو ترنگ آج تمہارے پاس ہے کل نہیں ہوگی۔ جتنی خوب صورت تم آج لگتی ہو کل شاید اتنی نہ لگو......"

"تمہارا مطلب ہے میں...... بوڑھی ہو جاؤں گی؟"

"اوہو یار میں ایک بات کر رہا ہوں، ایک تو تم عورتیں عمر کے معاملے میں نہ جانے کیوں اتنی کانشس ہوتی ہو۔ دیکھو ہو سکتا ہے کل حالات وہ نہ رہیں جو آج ہیں۔ میں تم سے آج جتنی محبت کرتا ہوں ہو سکتا ہے کل مجھے تمہاری اتنی چاہ نہ رہے۔"

"بدل جانے کی بات کر رہے ہو۔" تسنیم نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"ایک بات کر رہا ہوں...... یہ دنیا ہے یار، یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ خون سفید ہو جاتے ہیں۔ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" باتیں بنانے اور جملے سے جملہ جوڑنے میں تو مدثر کو کمال حاصل تھا۔

"میں اور تم اتنی دور جا چکے ہیں مدثر کہ تم اپنا راستہ بدل لو تو اور بات، میرا راستہ کبھی نہیں بدلے گا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں...... آخری سانس تک کرتے رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے انتہائی جذب کے عالم میں کہا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں ہمیں شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" وہ اسے وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک مشہور رومانی گیت کا مکھڑا گنگنانے لگا۔

تسنیم کی آنکھیں اس خیال سے بھر آئیں کہ حالات نے اسے کس قدر پابند سلاسل کر رکھا تھا۔ اوسط درجہ گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے رشتوں کے کال کے اس دور میں ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان اس سے شادی کا طلبگار تھا اور وہ بے بس تھی۔ اسے پتا تھا مدثر کے ماں باپ آتے بھی تو اماں ابا نے انہیں یا تو انکار کر دینا تھا یا پھر بڑی دونوں بہنوں کی شادی ہونے تک انتظار کرنے کو کہتے۔

؎ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

"کیا ہوا؟" مدثر نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں...... ایک طرف تم ہو اور تم سے میری بے پناہ محبت اور دوسری طرف میرے گھر کے حالات ہیں۔"

"دو کشتیوں کا سوار تو کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔"

"ظاہر ہے۔" اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"میری بات مانو تو ایک مشورہ ہے اس بابا کے پاس تمہارے لیے۔"

"کون سے بابا کے پاس؟"

"اس ناچیز بندۂ حقیر پُرتقصیر کے پاس......" وہ سینے پر ہاتھ دھر کر سر جھکاتے ہوئے بولا۔

وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"اجازت ہو تو عرض کروں؟"

"ہوں......" اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم دونوں کورٹ میرج کیے لیتے ہیں۔ نہ تمہارے اماں، ابا کے راضی ہونے کا مسئلہ، نہ تمہاری تمہید باجی کے واویلا کی فکر...... بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا یار۔"

"نہیں...... نہیں مدثر......"

"کیوں؟"

"لوگ کیا کہیں گے۔"

"تو تمہیں لوگوں کی زیادہ فکر ہے میری پروا نہیں...... مجھے کھو دینا چاہتی ہو۔"

"ایسا مت کہو...... یو آر مائی لائف مدثر۔"

"یہ کیسی محبت ہے یار، ایک طرف مجھے اپنی زندگی کہتی ہو اور دوسری طرف رکاوٹوں سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں۔ سوہنی تو کچے گھڑے میں بیٹھ گئی تھی یار...... لیلیٰ نے محبت کے لیے اپنی جان دے دی۔ ہیر رانجھا کرتے آپ سے گئی تم کیسی ہیر ہو یار۔"

"اچھا! میں سوچوں گی۔"

ان دنوں تسنیم سوچ ہی رہی تھی۔ مدثر کو ابھی تک کوئی جواب نہیں دے پائی تھی وہ۔ گھر کے حالات وہی

تھے۔الم رسیدہ، دل گرفتہ، تسنیم ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی۔اپنے گھر کی زمین پر چلتے ہوئے بھی اسے یوں ڈر لگتا جیسے کوئی ڈکیت کسی گھر میں ڈکیتی کی نیت سے داخل ہونے پر ڈرتا ہے۔اسے بھی مدثر نے اپنے ماں باپ اور خاندان کی عزت پر شب خون مارنے کے لیے ہی تو اکسا رکھا تھا۔

☆☆☆

اسکول سے گھر واپسی پر کھانا کھاتے ہوئے حجاب کی نظریں رباب کی طرف اٹھیں تو اسے معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھا۔

''آج پھر کوئی اسائنمنٹ مکمل کرنے کا بہانہ کرکے چھٹی ماری گئی ہے...... ہے نا؟'' اس نے کہا۔

''میری خیر ہے جناب، آپ اپنی فکر کریں۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''کیوں! مجھے کیا ہوا جو میں اپنی فکر کروں۔'' اس نے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

''بتا دوں امی؟'' رباب چہکی۔

''اوں ہوں......'' امی نے آنکھیں دکھائیں اور رباب کو گھر کا۔''کھانا تو کھانے دو اسے۔''

''کیا ہوا؟'' حجاب نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''ارے تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ یہ تو پیٹ کی کچی ہے کوئی بات ذرا دیر ہضم کر ہی نہیں سکتی۔'' امی نے رباب کو گھورا۔

''امی بات ہضم ہو جائے تو پھر نکلے گی کیسے۔'' رباب نے شوخی سے کہا۔

''چپ کرو۔''

''کیا بات ہے امی؟''

''کھانا کھالو پھر بتاؤں گی۔''

''پہلے آپ بتائیں پھر کھانا کھاؤں گی۔'' امی نے رباب کو گھورا۔وہ اپنا کان دباتے ہوئے کھسیانی سی دکھائی دینے لگی۔

''رشتہ آیا ہے تمہارے لیے۔'' امی نے رباب کو گھورتے ہوئے حجاب کو بتایا۔

''اوہ! میں تو سمجھی تھی پتا نہیں کیا خاص بات ہوگئی۔'' اس نے دوبارہ پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''آپ کے خیال میں یہ کوئی خاص بات ہی نہیں۔'' رباب کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''قطعاً نہیں۔''

''تفصیلات سنیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔''

''چپ کرتی ہو یا جڑوں میں تمہارے منہ پر تفصیلات۔'' امی نے رباب کو گھورا۔

''سوری......سوری......سوری۔'' رباب نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔''رئیلی سوری ماما۔'' لاڈ میں آ کر وہ امی کو ماما کہنے لگتی تھی۔

''اللہ جب راستے بنانے پر آتا ہے یونہی اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔'' امی نے حجاب کے کھانے سے فارغ ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی تمہید باندھی۔''میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔نہ جان نہ

یہاں نہ کبھی دعا نہ سلام اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتوں کی طرح وہ لوگ دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ بیل بجی، میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا دروازے پر بیگمات نما دو عورتیں کھڑی تھیں اور گھر کے سامنے گلی میں سنہری رنگ کی چمچماتی ہوئی کار جس میں ایک جوان آدمی بیٹھا ہوا ہمارے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کون؟ ان میں سے ایک عورت بولی، آپ اندر آنے کی اجازت دیں تو بتائیں۔ میں اکیلی ہوتی تو شاید نہ آنے دیتی مگر شکر اللہ کا کہ رباب آج گھر میں ہی تھی۔ اندر آ کر بیٹھیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ دونوں عورتیں آپس میں بہنیں ہیں اور وہ جو گاڑی میں بیٹھا ہے ان کا بھائی ہے۔ اس نے کہیں تمہیں جوتے کی دکان پر دیکھا تھا۔ تمہارے لیے اس کا رشتہ لے کر آئی تھیں دونوں بہنیں۔'' حجاب نے ہڑبڑا کر امی کی طرف دیکھا۔

''کیا! جوتے کی دکان پر؟'' اسے یوں لگا جیسے اس نے غلط سنا تھا۔

''ہاں......'' حجاب کو یاد آیا۔ چند دن پہلے جب وہ امی کے لیے جوتا خریدنے کے بعد اسی دکان میں اپنے لیے ایک سینڈل دیکھ رہی تھی تو اس نے ایک شخص کو اپنے اوپر نظریں جمائے دیکھا تھا...... کیا وہی......!

''ایڈیٹ......'' اس نے کہا۔

''ہر امیر آدمی ایڈیٹ ہی ہوتا ہے۔'' رباب نے شوخی سے کہا۔

پھر بولیں تم۔''

''سوری۔'' رباب خفیف ہو کر اپنی گردن سہلانے لگی۔

''بہت امیر لوگ ہیں۔ ڈیفنس، کارساز اور کلفٹن میں رہنے والے...... جدی پشتی رئیس لوگ ہیں۔ چار بہنیں ہیں، تین بھائی جن میں سے ایک بہن، ایک بھائی مستقل طور پر امریکا میں رہتے ہیں۔ ایک بہن لندن میں رہتی ہے۔ ایک بھائی ناروے میں ہے اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ یہ دو بہنیں جو بھائی کے ساتھ آئی تھیں ان میں سے ایک یہاں کراچی میں ڈیفنس کے علاقے میں رہتی ہے، دوسری کلفٹن میں تین تلوار کے نزدیک۔ بھائی جس کا رشتہ لے کر آئی تھیں دبئی میں رہتا ہے۔ اس کا وہاں اپنا بزنس ہے گولڈ کا۔ اس کا یہاں بھی اپنا گھر ہے بہت بڑا کارساز میں۔ باقی جو بہن بھائی باہر ہیں ان سب نے بھی یہاں اپنے اپنے گھر بنا رکھے ہیں مہنگے علاقوں میں۔ بہنیں کہہ رہی تھیں سب کچھ ہے ہمارے بھائی کے پاس۔ والدین فوت ہو چکے سوائے اس ایک بھائی کے باقی تمام بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکیں۔ اس کے لیے لڑکی کی تلاش تھی خود اسے بھی اور ان دونوں بہنوں کو بھی جو یہاں ہوتی ہیں کیونکہ ان کے بقول جو بہن بھائی باہر نکل گئے ان کی تو اپنی اپنی دنیا ہے۔ ان دونوں بہنوں نے بھائی کو کئی لڑکیاں دکھائیں مگر اسے کوئی پسند آ کر ہی نہیں دی۔ اب اتفاق سے اس نے خود ہی تمہیں دیکھ لیا اور پسند بھی کر لیا۔'' امی یہ ساری تفصیلات بتا کر چپ ہو گئیں۔

''سوال یہ ہے کہ انہیں ہمارا گھر کیسے پتا چلا؟'' حجاب فکر انگیز لہجے میں بولی۔

''بہت اچھا سوال ہے۔'' رباب پھر چہکی۔

''تم زبان بند نہیں رکھو گی۔'' امی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''ماما جی کچھ تو خیال کریں...... اپریشیٹ کرنے دیں مجھے کہ باجی نے کتنا عقلمندانہ سوال کیا ہے، داد دیتی ہوں میں انہیں ان کے سوال پر۔''

''جہاں چاہ وہاں راہ۔'' امی نے حجاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
حجاب انہیں یوں دیکھنے لگی جیسے ان سے ان کی بات کی وضاحت چاہتی ہو۔
''جس دن اس نے تمہیں جوتوں کی دکان پر دیکھا تھا اسی دن وہ اپنی گاڑی میں تمہارا پیچھا کر کے ہمارا گھر دیکھ گیا تھا۔ بہنیں بتا رہی تھیں کہ پھر اس نے اس کے بعد بھی ایک دو بار یہاں ہمارے محلے میں آ کر اس بات کا یقین کیا کہ تم رہتی بھی اسی گھر میں ہو۔ عین ممکن ہے اس نے یہاں گھات لگائی ہو یا آس پاس کسی سے پوچھا... گھچا بھی ہو۔ رشتہ دینے والے پوچھ گچھ تو کرتے ہیں محلے سے۔''
''عجیب بدتمیز آدمی ہے...... لفنگا! پیچھا کر کے گھر تک پہنچ گیا۔'' حجاب غصے سے بولی۔
''امی نے کہا تو ہے جہاں چاہ وہاں راہ۔'' رباب نے پھر شوخی دکھائی۔ ''سنڈریلا کی تلاش میں شہزادے نے ایک سینڈل نمائش بلکہ آزمائش کے لیے رکھ دیا تھا کہ جس لڑکی کو یہ سینڈل پورا آجائے وہی اس کی دلہن بنے گی۔ یہ حضرت جوتوں کی دکان سے آپ کا پیچھا کرتے ہمارے گھر تک آ پہنچے۔''
''کوئی شریف آدمی تو ایسی حرکت نہیں کر سکتا...... میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں، ہاں اس دن جب میں امی کے لیے جوتا لے رہی تھی تو وہاں ایک آدمی مجھے مشکوک سا تو لگا تھا۔''
''یقیناً یہ وہی مشکوک آدمی ہوگا۔''
''مشکوک وشکوک کچھ نہیں، اچھا ڈیسنٹ آدمی ہے۔ اندر آ کر بیٹھا تھا وہ بھی۔'' امی بولیں۔
''ہیں، آپ نے اسے اندر بھی بلا لیا۔'' حجاب چونکی۔
''بہنوں کے ساتھ آیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا تو پھر بھی اگر میں اسے اندر نہ بلاتی تو بداخلاقی ہوتی۔ کھائے پیے رجے ہوئے لوگ ہیں۔ میں نے جو گھر میں حاضر تھا ناشتا پانی ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے صرف کولڈ ڈرنک لی باقی کسی چیز کو چھوا تک نہیں ورنہ تو رشتے لے کر آنے والوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی یوں صفائی مچاتے ہیں جیسے اللہ نہ کرے پلیٹیں تک چبا جائیں گے۔'' حجاب ہنس پڑی۔
''شکر ہے آپ کو ہنسی تو آئی۔'' رباب پھر چہکی۔
''لڑکے نے خود بات کی، کہہ رہا تھا جتنا چاہیں زیور چڑھوالیں اور لڑکی کے نام لکھوالیں، منڈی بہاؤالدین میں ان کی آبائی زمینیں ہیں۔ لڑکے کے حصے میں کئی مربعے زمین ہے۔ وہ کہتا ہے دو مربعے لڑکی کے نام کر دوں گا۔ شادی کے بعد اسے یہاں کراچی میں اس کے نام پر علیحدہ گھر بھی خرید کر دوں گا۔ مہر دس پندرہ لاکھ باندھنا ان کے لیے بہت معمولی بات ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کی مرضی ہوگی جب چاہے دبئی میں رہے جب چاہے کراچی میں رہے۔ گاڑی بھی ایسی شاندار تھی کہ سامنے والی اور ان کے بچے اپنی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ ارے بھئی امارت تو خود اپنے منہ سے بولتی ہے۔''
''سوری امی...... آپ مادّہ پرست کب سے ہوگئیں۔'' حجاب نے کہا۔
''مادّہ پرستی کی بات نہیں۔''
''تو پھر؟''

''پیسا بہت بڑی قوت ہے بیٹا، اس پیسے کی خاطر ہی تو تمہارے بابا ساری زندگی پردیس رہے۔ اب میں تنہا ہوتی ہوں تو انگلیوں پر حساب لگاتی ہوں کہ برسوں کی رفاقت میں انہوں نے کتنے دن ہمارے ساتھ گزارے۔ ہنستے ہوئے گھر آتے تھے، روتے ہوئے واپس لوٹتے تھے۔ پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے بیٹا، پیسے کے زور پر غیر اپنے بن جاتے ہیں۔ عزت اور توقیر میں اضافہ ہوتا ہے......'' امی نے توقف کیا پھر بولیں۔ ''کون ماں یہ نہیں چاہتی کہ اس کی اولاد کو اس سے بہتر حالات اور بہتر وقت ملے۔ میں بھی تمہیں راج کرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ غیب سے اچھا رشتہ گھر آیا ہے تو کیوں خوش نہ ہوں۔''
''کہتے ہیں پیسا، پیسے کو کھینچتا ہے۔ اپنے ہی جیسے کسی امیر گھر میں رشتہ کیوں نہیں دیکھا ان لوگوں نے۔'' حجاب نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔
''بتا تو رہی ہوں کہ لڑکے کی بہنیں کہہ رہی تھیں کئی لڑکیاں دیکھیں مگر بھائی کو پسند ہی کوئی نہیں آئی۔ اس کی صرف ایک ہی ڈیمانڈ تھی کہ لڑکی بہت خوب صورت ہو۔ تمہیں دیکھا تو تم پسند آگئیں اسے۔''
''بیڈ لک......'' حجاب نے زیرِ لب کہا۔
''گڈ لک کہیے، گڈ لک۔'' رباب مسکرائی۔
''آنے دو ذرا اپنا وقت پھر پوچھوں گی تم سے۔'' حجاب نے اسے پیار سے گھورا۔
''اجی ہم تو تیار بیٹھے ہیں۔''
''بے شرم۔'' امی نے رباب کو پھر آنکھیں دکھائیں۔
''یار ہم لڑکیوں کی بھی عجیب مشکل ہے۔ ماں باپ کا بوجھ بنے رہیں تو مشکل، ان کا بوجھ ہلکا ہونے میں خوشی کا اظہار کریں تو بے شرم کا خطاب! یا اللہ کیوں لڑکی بنا دیا مجھے۔'' رباب جھوٹ موٹ منہ بسورتے ہوئے حجاب کے رخ پر دیکھنے لگی۔
''بہنیں کہہ رہی تھیں جو لڑکی ہمارے بھائی کے گھر آئے گی عیش کرے گی۔'' امی نے مزید کہا۔
وہ چپ رہی۔ امی نے کون سا کوئی سوال کیا تھا اس سے جو جواب دینا ضروری ہوتا۔
''مجھے تو لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ انوائیٹ کر کے گئے ہیں کہ آپ ہمارا گھر وغیرہ آ کر دیکھ لیں۔'' امی کے لہجے میں گونہ اطمینان تھا۔
''کب جائیں گی ان کے ہاں؟'' رباب نے بے تابی سے پوچھا۔
''نایاب اور بہجت کو بتاؤں گی...... جب انہوں نے کہا۔'' حجاب کی رگِ احتیاط پھڑکی۔
''پہلے آپ ان لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ تو کروا لیتیں۔'' اس نے کہا۔
''کیسی پوچھ گچھ؟'' امی نے اسے ابرو چڑھا کر دیکھا۔
''جیسی آپ بتا رہی تھیں وہ یہاں ہمارے محلے سے کر کے گیا ہے۔''
''ارے بھئی میں نے تو اندازاً کہی ہے یہ بات، بہنوں کے بقول اس نے یہ اطمینان کیا کہ تم اسی گھر میں رہتی ہو۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد ہی وہ بہنوں کو یہاں لے کر آیا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس نے کچھ اور نہیں پوچھا ہوگا، ہو سکتا ہے یہ معلوم کیا ہو کہ یہ کون لوگ ہیں، کیسے ہیں، محلے میں ان کی شہرت کیا ہے۔''

"کیا ہمارا یہ حق نہیں بنتا کہ ہم بھی ان کے بارے میں یہ سب کچھ معلوم کریں۔" حجاب نے دبی زبان سے کہا۔

"دیکھو۔" امی کا لہجہ نہایت رسان تھا۔ "اللہ کو آدمی نے آنکھ سے نہیں دیکھا مگر عقل سے پہچانا ہے۔ بہت سی باتیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں...بغیر کسی پوچھا پاچھی کے شریف اور معزز لوگ ہیں۔ وہ تو ہماری لاعلمی میں ہمارے محلے سے ہوگئے اب اگر ہم پوچھ گچھ کریں گے تو ان کے علم میں لازماً آئے گی یہ بات۔ پھر وہ بھی چھان بین میں پڑ سکتے ہیں اور ہمارے اپنے لوگوں کا تو تمہیں پتا ہے نا کیسی کاٹ کرنے والی فطرت کے لوگ ہیں۔ کسی کو سن گن بھی مل گئی کہ حجاب کے لیے اتنا اعلیٰ رشتہ آیا ہے تو جڑیں کاٹنے میں لگ جائیں گے۔ تم میری اولاد ہو تم سے کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں۔ میں کیا ہوں میرا کردار کیسا ہے اور تم لوگوں کی تربیت میں نے کیسی کی ہے یہ تم لوگوں سے بہتر اور کون جانتا ہے مگر ان اپنوں نے میرے سر پر تمام وقت ایک مرد کی چھایا نہ ہونے کی وجہ سے میری کیسے کیسے کردار کشی نہیں کی۔ میری تعلیم، ملازمت اور تم بھائی بہنوں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں میری تمام تگ ودو کو سراہنے کے بجائے مجھ پر الزام تراشیاں کیں۔ یہ سب کچھ اگر بی بی جان اور ان کے بچوں کی طرف سے کیا گیا ہوتا تو میں اسے سوتاپے کی جلن کہتی مگر افسوس کہ یہ سب کچھ انہوں نے کیا جو میرے اپنے تھے...... صرف اپنی جہالت اور کم نظری کے باعث! وہ تو تم لوگوں پر بھی چھینٹے اڑانے لگے تھے مگر میں ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے کہا میرے بارے میں تم لوگوں نے جو بکواس کرلی سو کرلی میری بچیوں کے بارے میں اگر ایک لفظ بھی کہا تو ایک ایک کی زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔ خدانخواستہ نئے لوگوں کے کانوں تک کسی نے ایسی ویسی بات پہنچادی تو وہ تو سچ ہی سمجھیں گے نا۔ ہمارے پاس کون سا کوئی سرٹیفکیٹ ہے پارسائی کا۔" تمام زندگی حالات وحوادث کے سامنے شیرنی کی طرح ڈٹی رہنے والی امی کے لہجے سے حجاب کو شکستگی اور درماندگی کی تپش محسوس ہوئی۔

"لوگوں کو بالآخر سب کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔ سچ اور جھوٹ کو پہچان لیتے ہیں لوگ۔" اس نے امی کی دلجوئی کو کہا۔

"بالآخر!" امی نے انتہائی کرب سے اس کا یہ لفظ دہرایا پھر دلدوز لہجے میں بولیں۔ "مگر اس وقت تک بہت نقصان ہو چکا ہوتا ہے۔ دل میں لگنے والے گھاؤ ناسور بن چکتے ہیں...... سمجھ میں نہیں آتا لوگ عورت کی عزت کی حرمت کا پاس کیوں نہیں رکھتے۔ جو جی میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں جانتے کہ کسی باعفت، باعصمت عورت کے بارے میں ان کی زبانوں کا زہر کیسے گھاؤ ڈالتا ہے۔ میں اپنی زندگی کی ساری مشقت، بھاگ دوڑ، تمام دکھ بھول گئی لیکن اپنوں کے لگائے ہوئے یہ گھاؤ ابھی تک ہرے ہیں۔"

حجاب اپنی جگہ سے اٹھ کر امی کے نزدیک جا کھڑی ہوئی اور نہایت محبت سے ان کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے بولی۔ "آپ لوگوں کی پروا کیوں کرتی ہیں۔ ہم تو جانتے ہیں نا کہ ہماری ماں کیا ہے...... وی لو یو...... وی لو یو مدر۔" رباب بھی حجاب کے نزدیک آکھڑی ہوئی اور اس نے امی کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ماما، ہم سب آپ سے پیار کرتے ہیں۔ آپ کو پوجتے ہیں ماما...... وی آل لو یو ماما۔" امی نے اپنے کپکپاتے ہونٹوں سے پہلے رباب کے بازو کو چوما پھر اپنے ہونٹ حجاب کے بازو سے مَس کردیے۔

☆☆☆

"آج خالہ آئی تھیں تمہاری......" امی نے اس کے نزدیک آکر اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظریں روزانہ کی طرح ہائی وے پر خوش رنگ تیتریوں کی طرح لپکتی دمکتی گاڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

"میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔" امی کو جیسے اپنی بات کی نظرانداز گی پر ملال ہوا تھا۔

وہ پلٹا اور اس نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سن لیا ہے۔"

امی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا اور دلسوز لہجے میں بولیں۔ "میرے لال! روزانہ دفتر سے آکر تم گھنٹوں اس سڑک کو تکتے رہتے ہو۔ ارے بیٹا گھر بساؤ تا کہ میرا بھی کچھ دل بہلے۔ تم چلے جاتے ہو تو باؤلوں کی طرح گھومتی پھرتی ہوں، کبھی ایک کمرے میں کبھی دوسرے کمرے میں۔"

وہ پھر چپ رہا۔

"ارے بیٹا اب گھر بسانے میں آخر قباحت کیا ہے۔ ماشاءاللہ برسرروزگار ہو۔ چھوٹا ہی سا سہی اپنا گھر ہے۔ سواری کے لیے اسکوٹر ہے۔ شام کو دونوں گھومنے پھرنے جایا کرنا۔"

"اسکوٹر پر......؟" وہ تحقیر سے مسکرایا۔

"ہاں اور کیا۔"

"اسکوٹر میری منزل نہیں ہے امی جی۔"

"کیا مطلب......"

"مجھے گاڑی چاہیے...... نئے ماڈل کی۔"

"اللہ دے گا۔" امی نے اس کا دل رکھنے کی کوشش کی پھر ٹیپ کا مصرع دہرایا۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی آج آپا بدرالنساء آئی تھیں۔"

"بہت چکر لگانے لگی ہیں آپ کی بہن، ہم غریبوں کے غریب خانے کے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"کھل کر تو نہیں کہا مگر میں سمجھتی ہوں...... ان کا ارادہ تمہیں اپنی بیٹی دینے کا ہے۔ اُدھر تمہارے بڑے ماموں بھی دبی زبان سے کہہ چکے ہیں مجھ سے کہ عبادالرحمٰن کے لیے رشتہ دیکھو تو کہیں باہر جانے کے بجائے اپنوں ہی میں دیکھنا۔ تمہارے چچا نے تو خیر تم سے اپنی گڑیا کے لیے براہِ راست ہی بات کرلی۔"

"سب اپنی اپنی بیٹیاں سنبھال کر رکھیں...... مجھے ان میں سے کسی کو گھاس نہیں ڈالنی۔"

"کیوں بیٹا؟" امی نے چونک کر کہا۔ "کیا برائی ہے...... اپنے ہیں۔"

"اپنے......" وہ بلبلا کر بولا۔ اس کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ "جب ہمیں ان کی ضرورت تھی تو کہاں مر گئے تھے یہ اپنے۔"

"بری بات بیٹا...... اپنے ہیں۔"

"اپنے......" اس نے پھر تلخی سے دہرایا اور زہرخند لہجے میں بولا۔ "بھول سکتا ہوں میں وہ اداس شامیں جب ہمارے گھر میں آٹے کا کنستر بھی خالی ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے پوچھتیں بھوک لگی ہے اور میں باوجود شدید بھوک کے آپ سے کہہ دیتا نہیں...... کیسے بھلا سکتا ہوں میں ان سیاہ راتوں کو جب میری آنکھ نیند میں کھلتی تو

آپ سونے کے بجائے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ آپ کو ڈر لگتا تھا نا اس لیے...... میری جب آنکھ کھلتی میں آپ کو جاگتے ہی پاتا۔ اس وقت کہاں چلے گئے تھے یہ سارے اپنے! کس کھوہ میں جا چھپے تھے یہ سب۔ اب کیوں چکر لگانے لگے ہیں، اب کیوں انہیں ہر دوسرے دن ہماری خیر خبر لینے کا خیال آنے لگا ہے۔" وہ لحظہ بہ لحظہ جذباتی ہوتا چلا گیا۔

"ان کا کیا ان کے ساتھ۔" امی نے کہا۔ "اب آتے ہیں تو نظریں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔"

"آجاتے ہیں تو میں تکلفاً مل لیتا ہوں ورنہ ان میں سے کسی کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا میں۔ مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے چاہے وہ آپ کی طرف کے لوگ ہوں یا ابو کے خاندان کے...... سب خود غرض۔"

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا، حقیقتاً ایسا ہی تھا۔ باپ کی موت کے بعد جب وہ اور اس کی ماں بے آسرا رہ گئے تھے تو اس کی ننھیال اور ددھیال میں سے کسی نے پلٹ کر نوجوان بیوہ اور اس کے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ دھرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب ان دونوں کی ضرورتوں سے یوں انجان بن گئے تھے جیسے ان کے لیے آسمان سے من و سلویٰ اتر رہا تھا۔ بجا کہ ان سب کی اپنی اپنی مجبوریاں اور اپنے اپنے مسائل تھے مگر زندگی فقط اپنے لیے ہی سوچنے کا نام تو نہیں، زندگی تو آزماتی ہے کہ آپ کسی کے برے وقت میں کتنا اس کے کام آتے ہیں...... عبادالرحمٰن کے حسابوں اس کے تمام ننھیالی اور ددھیالی رشتے دار اس آزمائش میں ناکام قرار پائے تھے۔ ان ماں بیٹے کے برے وقت میں ان کے کام آنے کے بجائے وہ سب کبوتر کی طرح آنکھوں پر غلاف ڈال کر بیٹھ گئے تھے اور اب برسوں بعد ان غلافوں کو الٹ کر انہیں پھر سے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود غرض کہیں کے۔

"آپ کھل کر ان سب کو بتا دیں میں خاندان میں شادی نہیں کروں گا۔" اس نے امی سے کہا۔

"کیا خاندان سے باہر کہیں مرضی ہے تمہاری؟" امی نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں...... کل کی کہہ نہیں سکتا۔ بہر حال مجھے خاندان میں کسی قیمت پر شادی نہیں کرنی ہے۔ اپنوں سے کہہ دیں ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں۔"

"کہنے کی کیا ضرورت...... جب باہر رشتہ کرو گے تو آپ ہی سب کو پتا چل جائے گا۔ میں تم پر اپنوں کے لیے دباؤ نہیں ڈالوں گی۔ گزارہ تم نے کرنا ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ زیتون ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی رشتہ لے کر آجاتی ہے۔ لڑکیوں کا کوئی کال تھوڑی ہے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی۔ میں تو اب تک یہی سوچ کر چپ تھی کہ گھر میں ہی کسی بچی سے تمہارا رشتہ ہو جائے گا۔ آج پہلی بار تم نے منہ کھول کر کہا ہے خاندان سے باہر۔ انشاءاللہ تم دیکھنا کیسی اچھی لڑکی ڈھونڈتی ہوں میں تمہارے لیے۔"

عباد اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اپنے فلیٹ کی بالکونی سے باہر نیچے سڑک کے رخ دیکھ رہا تھا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ رات کی تیرگی میں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس، بیک لائٹس اور چوراہے پر باری باری جلتی بجھتی سبز، سرخ اور نارنجی بتیوں نے سڑک پر ایک سحر بپا کر رکھا تھا۔

☆☆☆

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

سفرِ نو

رفاقت جاوید



دانیال اور عروج کی دوستی کی بنیاد موبائل کی رانگ کال سے ہوئی تھی۔ دونوں کے خاندان، شہر اور یونیورسٹی میں فاصلہ ہونے کے باوجود ان دیکھے ہی یہ رشتہ ایسا مستحکم ہوا کہ نوبت شادی تک آ پہنچی۔ دونوں طرف مخالفت انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ موبائل کی اس دنیا میں اس طریقے سے طے ہونے والے رشتے بھلا کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ نہ جان نہ پہچان فقط آواز کے بل بوتے پر والدین کیسے آمادہ ہو سکتے

تھے۔ دونوں کے درمیان کیے گئے عہد و پیمان انہیں بتدریج رنجور کیے جا رہے تھے۔ آخر دانیال کے والد صاحب نے یہ کہہ کر بیٹے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ اگر خاندانی رکھ رکھاؤ، رہن سہن اور رسم و رواج میں ہم سے فرق ہوا تو یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ دانیال بھی اس بات پر رضامند ہو گیا اور کچھ کرنے کے اختیارات بھی تو نہ تھے۔ طوعاً و کرہاً اسی پر اکتفا کر گیا۔

علی الصباح انہوں نے لاہور سے سیالکوٹ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ دونوں مارے خوشی و فکر کے رات بھر نہ سوئے۔ موبائل پر کتنے ہی کریڈٹ کارڈز قربان ہو گئے۔ ایک دوسرے کو تسلی و تشفی دیتے رات گزر گئی۔ دانیال والدین اور بہنوں کے ساتھ ہولیا۔ عروج ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اسے بار بار ایک ہی روح فرسا دھمکی دی جا رہی تھی کہ اگر ان کا تعلق اچھی فیملی سے نہ ہوا تو ہم ہرگز یہ رشتہ منظور نہیں کریں گے۔ عروج بہت خوب جانتی تھی کہ وہ بہت بڑے بزنس مین کی اولاد ہے۔ لاہور کے پوش علاقے میں چار کنال پر ماڈرن طرزِ تعمیر بنگلا بھی ہے۔ یہ تمام انفارمیشن اسے دانیال کی زبانی حاصل ہوئی تھی۔ وہ چپ سادھے آنے والے وقت کے انتظار میں کبھی ماں کی لعن طعن تو کبھی بڑی بہن کی طنز و حسد سے بھرپور باتوں کو درگزر کیے جا رہی تھی کیونکہ تربیت کے مطابق اس سے ایسی توقع رکھنا ہی گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے دونوں بھائی بھی اپنی وضع قطع سے خاصے جنونی اور جلالی لگ رہے تھے۔ فقط بٹ صاحب پدرانہ سرپرستی کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے دلجوئی اور خاطر داری کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ مہمان نوازی ان کا شیوہ تھا۔ اس لیے ان کے اصرار پر کشمیری اسپیشل ڈشیں پکائی جا رہی تھیں جن میں ان کی بیگم خالدہ کو ایسی مہارت حاصل تھی کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔

ڈرائیور کو گھر ڈھونڈنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اندرونِ شہر کی تنگ گلیوں میں لال رنگ کا چوبارہ بٹ صاحب کا تھا۔ والدین نے دانیال کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا کہ یہ جگہ ان کے شایانِ شان کیسے ہو سکتی ہے۔ ڈیوڑھی سے اندر داخل ہوتے ہی دانیال اور میاں صاحب کو بیٹھک کی طرف لے جایا گیا۔ بہنوں اور ماما کو اندرون خانے پہنچا دیا گیا جہاں وہ جہاندیدہ نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے نفرت و حقارت اور رعونیت کی چھاپ کو چہرے سے پنہاں نہ کر سکیں۔ دفعتاً عروج سامنے سے نمودار ہوئی۔ ایک ثانیے کو سب اچنبھے میں چلی گئیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب پوری آب و تاب سے آنگن میں چمک رہا تھا۔ اس کی موجودگی کے فسوں میں وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھیں۔ خالدہ بٹ محلے کی زندگی کے نشیب فراز میں اپنی زندگی گزار رہی تھیں۔ اپنے مہمانوں کے تاثرات دیکھ کر قدرے تفاخر سے بولیں۔

"آپا جان، عروج نے اپنی یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے، اسے یونیورسٹی میں ہی نوکری مل گئی ہے۔ حیران ہوں بٹ صاحب نے فیصلہ اسی پر چھوڑ دیا ہے حالانکہ ہمارے خاندان کی تمام پڑھی لکھی لڑکیاں چار دیواری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔"

"بعض اوقات بچوں کے فیصلے مناسب اور موزوں نہیں ہوتے۔ تجربہ کار اور جہاندیدہ تو ہم ہیں نا۔" وہ نخوت سے ذومعنی الفاظ میں بولیں۔ ناگواری چہرے پر در آئی جسے عروج سمیت خالدہ بھی سمجھ گئیں مگر نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔

"آپ کو گھر ڈھونڈنے میں خاصی دشواری پیش آئی ہوگی، دراصل یہ گھر ہماری پشتوں کی باد دہانی کے لیے آباد ہے۔ ہر بار ہر نسل میں اس گھر کو چھوڑنے کے منصوبے بنائے گئے ہیں مگر ہمیشہ ہی ناکامی رہی۔ اس شہر کے ہر پوش ایریا میں بٹ صاحب نے کوٹھیاں خرید کر کرائے پر دے رکھی ہیں مگر ہمیں وہاں شفٹ ہونے کی اجازت نہیں۔ اپنے رسم و رواج اور تہذیب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اسی لیے انہوں نے یہاں کی تنگ گلیوں میں پانی کے نکاس کا بہترین انتظام کر دیا ہے۔ ہماری گلی میں کہیں بھی آپ کو غلاظت نظر نہیں آئے گی۔"

"بہت خوب......" وہ قدرے سیریس نظر آنے لگیں۔ جسے میزبان خاتون نے بھی محسوس کیا۔ خالدہ پھر گویا ہوئیں۔

"بٹ صاحب نے صدیوں سے اپنے آباؤ اجداد کے پیشے کو خیرباد کہنے کا کبھی تصور ہی نہیں کیا بلکہ جب میرے سسر حیات تھے تو ہم صرف ایک چمڑے کے کارخانے کے مالک تھے۔ اب چمڑے کے گارمنٹس کی فیکٹریاں ہیں، امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ خدا کی بہت نوازش ہے۔" ان کے تیور دیکھتے ہی انہوں نے اپنی حیثیت ان کے گوش گزار کر دی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور لہجہ شہد جیسی مٹھاس سے لبریز ہو گیا۔

ڈائننگ روم میں مردوں کے لیے لنچ کا انتظام کیا گیا اور خواتین نے برآمدے میں دسترخوان بچھا کر بہترین کشمیری لنچ کیا۔ جس کی ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے گئے۔

گھر کی جانب روانگی کے دوران پہلے تو کافی سکوت کا عالم طاری رہا۔ پھر ارتکاز ٹوٹا اور وہ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ آج انہوں نے ایک ایسا سبق سیکھا تھا جو زندگی بھر فراموش نہ ہوگا۔ انہوں نے ان کے رہن سہن کی ظاہرانہ حالت دیکھ کر جس کٹھور پن اور تحقیر آمیز رویّے کا اظہار کیا تھا یہ سوچ کر ہی دانیال کی ماما کے وجود میں ایسی پھریری دوڑی کہ چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے تناؤ سے بولیں۔

"یہ لوگ مال و دولت کے لحاظ سے ہمارے بھی باپ نکلے۔ میرا تجزیہ کس قدر غلط رہا۔" تب پاپا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس وضع قطع کے بااصول لوگ آج کے اس دور میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ ان لوگوں نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔"

"انہوں نے ہمیں انکار کیا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میاں دانیال اسے حاصل کر کے نہ چھوڑے۔ میں بھی ضد کا ایسا پکا ہوں کہ اسے اس کے خاندان سے جب تک چھین نہیں لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" وہ دانت پیستے ہوئے سوچنے لگا۔

☆☆☆......☆☆☆

"میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لیے جو پاپڑ بیلے ہیں۔ تمہیں اس کا بخوبی اندازہ ہے۔ جیسے تمہارے خاندان کے کچھ فرسودہ اور بے تکے اصول ہیں۔ جن پر کاربند رہنے پر تم لوگوں کو بے پناہ فخر ہے، بیگم! اسی طرح میرا خاندان بھی عمرانیات کی بنیاد کو مدنظر رکھتے ہوئے تشکیل شدہ قانون پر چلتا آیا ہے۔ آج تک اس قانون کو بدلنے کی کسی بیوی کی مجال نہیں ہوئی۔ برات دیکھ کر تمہارے خاندان کی عقل تو ٹھکانے آ گئی ہوگی۔ پردے کے اندر چھپی ہوئی منافقت سے ہم پاک صاف ہیں۔ ماڈرن دنیا کے دم قدم چلنا ہمارا شیوہ رہا ہے۔" وہ اپنی شیروانی ہینگر پر ڈالتے ہوئے روکھائی مگر آہستگی سے بول رہا تھا۔ عروج نے ناقدانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس نے اسے سب سے چھپ کر جھروکے سے دیکھا تھا۔ کس قدر جوان رعنا اور سراپا احترام و تحسین لگ رہا تھا۔ موبائل پر ابھرنے والی پُرتسکین اور طمانیت سے لبریز آواز کے مانند۔

آج دوسری مرتبہ دیدار ہوا تھا جبکہ وہ عروج کی آواز اور باتوں کا شیدائی ہونے کے ساتھ اس کی تصویر پر بھی فدا ہو گیا تھا۔ آج کی گفتگو، تیور اور ارادے ذہنی خلفشار اور ردوکد کی غمازی کر رہے تھے یعنی پیار و عشق کے نشے پر حقیقی اور روایتی شوہر کا روپ طاری ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑی خفیف ہو کر کسمسائی، اس کی اضافی جذباتی کیفیت فی الفور کافور ہو گئی۔

''شادی تک کی تمام شرائط اور رسم و رواج تمہارے خاندانی ڈیمانڈز کے مطابق ہم نے نبھائی ہیں۔ اب تاحیات ہمارے خاندانی ڈھانچے میں تمہیں ایڈجسٹ ہونا پڑے گا۔ مانا کہ ہمارے خاندان تضادات کا مجموعہ ہیں مگر ایک معاملے میں ہم ایک جیسے ہیں کہ بیوی کو انتہائی سرعت کے ساتھ خود کو بدلنا پڑتا ہے...... ایکسپینس میں ہی مصلحت سمجھو۔'' اس کا رویہ اور انداز گفتگو اسے تاؤ دلانے والا تھا مگر وہ شگفتہ سی مسکان لبوں پر بکھیر کر بولی۔

''اعزاز و اکرام کا شکریہ۔''

''گڈ موو......'' وہ طنزیہ گویا ہوا...... ''اپنے اس انداز پر قائم و دائم رہنا مت بھولنا۔''

''جی ......'' وہ بت بنی اپنی ہی جگہ اِستادہ ہو گئی۔ ماحول ایک دم ہولناک سا ہو گیا۔ وہ اسے انگوٹھی پہنانے آگے بڑھا تو عروج کا...اضطرابی کیفیت میں لرزیدہ ہاتھ برف کے مانند سرد تھا۔ دانیال نے شانِ بے نیازی سے اس کے احساسات و جذبات کی پروا کیے بغیر اس کی انگشت میں ڈائمنڈ کی قیمتی انگوٹھی پہنا کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ آخری رسم بھی پوری ہو جانی چاہیے۔ شادی مبارک ہو۔'' ویل ایجوکیٹڈ خاندان کے براڈ مائنڈڈ شوہر کی حرکتیں اسے اپنے خاندان کے کم تعلیم یافتہ مردوں سے مشابہت میں کہیں سے کم نہ لگیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی دانیال ہے جو پچھلے ایک سال سے اس پر فریفتہ تھا۔ اس کی ہر بات کو تہِ دل سے سراہا کرتا تھا۔ اسے پا لینے کی خواہش میں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر فتح مندی حاصل کر لی تھی۔ شاید یہ اس کی طویل ریاضت کاری ایکشن تھا کہ آج رات کی تنہائی میں عروج کی قربت میں بہک جانے کی فزوں تر خواہش نہ جانے کہاں مدفون ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر سفر کی تھکان کے آثار ابھر آئے تھے۔ عروج نے عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے کیف آگیں لہجے میں خاموشی کو توڑا۔ وہ خالصتاً خدائی فیصلے پر سرِ تسلیم خم کیے شوہر کی ہر خواہش کے مطابق ڈھلنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ بے تاب ہو گئی... کیونکہ وہ اس کے پیار میں اپنی آن اور نسوانی وقار تیاگ سکتی تھی۔ ایک مشرقی بیوی کی طرح۔

☆☆☆......☆☆☆

آج شب ولیمہ تھا۔ صبح دس بجے سے وہ نندوں کے ہمراہ بیوٹی پارلر میک اوور کے لیے پہنچا دی گئی تھی۔ جب میل بیوٹیشن نے اس کے سر سے حجاب اتار کر اس کے گیلے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ساتھ ہی حیرت و اشتیاق میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

''ہاؤ نائس...... اتنے لمبے اور بھاری بال زندگی میں فرسٹ ٹائم دیکھنے کا موقع ملا ہے۔'' وہ جھینپ سی گئی، جلدی سے دوپٹے کی جانب ہاتھ بڑھ گیا جسے نند نے پکڑ لیا۔

''بھابی ہمارے بھیا کو لمبے بال قطعی پسند نہیں۔''

''تو کیا میرے بال......''

''آج کٹ جائیں گے۔'' نند نے اس کی بات ہنستے ہوئے مکمل کر دی۔

''میڈم بالوں کی چٹیا بنائے دیتا ہوں، پھر اسے کاٹ کر آپ کو بخش سکتا ہوں، اسے محفوظ کر لیجیے گا۔ جب کبھی ان کی یاد ستائے تو نکال کر دیکھ لیا کیجیے گا۔'' ہیئر ڈریسر نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''کتنے سالوں کی محنت رائگاں جا رہی ہے، کوئی بات نہیں گھر کی کھیتی ہے بڑھ جائے گی جب آپ چاہیں گی۔''

وہ خاموش بیٹھی اپنی قسمت پر ماتم کرنے لگی۔ سیاہ کالے بالوں کی چٹیا جو گھٹنوں اور ٹخنوں کے درمیان سانپ کے مانند بل کھاتی جھولا کرتی تھی، اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ حجاب پارلر کی صفائی کرنے والی ماسی کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ساکت و جامد دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسی عالم میں شام ہو گئی۔ وہ تیار ہو کر پرستان کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ ولیمے کا ڈریس ٹی پنک کلر کا تھا۔ فیشن ڈیزائنر نے کیا کاٹ چھانٹ کر تیار کیا تھا۔ سلیولیس شرٹ میں اس کے گورے سڈول بازو اور کھلے کشادہ گلے سے جھانکتا ہوا حسن و جمال جسے غیر اختیاری طور پر بار بار چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ بالوں کا خوب صورت اسٹائل جسے دوپٹے سے آزاد رکھنے میں بہتر سمجھا گیا تھا۔ اس تجرید کو وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ بلا مروت اور سسرال کے احکامات کی بروقت تعمیل اس کی تربیت کا حصہ جو تھی۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں روبوٹ بنی بے آب و گیا وادیوں میں بھٹک رہی تھی۔ دانیال فوٹو شوٹ کے لیے جب اسٹوڈیو پہنچا تو حسن کی اس دیوی کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ کل سے یکسر مختلف لگ رہی تھی۔ لال جوڑے میں لپٹی لپٹائی اپنی تمام تر معصومیت اور بے پناہ نکھار کے ساتھ وہ اسے بھلی نہیں لگی تھی مگر آج وہ اپنا تن من دھن اس پر نچھاور کرنے کو تلا ہوا تھا۔ جب وہ ہال میں پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ اس بھری محفل میں وہ کس قدر ناتواں اور بے زباں ہے۔ نہ خود کو ڈھکنے کی ہمت رکھتی ہے نہ احتجاج کرنے کی جرأت۔ قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

ولیمے میں شرکت کرنے والے میکے کے افراد بھی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ بیٹی کی سسرال نے ان کی شرافت، سادگی، عاجزی و انکساری پر ایسا طمانچہ رسید کیا تھا کہ وہ حمیت و غیرت میں سر نہ اٹھا سکے۔ بہ مشکل کھانا زہر مار کیا اور بیٹی سے ملے بغیر سیالکوٹ مراجعت کر گئے۔ جبکہ دانیال اسٹیج پر اپنے دوستوں کا اس سے نہایت اپنائیت سے تعارف کراتے ہوئے مردانگی کا مکمل شاہکار لگ رہا تھا۔ طمانیت اور مسرت کے ساتھ چہرے پر کبر و پندار کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ آج اس کی باتوں اور حرکتوں میں محبت کی تپش اور چاہ کی چاشنی کی آمیزش کو محسوس کرتے ہوئے وہ راضی بہ رضا کے رستے پر گامزن ہونے کی خود کو تلقین کر رہی تھی۔ یہی اس کا نصیب تھا۔ اس حقیقت اور سچائی کو جتنی جلدی قبول کر لے گی مستقبل درخشاں ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ نندیں واری صدقے جا رہی تھیں۔ جٹھانیاں بغض و عناد اور رشک و حسد کی آگ میں کوئلہ ہو رہی تھیں۔ ساس اپنے دوست واحباب اور حاسد اور مین میخ نکالنے والے شریک رشتے داروں کے سامنے اس کے خاندان کی بڑھ چڑھ کر مدح سرائی کر رہی تھیں۔ اعصاب مشتعل کے ساتھ عروج حلقہ بگوشی کو سینے سے لگائے حلم و بردباری کا اظہار کرتی فنکشن کے اختتام پر دانیال کے ہمراہ گھر آ گئی۔ پذیرائی اور دعاؤں کے اس ماحول میں دل سے بے ساختہ آواز نکلی۔ جس میں شورش، بغاوت اور نافرمانی در آئی تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ ردِعمل پر غالب آ چکی تھی۔ ماں کی آواز اس کے کانوں میں

گونج رہی تھی۔ ہمارے خاندان کی بیٹیاں اپنی سسرال سہاگ کا لال جوڑا پہن کر داخل ہوتی ہیں اور کفن پہن کر باہر نکلتی ہیں۔ ہمارے نام و نمود کی لاج رکھنا۔ اس نے اس چیلنج کو ہنس کر قبول کرلیا۔

☆☆☆......☆☆☆

”ہماری شادی کو چھ ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ وقت کیسے پر لگا کر اڑ گیا۔“ دانیال نے اسے بانہوں میں بھر کر کہا۔ ”یہ تمہاری قربت کا فسوں ہے یا کچھ اور...... بھئی میں تو بہت خوش ہوں تمہارے ساتھ، مجھے تمہارے اس ردِعمل کی رتی بھر توقع نہیں تھی۔“

”میں آپ کے ارادوں کو سمجھ گئی تھی کہ آپ میرے رنگ کو بے نشاں کرنے کے لیے اس وقت تک رنگ کاٹ سوڈے کا استعمال کریں گے جب تک وہ نیوٹرل نہ ہوجائے اور پھر بھٹی میں اس وقت تک پکائیں گے جب تک آپ کا رنگ اس پر چڑھ نہ جائے گا۔ سوچا دانشمندی اسی میں ہے کہ یہ طوقِ غلامی ہنستے مسکراتے گلے میں کیوں نہ ڈال لیا جائے۔ آخر مجھے آپ سے بے پناہ محبت جو ہے۔ اس عشق و پیار کی خاطر ہیر، لیلیٰ، سوہنی نے بھی تو قربانیاں دی تھیں ناں......“ وہ شگفتہ لہجے میں اسے خودغرض ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ ”میں نے تو آپ کے سپرد کردی ہیں، اپنی تمنائیں، چاہتیں اور تنہائیوں میں ابھرنے والے گیت اور یادیں اور اپنی زندگی کے تمام رنگ اور مسکراہٹیں۔ جو بھی فیصلہ آپ کی طرف سے ہوگا مجھے اپنا مطیع ہی پائیں گے۔“ دانیال نے سراسیمہ نظر اس پر ڈالی۔ پاکیزگی اور معصومیت کا تحیرخیز حسن اسے بے کل کرگیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی خاطر سرتاپا بدل گئی تھی۔ گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے گویا ہوا۔

”ذرا بوجھو تو ہم دو دن بعد سیر و تفریح کے لیے کہاں جارہے ہیں؟“ وہ اسے پاسپورٹ اور ٹکٹ تھماتے ہوئے بولا۔ ”ہر چھ مہینے بعد ہمارا دو ہفتے کا فارن ٹرپ ضرور ہونا چاہیے۔ یہاں کی مصروف ترین زندگی سے نکلنے کا یہ واحد طریقہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھ سکتا ہے۔ بزنس کی سب سے بڑی خرابی ہی یہ ہے کہ اپنی فیملی کو وقت دینا ناممکن ہوجاتا ہے۔ بزنس میں آرام و سکون کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”میں خود بزنس کلاس کی پروردہ ہوں۔ سائڈ ایفیکٹس جانتی ہوں۔ آپ کو علم ہے کہ میرا آپ سے شادی کرنے کا مقصد کیا تھا۔“ وہ اسے یاد دہانی کرانے لگی۔

”جانتا ہوں یار! صبح نو بجے آفس، چار بجے بیوی کے گھٹنے کے ساتھ، شام بیوی کے پہلو میں۔“ وہ اسے چھیڑنے لگا۔

”بہت بڑا دھوکا دیا ہے مجھے، اچھی بھلی آپ کی جاب تھی، خوامخواہ ہی چھوڑ دی، اب یہ حال ہے کہ نہ تو مجھے جاب کرنے دیتے ہیں، نہ ہی والدین کے پاس چھوڑتے ہیں۔ میں.... پارٹیز میں آرٹی فیشل مزاج کی خواتین کی کمپنی میں بہت افسردہ ہوجاتی ہوں۔“

”بیگم لائف از تو شارٹ، زیادہ گہرائی میں مت جاؤ، انجوائے کرو، پہنو اوڑھو، کھاؤ، پیو اور پارٹیز اٹینڈ کرو۔ سوشل ایکٹیوٹیز سے ہی یہ دنیا حسین ہے۔ اس لیے تو میں تمہیں ہر بزنس ڈنر اور فنکشن پر اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اب تم ایک ایلٹ سرکل میں جانی پہچانی جاتی ہو۔“ وہ نہایت پیار و لگاوٹ سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”جانتی ہوں، یہ باتیں مجھے دیکھتے ہی خواتین نہ جانے کیوں کانا پھوسی شروع کردیتی ہیں اور مرد حضرات کی حریصانہ نگاہیں اور پھر کمبل بننے کی کوشش، مجھے سخت گھن آتی ہے۔ خاص کر وہ مرد جن سے آپ

نے کوئی کنٹریکٹ سائن کروانا ہوتا ہے۔ عورت کے حجاب میں آنے سے وہ ان تمام علتوں سے محفوظ رہتی ہے۔ اس کی پیشانی پر اس مہر کو دیکھ کر بڑے بڑے سورما ادب و احترام سے جھک جاتے ہیں۔“ لہجہ ابھی بھی خوشگوار رکھنے کی کوشش جاری تھی۔

”یہ تمہارے بیک گراؤنڈ کے اثرات ہیں، آہستہ آہستہ یہ سب تمہیں بے حد نارمل لگنے لگے گا۔ غیرت اور آن مجھ میں بھی بے حساب ہے مگر یہ سب ہے بالکل نارمل میرے لیے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”آپ ٹھیک فرمارہے ہیں۔“ اس نے فوراً بات کو ٹال دیا۔ اس سے پہلے کہ شوہر آدمیت کے جامے سے باہر نکل آئے اور اول فول بکنے لگے۔

”اچھا تو ہم کہاں جارہے ہیں؟“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”تمہیں جو جگہ پسند ہے وہاں، میں نے بزنس ٹور بھی ساتھ ہی رکھ لیا ہے۔ ایک پنتھ دو کاج، اس لیے تو پاپا نے فوراً اجازت دے دی۔“ وہ بھی مسکرا دیا۔

”ویسے دانیال ایک بہت بڑی خوبی آپ کے اندر پوشیدہ ہے، وہ ہے آپ کی دور اندیشی اور پھرتی و تیزی...... ہر کوئی بزنس مائنڈڈ نہیں ہوسکتا۔ وقت اور موقع سے فائدہ اٹھانا کوئی آپ سے سیکھے۔“ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی تو دانیال نے اک طویل قہقہہ لگا کر اس کے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ مارے۔

”خوب سمجھی ہو مجھے...... امید ہے خوب نبھے گی۔“

☆☆☆......☆☆☆

شادی کے دو سال بعد عروج اک عظیم اور مقدس رشتے میں منسلک ہوگئی تھی۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ دانیال بیٹی کو دیکھنے اسپتال نہیں آئے گا کیونکہ وہ بیٹے کا خواہشمند تھا۔ جب سے الٹرا ساؤنڈ سے بیٹی کے وارد ہونے کی رپورٹ ملی تھی۔ وہ عروج سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ عروج کی ماں بیٹی کے ساتھ ہی تھیں۔ انہیں داماد کے رویّے نے خاصا پریشان کردیا تھا جبکہ ان کے خاندان میں بھی بیٹے کی پیدائش پر خوشیاں اور بیٹی کی آمد پر گھر کے تمام مردوں کے چہروں پر مُردنی اور عورتوں کی آنکھوں میں تاسف کے ساتھ ندامت اتر آتی تھی۔ کیا تعلیم یافتہ گھرانے بھی اس مرض کا شکار ہیں۔ خالدہ آخر اسی نتیجے پر پہنچ پائی تھیں کہ مرد کی فطرت کو ماحول، تعلیم اور دولت نہیں بدل سکتی۔

چند دنوں بعد عروج گھر آگئی۔ آدھی رات کے بعد دانیال تھکا ماندہ گھر واپس پہنچا۔ عروج کی گمبھیر خاموشی اس کے اندرونی جذبات و احساسات کے اظہار کا بہترین اور کارآمد ہتھیار تھا۔ بچی کاٹ میں گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں اک معصوم اور پاکیزہ روح کے اضافے سے عجیب سا فسوں طاری تھا جسے دانیال محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ عروج کو اگنور کیے وہ کاٹ کی جانب بڑھ گیا اور غیر ارادی طور پر اس پر جھک گیا۔

”سچ مچ ان دنوں میں بہت مصروف رہا ہوں، میں نے جان بوجھ کر تمہیں اگنور نہیں کیا۔ تمہاری امی تمہاری بہترین نگہداشت کررہی تھیں۔ میں بے فکر تھا۔“ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

ماں بننے کے ساتھ اکثر خواتین کو قوت گویائی بھی مل جاتی ہے...... جب ہی تو اس نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ہر رشتے سے بڑھ کر بزنس کا رشتہ پسند ہے۔ اس لیے تو میں نے آپ کے بزنس کو اپنی سوتن کا نام دے رکھا ہے۔ آپ اس کی خاطر مجھ

سے کنارہ کشی اختیار کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے کیا سوچ رکھتے ہیں آپ۔ میں تو آج تک آپ سے ایک بات نہ منوا سکی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "اب خدا سے جھگڑا شروع ہوگیا کہ بیٹا کیوں نہیں دیا؟ کس قدر جاہلانہ حرکت ہے۔" طویل خاموشی کے بعد دانیال نے بچی کو گود میں لینے کی کوشش کی۔

"عروج تمہیں علم ہے کہ ہمارے گھر یہ ننھی پری اللہ کے فضل و کرم سے ان گنت برکتوں کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ ان دنوں مجھے وہ کنٹریکٹ ملے ہیں جن کا میں کبھی خواب دیکھا کرتا تھا۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری...... میری مصروفیت کی وجہ سے تم بہت ہرٹ ہوئیں...... اب مسکرادو...... اور مجھے معاف بھی کردو۔" ہمیشہ کی طرح دانیال نے اسے دکھے دل کے ساتھ مسکرانے پر مجبور کر کے معاف کرنے پر راضی کرلیا۔

"بن نام کے کتنے دن گزر گئے...... جلدی سے میری رانی کا نام سوچو، کوہِ قاف سے اتری ہوئی یہ پری بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔"

"آپ کی رانی کا نام رانیہ دانیال کیسا رہے گا۔" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اے ون...... زبردست......" اس نے نعرہ لگایا اور عروج کو گلے لگالیا۔ عروج کو اگلے ہی لمحے اپنی تمام تر ناراضی اور گلے شکوے بے حد بے معنی اور بے وقت لگنے لگے۔ وہ خفیف سی ہنسی سے اسے دیکھنے لگی۔

☆☆☆......☆☆☆

وقت کے ساتھ عروج رانیہ کے بعد حوریہ اور نوریہ کو جنم دے کر دانیال کے رویّے سے خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ حتی الامکان اس کی کوشش ہوتی کہ وہ دانیال کے کہنے کے مطابق اس کے اصولوں پر چلتی رہے۔ بزنس کے پھیلاؤ، بھائیوں کی ناموافقت اور والد کے عالمِ جاودانی کی طرف سدھار جانے سے اسے دن رات کے گزر جانے کا ہوش ہی نہ تھا۔ عروج نے تو کمپرومائز کرلیا تھا مگر بیٹیاں باپ سے وقت کی فرمائش کرتیں۔ وہ جب گھر واپس آتا تو اسے سونے نہ دیتیں۔ جس دن وہ گھر سے چوری چھپے نکلنے میں کامیاب ہو پاتا تھا گھر کی فضا میں چیخ و پکار اور ان کا رونا، دھونا گونج اٹھتا تھا۔

پہلے پہل دانیال عروج کو ہر چھ مہینے کے بعد فارن ٹرپ پر لے جایا کرتا تھا۔ جب سے رانیہ ہوئی وہ انجوائے منٹ بھی ختم ہوگئی۔ اب عروج کے لیے تو درکنار بچیوں کے لیے بھی اس کے پاس وقت نہ تھا۔ تینوں بیٹے ہوتے تو شاید دانیال مختلف باپ ہوتا۔ اس سوچ نے عروج کو کئی بار مضطرب کیا مگر زبان میں اتنی تاب نہ تھی کہ دانیال سے سوال ہی کرلیتی۔ اسے اس سے تلخ جواب کی توقع تھی۔ اس لیے وہ اس موضوع پر کوئی بھی بات چھیڑنے کے حق میں نہ تھی کیونکہ وہ اسے بیٹا جو نہیں دے سکی تھی۔ جو اس کی جائداد اور اس کی دولت کا وارث ہوتا۔

زندگی اسی تناسب سے رواں دواں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے عروج کو پھر سے امید سے کردیا۔ دانیال اس بار کسی صورت چوتھی بیٹی کا باپ بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے عروج کو ابارشن کا مشورہ دیا۔ وہ خاموش رہی پھر حکم صادر کیا۔ اس نے سنی ان سنی کردی۔ اگلا قدم دھمکی دینے کا تھا جسے نظر انداز کردیا گیا۔ وہ اسے جبراً لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے پہلے تو سراسر انکار کردیا۔ دانیال کے اصرار پر وہ آمادہ تو ہوگئی مگر اس نے واضح طور پر بتادیا کہ اس عمل سے ماں کی جان جانے کے چانسز بہت

زیادہ ہیں۔ اب فیصلہ دانیال کے ہاتھ میں تھا۔ عروج نے رات بھر دانیال کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر وہ اس گناہِ عظیم کے بعد زندہ بچ بھی جاتی ہے تو وہ دانیال کو چھوڑ دے گی۔ تینوں بیٹیوں کو ساتھ لے جائے گی۔ اس کے والد اور بھائیوں میں انہیں پروان چڑھانے، بہترین ایجوکیشن دینے کی استطاعت ہے کہ وہ اُف تک نہ کریں گے۔ حالانکہ یہ بیٹیوں کو خوش فہمی ہی ہوا کرتی ہے جسے بخوبی جاننے کے باوجود وہ امید سے دامن گیر رہتی ہیں مگر آج اس نے پہلی دفعہ دانیال کو یہ سزا سنادی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کا منہ تکتا رہ گیا... کیونکہ اس کے تیور اور دھمکیاں اس کے ارادوں کی غمازی کررہی تھیں۔

"عروج بیگم آج تک میں نے جو چاہا وہی ہوا...... جس کی خواہش کی اسی کو پایا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میری یہ دیرینہ تمنا اللہ تعالیٰ پوری نہ کرے۔" وہ بہت فرسٹیٹڈ لہجے میں بولا۔ "میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے سامنے ہے۔ میں شکست اور ناکامی کو قبول کرنے والا انسان نہیں ہوں۔ نہ ہی بے بسی و بے چارگی کو صبر کا نام دے کر خود کو بے وقوف بنانے کے حق میں ہوں۔ مجھے میرا نام چاہیے عروج...... مگر یہ نام تمہارے بطن سے چلنا ناممکن ہے۔ اس لیے ابارشن کرانا ضروری ہے۔"

"میں اس معصوم کی قاتل بننے سے انکار کرتی ہوں۔ میری طرف سے آپ کو دوسری عورت کے وجود سے اپنی نسل چلانے کی اجازت ہے۔ میں ڈلیوری تک اپنے والدین کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، بیٹے کو جنم دیا تو مجھے لینے آجایئے گا۔" وہ آخری اور حتمی فیصلہ سنا کر دوسری طرف کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"بہت عاقبت نااندیش عورت ہو۔ اِک معمولی سی بات پر گھر کو اجاڑنے پر تل گئی ہو۔ ٹھیک ہے جاؤ تم سیالکوٹ کے محلے کی تنگ و غلیظ گلیوں کے گھر میں۔ جلد ہی ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

☆☆☆

"تمہیں کتنی بار کہا ہے الٹرا ساؤنڈ سے سیکس معلوم کرلو۔ ذرا تسلی ہوجائے گی مگر تم مانتی ہی نہیں۔ ویسے بہت ضدی اور چڑچڑی ہوگئی ہو۔" ماں نے ہلکی سی خفگی کا اظہار کیا۔

"اگر بیٹی ہے تو کیا الٹرا ساؤنڈ اسے بیٹا بنانے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں تو میں کل ہی چل پڑتی ہوں، آپ کو جو جھٹکا پیدائش پر لگنا ہے تو وہ پہلے ہی سہی۔ اصل مسئلہ آپ سب لوگوں کا ہے۔ مجھے تو اپنی اولاد بہت عزیز ہے۔" اس نے تاسف سے کہا۔ یوں بھی ڈلیوری کے دن بے حد قریب تھے اور اس کا ڈپریشن بڑھتا ہی جارہا تھا۔ دانیال نے اسے میکے بھیج کر اس کی کوئی خبر تک نہیں لی تھی...... اور اب اس کے ذہن میں ایک لاوا پک چکا تھا۔

☆☆☆

"دانیال میں نے جو کہا ہے وہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ آپ کو بیٹا چاہیے تھا۔ وارث آپ کو باری تعالیٰ نے عطا کردیا ہے۔ اسے اٹھائیں اور واپس چلے جائیں۔ میں آپ کے ساتھ ہرگز جانے والی نہیں۔" وہ سختی سے بول رہی تھی۔

"کیا تم مجھے معاف نہیں کروگی؟" وہ ممنونیت سے بولا۔

"کیسے معاف کرسکتی ہوں، ان تین معصوم بچیوں کی پیدائش پر آپ بہت مصروف تھے۔ انہیں دیکھنے تک نہیں آسکے۔ آج آپ خبر سنتے ہی تمام مصروفیت کو چھوڑ کر کیسے پہنچ گئے ہیں۔ بزنس میں گھاٹا ہوجائے گا، آپ سے خسارہ کیسے برداشت

ہوگا۔ اتنے مہینے آپ نے میری اور بچیوں کی خبر تک نہیں لی۔ آپ کو کن کن کوتاہیوں پر معاف کروں۔ بتائیں...... بولیں...... خاموش کیوں ہیں؟'' وہ غصے میں بول رہی تھی اور وہ سر جھکائے اس کی ہر بات سن رہا تھا۔ جب عروج نے خوب سنالیں تو وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''تم مجھے معاف نہیں کروگی تو میں یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا اور پھر یہاں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔''

''آپ کی دھمکیاں دینے کی عادت نہیں گئی، چار بچوں کے باپ بن کر بھی بچکانہ حرکتیں نہ چھوڑیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔'' پہلے ان مہینوں، ہفتوں، دنوں اور گھنٹوں کا حساب چکائیں جو میں نے کس کرب اور دروغ گوئی میں گزارے ہیں، اپنی سزا خود تجویز کریں پھر میں سوچوں گی کہ آپ کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔''

''تمہیں منائے بغیر نہیں جاؤں گا میری جان...... تمہارے بن میری زندگی بہت سونی ہے۔'' مردانگی کے شاہکار کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس سے پہلے کہ آنسو ابل پڑتے وہ تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

خالدہ برآمدے میں کھڑی تمام باتیں سن رہی تھیں۔ کمرے میں آکر بیٹی کو سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

''شوہر کے ساتھ مقابلے بازی نہیں کرتے بیٹا...... اسے معاف کردو، آج تک تمہارے باپ نے میرے سامنے اپنی کسی غلطی کا اعتراف تک نہیں کیا معافی مانگنا تو درکنار۔''

''آپ بہت عظیم خاتون ہیں، میں نے بھی آپ کی عظمت پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بھی خود کو سرتاپا بدل ڈالا شوہر کے لیے جو کہ سراسر غلط تھا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنی زندگی اپنی پسند سے گزاروں گی۔ ان بیٹیوں کو سر اٹھا کر چلنا سکھاؤں گی۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے زمانے سے لڑنا سکھاؤں گی۔ آپ جیسی تربیت دے کر انہیں بزدل اور کم ہمت بنا کر دنیا میں ذلیل وخوار ہونے کو اکیلا نہیں چھوڑ دوں گی۔ جہاں ڈولی جائے وہاں سے جنازہ نکلے آپ کے اس اصول کو میں ٹھوکر مارتی ہوں امی...... کیونکہ میں انسان ہوں جانور نہیں۔ میں نے ابھی سے اپنی بچیوں کو یہ درس دینا شروع کردیا ہے کہ وہ اس بھائی کی طرح سانس بھی لیتی ہیں، ان کے وجود میں اسی کے مانند سرخ خون بھی دوڑتا ہے۔ اسی کی طرح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ اسی جیسے جذبات واحساسات کی بھی مالک ہیں۔ اسی کی طرح بہت اہم اور باحیثیت بھی ہیں۔ اگر میں ان کو خوداعتمادی نہیں دوں گی تو ان کی مجرم میں ٹھہرائی جاؤں گی۔ کل میں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے امی، مجھے اس کے سامنے سرخروئی چاہیے۔''

''وہی ہوگا جو تم چاہوگی......'' دانیال نے اندر داخل ہوکر کہا۔'' آنٹی آپ کی بیٹی بہت ظلم ڈھاتی ہے مجھ پر۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''عروج تم جیت گئیں...... اس معاشرے کو تم جیسی ماؤں کی ضرورت ہے۔ میں ناسمجھ تھا۔ میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا چار نسلوں کو سنوار کر تمہیں سرخرو کریں گے۔'' دانیال نے آگے بڑھ کر اس سے کہا تو ایک خوشگوار فتح مندی کی مسکان اس کے لبوں پر پھیل گئی کہ سفرِنو کا آغاز ہوچکا تھا۔





احمق تماشائی

نمرہ احمد

بارش کے قطرے ٹپ ٹپ کھڑکی کے شیشے پر پھسل رہے تھے۔ کافی دیر ہوئی طوفان تھم چکا تھا اور اب مینہ کی آخری بوندیں گر رہی تھیں۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھے، قلم انگلیوں میں گھماتے...... کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قلم کا ڈھکن اتار کر کاغذوں کے اس پلندے پر رکھا ہوا تھا جو اُن کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ وہ شاید کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں پار ہے تھے۔ اُن کے چہرے پر تفکر کی لکیریں عمر

کی لکیروں سے زیادہ تھیں۔ عمر بھی کم نہ تھی قریباً پچاس کے لگ بھگ تو ہوں گے۔ بال قلموں سے سفید اور مونچھیں سرمئی تھیں۔ تنہا زندگی کی ساری داستان پیشانی پہ رقم تھی۔

تنہائی اور قلم...... بس دو ہی ساتھی تھے اُن کے۔ جب شادی کی عمر تھی تو کوئی پسند نہیں آئی۔ عمر گزر گئی تو بہتوں کو وہ پسند نہ آئے۔ اب تو عرصہ ہوا انہوں نے کسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بس اخبار کا دفتر تھا اور ان کی پرانی سوزوکی تھی' یہ اچھے وقتوں کا اماں، بابا کا چھوڑا ہوا مکان تھا اور قلم تھا۔ زندگی میں ان تین چار چیزوں کے علاوہ ان کا کوئی قیمتی اثاثہ نہ تھا۔ ہاں ایک بہن تھی جو عرصے سے امریکا میں مقیم تھی۔ تین، چار سال بعد ایک چکر لگا لیتی، سوئیٹرز اور جوتے لے آتی (شاید وہاں یہی دو چیزیں سستی ملتی تھیں) شادی کر لینے پر لیکچر دیتی اور بچوں کو ان کی سوزوکی میں سیر کروا کر واپسی کی اڑان بھر لیتی۔

وہ روزانہ کا کالم لکھتے تھے۔ کبھی سیاست، کبھی ثقافت، کبھی معاشرت اور کبھی مذہب۔ موضوع ختم نہیں ہوتے تھے سیاہی ختم ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھار سوچ بھی ختم ہو جاتی تھی جیسے ابھی وہ قلم کھول کر بیٹھے کچھ نہ لکھ پا رہے تھے۔ موضوع تھا ان کے پاس مگر الفاظ جانے کہاں جا سوئے تھے۔ شاید ذہن گھٹن کا شکار تھا۔ انہوں نے کھلا قلم ڈھیرے سے کاغذوں کے پلندے پر ڈالا اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی نم ہوا سرعت سے اندر داخل ہوئی تھی۔ کاغذوں کے کنارے پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ انہوں نے پیپر ویٹ اٹھا کر ان پر رکھا اور باہر بھیگے منظر کو دیکھنے لگے جہاں بارش اب دم توڑنے کو تھی۔

ان کی زندگی کی طرح کمرے کا رخ بھی بدقسمتی کا شکار تھا۔ کھڑکی کے باہر کوئی خوب صورت ہرا ابھرا پہاڑ نہیں، کوئی نیلی جھیل نہیں، کوئی سرسبز گھاس اور خوشنما پھولوں سے مزین لان نہیں بلکہ پکی اینٹوں کا چھوٹا سا صحن تھا، سپاٹ، خشک صحن جو گھر کے پچھلی سمت تھا اور اس کے اختتام پر چار دیواری تھی۔ اِدھر تمام گھر ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے۔ صحن چھوٹے اور کمرے زیادہ تھے۔ دیوار کے ایک طرف کی آواز دوسری طرف بنا کسی رکاوٹ کے سنی جا سکتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کے دائیں ہاتھ کی طرف واقع گھر سے کافی عرصے سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ پچھلے کرائے داروں نے مکان خالی کر دیا تھا اور کچھ روز پہلے جب وہ راہ چلتے اپنے ہمسائے (مالک مکان) سے ملے تھے تو معلوم ہوا تھا کہ آج کل وہ کرائے دار کی تلاش میں ہے۔

وہ جس رخ پر بیٹھے تھے وہاں سامنے کھڑکی کے باہر تین اطراف کی دیواریں تھیں۔ ان کے بالمقابل دیوار پر پیلی روشنی بکھر رہی تھی۔ غالباً ساتھ والے گھر کے ٹیرس سے آ رہی تھی۔ درحقیقت یہ گھروں کی بیک سائڈ تھی تو ٹیرس کے بجائے بالکونی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ معلوم نہیں کس چیز کی روشنی تھی۔ شاید لیمپ وغیرہ جلا ہوا تھا۔ یقیناً نئے کرائے دار آ گئے تھے۔ وہ ایک اچٹتی نظر اس اندھیرے میں روشن ہوئی دیوار پر ڈال کر واپس کاغذوں کے پلندے کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ ایک دم سے ایک آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی، انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

دائیں جانب والے گھر سے وہ آواز آ رہی تھی۔ گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز، نسوانی آواز جیسے کوئی کم عمر لڑکی رو رہی تھی۔ سامنے دیوار پر روشنی میں انہیں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ وہ غالباً بالکونی میں لٹکے لیمپ کے آگے بیٹھی تھی، تبھی اس کا سایہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔

انہوں نے کاغذ ایک طرف کیے اور میز سے اپنا نظر کا چشمہ اٹھا کر لگایا۔ منظر اب صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر بغور دیکھنے لگے۔ وہ کوئی لڑکی تھی جو گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں کی اونچی پونی ہوا میں جھول رہی تھی۔ ماتھے پر آگے سے کٹے ہوئے بالوں کا خاکہ سا بنتا تھا۔ اس کا چہرہ اور نقش تاریکی میں ڈوبے تھے، وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی اور اس کی سسکیاں گیلی دیواروں پہ اتر رہی تھیں۔ اس کی آواز میں کم عمری کا الھڑ پن تھا اور سائے میں ایک دلکش سراپے کی رعنائی تھی۔ وہ بہت درد سے رو رہی تھی جیسے بہت تکلیف میں ہو، اس کا دکھ سارے ماحول پر چھانے لگا تھا۔

بارش ختم ہو چکی تھی مگر اس کے آنسو انہیں ڈبو رہے تھے وہ یک ٹک، گم صم بت بنے اس ہولے ہولے کانپتے سائے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کون تھی، اسے کیا غم تھا، وہ اتنی بے بسی اور تڑپ سے کیوں روئے جا رہی تھی، وہ جاننا چاہتے تھے مگر جان نہیں سکتے تھے سو اسی طرح بیٹھے اسے دیکھتے رہے جس کا سایہ آدھی دیوار پر محیط تھا۔ شاید وہ لیمپ کے بہت قریب بیٹھی تھی۔

کتنے لمحے بیت گئے، وہ یونہی روتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کی سسکیاں تھمتی گئیں اور پھر ایک دم سے لیمپ بجھ گیا۔ سامنے والی دیوار تاریک ہو گئی اور اُن کا منظر ختم ہو گیا۔ دفعتاً دائیں جانب کے گھر کی بالکونی سے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور پھر چٹخنی چڑھنے کی۔ وہ شاید اندر چلی گئی تھی۔ اب وہاں بیٹھنا بے سود تھا۔

کالم کا موضوع اور خیال ان کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے بے دلی سے قلم کو کیپ چڑھائی اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

صبح راہ چلتے پھرتے اُن کی ہمسائے سے ملاقات ہو گئی۔ وہ دراصل اُن کے ہمسائے والے گھر کا مالک مکان تھا۔ رہتا ایک گلی چھوڑ کر تھا۔ یہ گھر اس نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔

"رشید صاحب......" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو روک بیٹھے۔ "آپ کا گھر کرائے پر چڑھا؟"

"ہاں جی، اللہ کا شکر ہے، کراچی سے ایک فیملی آئی ہے، پورا گھر انہوں نے ہی لے لیا ہے۔"

"اچھا، یہ تو اچھی بات ہے، بڑی فیملی ہوگی یقیناً؟"

"ارے نہیں، فیملی تو چھوٹی سی ہے، میاں' بیوی اور ایک بیٹی۔ بس امیر لوگ ہیں، پرائیویسی چاہتے ہیں سو پورا گھر لے لیا بلکہ اوپر والا پورا پورشن بیٹی کے لیے ڈیکوریٹ کر رہے ہیں۔"

"اچھا......اچھا...... اچھے لوگ ہوں گے پھر تو؟"

"ہاں جی۔" اور وہ جان گئے تھے کہ یہی "بیٹی" رات میں رو رہی تھی۔ ماں، باپ اتنے پیار کرنے والے تھے پھر بھی رو رہی تھی؟ جانے کیا بات تھی۔

رات وہ کالم لکھنے بیٹھے تو کچھ سوچ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ کل کی بارش کے باعث آج قدرے حبس تھا۔ باہر صحن تاریکی میں ڈوبا تھا۔ صحن میں وہ کبھی کوئی بھی بتی یا بلب نہیں لگوا سکے تھے۔ دھیان ہی نہیں دیا کبھی۔ یہ کام تو ویسے بھی بیویوں کی توجہ دلانے پر ہی ہوتے ہیں، خود سے کہاں خیال آ سکتا تھا ان کو۔ البتہ آج اُن کو اس بات کی خوشی تھی ورنہ اگر صحن روشن ہوتا تو برابر والی کے لیمپ کی روشنی اِدھر نہ پڑتی۔

وہ کالم لکھنے لگے۔ کل کا ناغہ کیا تھا سو آج مستعدی سے قلم چلانے لگے۔ الفاظ بھی تھے، موضوع اور نتائج بھی۔ ابھی درمیان میں ہی پہنچے تھے کہ وہی مدھم نسوانی آواز تاریکی میں سنائی دی۔ قلم روک کر

انہوں نے بے اختیار سر اٹھایا۔
سامنے دیوار پہ پیلی روشنی پڑ رہی تھی اور اس میں ایک سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُسی لڑکی کا سایہ۔ وہ اسی طرح دائیں پہلو بیٹھی تھی۔ اس کی پونی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ماتھے پر کٹے بال بھی اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ آج وہ سر جھکائے نہیں بلکہ سر اٹھائے بیٹھی تھی۔
''کرسٹوفر!'' وہ گہری تاریکی میں ہولے سے بولی تو وہ چونک اٹھے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔
دیوار پر پڑتے زرد عکس میں آہستہ سے کوئی چلتا ہوا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ وہ لمبا سا لڑکا تھا۔ اس کے بال گھنگرالے اور ناک لمبی تھی۔ وہ اب ان دونوں کا سائڈ پوز دیکھ سکتے تھے جو آمنے سامنے موجود تھے۔ لڑکی سر اٹھا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
''کیا ہم ساری زندگی اِدھر بند رہیں گے... کرسٹوفر؟'' وہ بہت دکھ سے کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک سے گئے۔
''مجھے کرسٹوفر مت کہو کیتھی، مجھے کرس کہو، ہمارے ڈیڈ کا بھی تو یہی نام تھا نا۔'' لڑکے کی آواز قدرے بھاری تھی۔
''مگر اب ڈیڈ نہیں رہے اور ہم یتیم ہو چکے ہیں۔ اب ہمارا کوئی نہیں ہے۔''
''مما تو ہیں، مما ہم سے پیار کرتی ہیں کیتھی، ٹرسٹ ہر۔'' ان کے سائے بالکل ساکت تھے۔ دکھ بھی ایسے ہی اُن کے لہجوں میں ٹھہر گیا تھا۔
''مجھے مما پر بھی ٹرسٹ نہیں رہا۔ وہ جب ہمیں یہاں لے کر آئی تھیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں بس ایک دن اس کمرے میں بند رہنا ہوگا کہ اُن کے پاپا کو پتا نہ چلے اور وہ جلد ہی ہمارے نانا کا پیار حاصل کر کے اُن کو اپنی وصیت بدلنے پر مجبور کر دیں گی۔ پھر کچھ دنوں میں نانا مر جائیں گے اور ساری دولت ہماری ہوگی مگر یہاں آ کر کیا ہوا؟ ہم کتنے دنوں سے یہاں بند ہیں اور مما کو ہمارا خیال ہی نہیں۔''
''مما پر بھروسا رکھو کیتھی۔''
''نہیں کرس...... مما اپنے پیرنٹس کے ساتھ اُن کی دولت میں اتنی مگن ہیں کہ انہیں بھول چکا ہے کہ اُن کے بچے یہاں اوپر اس چھوٹے سے کمرے میں بند ہیں، اگر اس گھر کو آگ لگ گئی اور ہم مر گئے تو کسی کو علم بھی نہیں ہوگا کیونکہ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اس محل میں صرف مالکم، اس کی بیوی اور بیٹی رہتے ہیں۔ لوگوں کو کیا پتا کہ ظالم مالکم کے گرینڈ چلڈرن اوپر قید ہیں، صرف اپنی ماں کی خود غرضی کی وجہ سے۔''
''کیتھی......'' اور پھر وہ بولتے بولتے رکا۔
''کوئی آ رہا ہے، چلو۔'' شاید انہیں کوئی آواز آئی تھی تبھی ایک دم سے لیمپ بجھ گیا۔ تھوڑی سی کھٹر پٹر ہوئی اور پھر بالکونی کے دروازے کے بند ہونے اور چٹخنی چڑھنے کی آواز آئی۔
وہ دم بخود سے بیٹھے تھے۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ باہر نکل کر اُن کی بالکونی میں جھانک ہی لیں یا صبح جا کر مالکم صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا کر سوال کر سکیں کہ ان کی بیٹی نے اپنے بچوں کو اوپر کیوں قید کر رکھا ہے۔ نانا کی وصیت...... چند دن بعد نانا کی متوقع موت...... ماں کی خود غرضی...... قید بچے......وہ ٹین ایجز تھے۔ پندرہ سولہ سال کے تو ہوں گے، ان کو یوں بند رکھنا تو ظلم تھا مگر وہ کس سے فریاد کرتے۔ کالم جیسے تیسے مکمل کر کے وہ رات گئے کرسی سے اٹھے تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

اس رات وہ قلم کاغذ لے کر کھڑکی کے سامنے بیٹھے تو یہ بات طے تھی کہ آج کالم اُن سے لکھا نہیں جانا اور وہ بس اپنی دیوار پر گرتے سائے دیکھنے کے لیے اُدھر بیٹھے تھے۔ ٹھیک دس بجے ان کو دیوار پر روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ انہوں نے بند قلم کپ میں دیگر قلموں کے ساتھ ڈال دیا (آج انہوں نے اسے کھولنے کا بھی تکلف نہیں کیا تھا) اور آگے ہو کر بیٹھے۔ دلچسپی و فکر مندی سے زرد روشنی میں ان دو ہیولوں کو دیکھنے لگے۔ لڑکی اسی طرح ایک سائڈ سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی بل دار اونچی پونی ہوا سے ہولے ہولے جھول رہی تھی۔ آج وہ سر سیدھے رکھے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں اُس کے مقابل اس کا گھنگرالے بالوں والا بھائی بیٹھا تھا۔ کیتھی اور کرسٹوفر۔
''کیا سوچ رہی ہو کیتھی؟''
''میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ہمارے ٹوئنز کو دیکھا ہے؟ وہ اب مما کو مس نہیں کرتے بلکہ روز بہ روز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔''
ٹوئنز؟ وہ چونکے تو کیا کیتھی کے ساتھ کوئی اور بچے بھی قید تھے؟ یقیناً ان کی جڑواں بہنیں یا بھائی۔
''ہاں، دونوں بہت کمزور ہوتے جا رہے ہیں مگر ہمیں سروائیو کرنا ہے کیتھی۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہے اور تمہیں بیلرینا۔ ہمیں اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔''
''مما ہمیں کبھی یہاں سے نہیں نکالیں گی۔ وہ اب ہماری پروا کرنا چھوڑ چکی ہیں۔''
''ہمت کرو کیتھی۔'' وہ اسے کافی دیر سمجھاتا رہا مگر اس لڑکی کے لہجے کا کرب، اس کی آواز کی نمی...... ہر شے ان کی روح پر اترتی چلی گئی۔
انہوں نے کالم لکھنا چھوڑ دیے۔ وہ بس ہر رات یونہی کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھ جاتے۔ کمرے کی لائٹ گل کر کے، دونوں پٹ کھول کر چمکتی دیوار پر

حرکت کرتے سائے دیکھتے رہتے۔ ان کی باتیں سنتے رہتے۔ پھر پورا دن سوچتے ہی رہتے کہ کبھی ان کے گھر جائیں یا کم از کم اپنی چھت پر چڑھ کر ان بچوں کو آواز ہی دے لیں اور نہیں تو جب رات میں وہ باتیں کررہے ہوں تو باہر صحن میں آ کر ایک نظر اُن کی بالکونی کو دیکھ ہی لیں۔ جہاں وہ چینی کی مورت جیسے سراپے والی لڑکی بستی ہے، جو اپنی نانی کے مظالم اور ماں کی بے اعتنائی پہ شکوہ کناں رہتی ہے مگر وہ کبھی یہ ہمت نہ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ ایک روز دوپہر میں ڈرتے ڈرتے صحن میں نکل کر گردن اٹھائی تو دائیں گھر کی بالکونی سنسان پڑی تھی۔ اندر کھلنے والے دروازے سختی سے بند تھے۔ بس ایک کونے میں ایک سیدھی میز رکھی تھی۔ شاید وہ اسی پر بیٹھی ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی ہمت نہ کر سکے... بلکہ اب تو انہوں نے اپنے گھر کی چھت پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اخبار کے دفتر بھی بس خانہ پُری کے لیے جاتے۔ کالم سے ناغہ لے لیا تھا۔ بس روز اُن کو رات کا انتظار رہنے لگا تھا۔ کب دس بجیں اور وہ دونوں بالکونی میں آ کر باتیں کریں۔

وہ روز اُن کی گفتگو سنتے تھے۔ وہ جس کمرے میں بند تھے۔ اس کے آگے کسی ایٹک کا ذکر کرتے تھے۔ شاید وہاں کوئی اسٹور روم تھا جہاں بہت چوہے تھے۔ ان کی ہر بات میں ایٹک ہوتا تھا یا پھر ماں سے نفرت یا نانی کے مظالم یا اپنے جڑواں، بہن اور بھائی کی گرتی حالت۔ پھر ایک روز انہیں اُن کی گفتگو سے علم ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی نمونیے کا شکار ہوگیا ہے... اور اگلی رات وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ ان کا بھائی مر چکا ہے۔ ہاں ان کا بھائی مر گیا اور اس لڑکی کا ہر آنسو اُن کے دل پر گرتا رہا۔

وہ کب کیسے اس کی محبت میں مبتلا ہوگئے، انہیں علم نہ ہوسکا۔ بس وہ ہر رات کھڑکی کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ کافی کے کپ پر کپ پیتے جاتے، دور کہیں گونجنے والی مدھم سرگوشیاں سنتے رہتے۔ کاغذوں کے پلندے پیلے پڑنے لگے تھے۔ بند قلم پر دھول جمنے لگی تھی۔ وہ تھے، اُن کی تنہائی تھی اور دیوار پر حرکت کرتے سائے تھے۔ زندگی بس یہیں تک محدود ہوگئی تھی۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ جائیں اور ان بچوں کو آزاد کروالیں۔ ان کو اپنے گھر لے آئیں۔ اُن کو تحفظ اور پیار دیں۔ اور وہ لڑکی...... اسے وہ اپنا لیں۔ کیا ہوا جو ان کا دین ایک نہیں، وہ اگر مسیحی تھی تو وہ اس سے شادی کر سکتے تھے۔ مگر وہ اپسرا ان سے شادی کرنے پر کیوں راضی ہوگی بھلا؟ لیکن کیا پتا ہو بھی جائے۔ خوش گمانی میں حرج ہی کیا تھا۔

پھر ایک روز انہیں علم ہوا کہ وہ دونوں اپنی چھوٹی بہن کو لے کر یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ دور کہیں کسی اور شہر جانے کا جہاں ان کی ماں اور نانی ان کو تلاش نہ کر سکیں۔ اگر وہ چلے گئے تو ان کی تمنائیں ادھوری رہ جائیں گی بلکہ ان کی زندگی بھی ادھوری رہ جائے گی۔ وہ کبھی خود کو مکمل نہیں کر پائیں گے۔ نہیں، انہوں نے ان کو جانے نہیں دینا۔ وہ ان سے بات کریں گے۔ ان کو اپنے پاس بلا لیں گے۔ ان کا ہر طریقے سے خیال رکھنے کی کوشش کریں گے۔

اس رات وہ بہت بے چین سے کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔ اُدھر بالکونی میں کیتھی اور کرس باتیں کررہے تھے۔

”ممایہاں سے چلی گئی ہیں، ہم اُن کا زیور نہیں چرا سکتے۔“

”مگر ہمارے پاس تھوڑے بہت پیسے تو جمع ہوگئے ہیں نا کرس، اب ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“

”کل صبح چھ بجے کی ٹرین ہم پکڑ لیں گے۔“

”کیری کو راضی کرنا مشکل ہوگا۔“ وہ اپنی بہن کی بات کررہی تھی جس کا جڑواں چند روز قبل جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

”ہم راضی کرلیں گے، تم سامان پیک کرو کیتھی۔“

اور ان سے اب مزید صبر کرنا مشکل تھا۔ اپنی ساری بزدلی، کم ہمتی اور جھجک کو پسِ پشت ڈال کر وہ اٹھے اور سیڑھیوں کی طرف لپکے، انہیں اس لڑکی کو روکنا تھا۔ انہیں اس کو تحفظ دینا تھا، اسے زمانے کی ساری کٹھن گھاٹیوں سے بچانا تھا۔ اسے اپنے پاس لے آنا تھا۔ وہ تیز تیز سیڑھیاں پھلانگ رہے تھے ان کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ اس عمر میں بھاگنا ان کے لیے نقصان دہ ہوسکتا تھا مگر وہ تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔

وہ اس کو روک لیں گے، اس کو اپنا لیں گے۔ اس کی زندگی سے ساری خوشیاں کشید کردیں گے، اس کے سارے غموں کو مٹا ڈالیں گے، ہاں۔ وہ اسے خوش رکھیں گے، وہ اس کے لیے اس کی بہن اور بھائی کو بھی اپنے پاس لے آئیں گے۔ ان کی ظالم ماں اور نانی کو علم نہیں ہونے دیں گے، کسی صورت بھی نہیں۔ چھت کا دروازہ کھول کر وہ باہر آئے تھے۔ ان کی بالکونی اور ہمسائیوں کی بالکونی ملی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔

وہ کیتھی کو یہاں سے لے جائیں گے۔ وہ کراچی یا پھر اپنے آبائی شہر ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔ وہاں ان بچوں کی ماں اور نانی ان کو نہیں ڈھونڈ سکیں گی۔ وہ ان کی دسترس سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اپنی بالکونی کے آخری سرے پر آ کر وہ رکے۔

بائیں طرف کی بالکونی نیم روشن تھی۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر اس لڑکی کی بالکونی کے بالکل کونے پر وہ میز رکھی تھی۔ اس میز کے ساتھ وہ ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ وہ کیتھی نہیں تھی بلکہ ایک دس گیارہ سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کے کھلے بال کمر پر گر رہے تھے۔ وہ بہت محویت سے اپنی انگلیوں سے بندھے دھاگوں کو اوپر نیچے ہلا رہی تھی۔ دھاگوں کے دوسرے سرے پر میز پر رکھی دو کٹھ پتلیوں کے ہاتھ بندھے تھے۔ پہلی کٹھ پتلی ایک ہاتھ جتنی گڑیا تھی جس کی اونچی پونی تھی اور ماتھے پر کٹے ہوئے بال تھے۔ دوسری کٹھ پتلی بالشت بھر کا گھنگرالے بالوں والا گڈا تھا۔ وہ ایک تختے پر ان دونوں کو آمنے سامنے بٹھائے لیمپ کے آگے رکھے ہوئے تھی۔ اس کے قریب ہی ایک کتاب پڑی تھی جس کا سرورق ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔

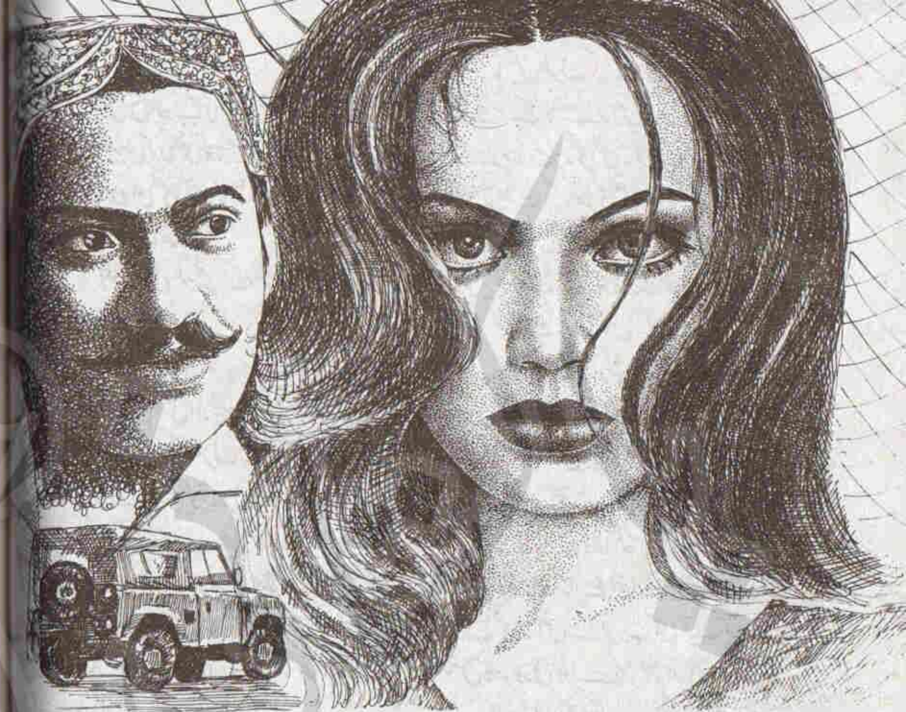
فلاورز ان دی ایٹک۔ وہ بالکل ساکت ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کل صبح چھ بجے کی ٹرین سے ہم جائیں گے۔“

”میں نے سارا سامان پیک کرلیا ہے کرس۔“

وہ باری باری ایک پتلی اور موٹی آواز نکال کر گفتگو کو آگے بڑھا رہی تھی۔ قریب ہی پڑے ایک کٹھ پتلی ڈرامے کے دعوت ناموں کی شہ سرخی وہ اتنی دور سے بھی پڑھ سکتے تھے۔ وہ ڈراما جس کی ریہرسل وہ کافی دنوں سے کررہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے گردن موڑ کر نیچے اپنی دیوار کو دیکھا جہاں دو خوب صورت سائے گر رہے تھے۔

البتہ کٹھ پتلیوں کا دھاگا بہت باریک تھا۔ اس کا سایہ نہیں بنتا تھا۔



شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

تم نا حق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شیریں حیدر

قسط 11

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہئیے تھا- تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی- عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں- بد قسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آ جاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پسِ پشت ڈال دیتا ہے- غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے-

آئیں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے اس تعلق میں کون کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مرادنگر نامی گاؤں میں تقسیم ہندوستان سے قبل ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ اکٹھے رہتے تھے، جس طرح پاکستان کے باقی سب حصوں میں تھے۔ چوہدری مراد علی اور نور علی دو بھائی تھے، جن کے دادا کے نام پر اس گاؤں کا نام رکھا گیا تھا۔ فطرتاً دونوں بھائی بالکل مختلف ہیں، مراد علی شریف النفس اور نور علی عیاش طبع۔ مراد علی کی بیوی عابدہ اور تین بیٹے جہانگیر، شجاع اور شیر علی ہیں۔ شجاع عادات میں اپنے چچا پر ہے حتیٰ کہ ایک رات اپنی بھابی رابعہ کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے، مراد علی بیٹوں میں فساد پڑ جانے کے باعث رابعہ کو یہ بات جہانگیر سے چھپانے کو کہتے ہیں اور جہانگیر، رابعہ اور شیر علی کو شہر منتقل کر دیتے ہیں۔ شہر جا کر رابعہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوتی ہے جس کا نام عمران رکھا جاتا ہے۔ نور علی کی بدمزاج بیوی شکیلہ ہے اور بیٹے اکبر اور بابر ہیں۔ نور علی کا بڑا بیٹا اکبر علی ہے جس کے ہاں دو بیٹیوں کے بعد دو جڑواں بیٹیوں کی ولادت ہوتی ہے تو اس کی ماں شکیلہ بیگم، ان بچیوں کے قتل کا حکم ملازماؤں کو صادر کرتی ہے۔ منشی قائم علی چند برس پہلے اپنے گاؤں خوشحال نگر سے اسی گاؤں میں آ گیا تھا۔ معراج نے ڈسپنسری بنائی اور اپنے تجربے سے ان کی مدد کرنے لگی۔ زرتاج سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹی ماہ تاج کسی درندے کی زیادتی کا شکار ہو گئی اور چھوٹی دو جو کہ جڑواں تھیں، گم ہو گئیں۔ بچیوں کی گمشدگی کو معراج کی غفلت جان کر قائم علی نے اس کو شہر بھیج دیا۔ قائم علی سکون کی تلاش میں ایک کوٹھے پر جا پہنچا۔ ماہ تاج سے زیادتی کرنے والا سہیل ایک آوارہ اور بدکردار نوجوان ہے جو ماں باپ کے باہمی اختلافات کے باعث ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اس نے اپنے ساتھ زبردستی اپنے دوست سلیم کو شریک جرم کر لیا۔ سہیل کا باپ اسلم کردار کا کمزور آدمی ہے۔ قائم علی کی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک، جہاں آرا نامی طوائف کے ہاتھ لگتی ہے جس کے پاس اس سے قبل ہر عمر کی چھ لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں۔ الماس سب سے بڑی ہے اور اس کا نام فیروزہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں آرا کا اپنا سگا بیٹا، دلاور ہے، جسے عرف عام میں دلی کہتے ہیں۔ مریم ایک استانی ہے، جس کا آگا پیچھا اس کے محلے میں کسی کو معلوم نہیں۔ اپنی ملازمہ جینا کو وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی کزن سائرہ نے اسے یہ بچی دے دی ہے۔ یوں قائم علی کی بیٹیاں، حسن آرا، ستارہ بن کر مریم کے گھر میں اور نین تارا، فیروزہ بن کر جہاں آرا کے گھر میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ زرتاج جب چوہدرانی شکیلہ کا حکم سنتی ہے تو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ پیدا ہونے والی بچیوں میں سے ایک تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے اور اکبر علی کی بیوی فاخرہ کی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ زرتاج بے اختیاری میں اس بچی کو اٹھا کر شاکر کے پاس جاتی ہے۔ شاکر گاؤں کا نوجوان سنار ہے اور اس کی بات زرتاج سے تقریباً طے ہے۔ زرتاج شاکر سے کہتی ہے کہ اس بچی کو چھپا لے۔ زرتاج کے علم میں لائے بغیر وہ نور کے تڑکے اس بچی اور اپنا سارا سونا وغیرہ لے کر گاؤں سے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں اس کی ملاقات ناہید نامی ایک نوجوان خاتون سے ہوتی ہے۔ بی بی جی گاؤں کی بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کا بیٹا عباس اور بیٹی کلثوم...... دو ہی اولادیں ہیں۔ عباس ہندو گھرانے کی ایک لڑکی سے دوستی قائم کر لیتا ہے۔ عباس، دیا کو لے کر بھاگ جاتا ہے اسی رات کلثوم کی سہیلی کاجل خودکشی کر لیتی ہے کیونکہ وہ دیا کے بھائی شنکر کی منگیتر ہے اور گھر والوں کو شک ہے کہ کاجل دیا کی شریک راز تھی، حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی رات کی سحر کو بی بی جی فجر کی نماز پڑھتے ہوئے ایسی سجدے میں گئیں کہ اٹھ ہی نہ سکیں۔ کلثوم بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ سہیل کے قتل ہونے پر اس کا باپ اسے برا بھلا کہتا ہے۔ فاخرہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیا نے اسلام قبول کر کے عباس سے شادی کر لی۔ اس کا نام زہرہ ہے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ شجاع کے آدمی معراج کے گھر میں گھس کر زرتاج کو لے جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ موجی، قائم علی سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے اور دوسری طرف الماس قائم سے شادی پر زور دیتی ہے۔ ناہید کو اس کا شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ کلثوم ماں بننے والی ہے لیکن گھوٹو یعنی جہانداد نہیں چاہتا کیونکہ اگر کلثوم ماں بن گئی تو اس کو کام کرنا پڑے گا۔ اکبر علی کی ملاقات رانی سے ڈیرے پر ہوتی ہے اور وہ اس کو دوبارہ آنے کے لیے کہتا ہے۔ رانی نگی سے کہتی ہے تو نگی جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ رابعہ حویلی آتی ہے تو عمران کی پیدائش کی خوشی میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے، زرتاج وہاں فیضی کو دیکھ کر رابعہ سے اس کے بارے میں پوچھتی ہے۔ ناہید کی بیٹی اور شاکر کی بیٹی کا نام سیما اور ربیعہ رکھا جاتا ہے، ناہید کو انور طلاق دے دیتا ہے۔ سہیل کو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اس کے ذہن سے سلیم کا تصور محو نہیں ہوتا۔ رابعہ شہر آ کر جہانگیر کو شجاع کی حرکت کے بارے میں بتاتی ہے جس پر جہانگیر غصہ کرتا ہے۔ کلثوم جہانداد کو اندازہ نہیں ہونے دیتی کہ اسے اس کی سازش کا علم ہو گیا ہے۔ نگی رانی کے لیے پریشان ہوتی ہے دلاور، جہاں آرا کی لاکھ کوشش کے بعد گزرتے وقت کے ساتھ اسی رنگ میں رنگ گیا جو ایسے جگہوں پر رہنے والوں کے ہوتے ہیں۔ شاکر گاؤں جانا چاہتا ہے لیکن بچی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے جا نہیں پاتا۔ جہانگیر شجاع کو شہر لے جانا چاہتے ہیں لیکن مراد علی منع کر دیتے ہیں۔ جاوید کے انتقال پر مریم، سائرہ کے پاس جاتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس نے سب کو یہ بتایا ہے کہ یہ بچی سائرہ کی ہے۔ عابدہ بیگم، شجاع کو بتاتی ہیں کہ زرتاج کے گھر کچھ لوگ کودے تھے تو شجاع فیضی کو خبردار کر دیتا ہے۔ قائم علی، پرویز سے صلاح لیتا ہے تو وہ بھی اس کو شادی کرنے کا کہتا ہے۔ ------------------------ (اب آگے پڑھیں)

عباس ابھی ایک بیٹی کی پیدائش کے بوجھ سے نہ سنبھلا تھا اور اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ لوٹ کر گاؤں جائے اور بی بی جی سے معافی مانگے، ان کو بتائے کہ دیا نے اس کی خاطر مذہب تبدیل کر لیا تھا اب وہ زہرہ تھی اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی، بی بی جی کی پوتی...... زرینہ! کہ زہرہ نے اسے پھر سے امید سے ہونے کی خبر سنا دی۔ محنت مزدوری کر کے وہ بہ مشکل گھر کی گاڑی کھینچ رہا تھا، اب کس طرح گھر میں ایک کے بعد ایک جی آئے چلا جا رہا تھا اور اخراجات بڑھ رہے تھے۔ ایک بچی کی پیدائش کا خرچہ ہوا اس کے کئی اور اخراجات اور اب دوسرے بچے کی آمد کے باعث اس کا ماں کا دودھ چھوٹا تو دودھ کا مستقل اور اضافی خرچ بڑھ گیا تھا۔

وہ چڑچڑا سا ہو گیا تھا، زہرہ بات کرتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتا، بچی روتی تو اسے یوں ڈانٹتا جیسے وہ سب سمجھ رہی ہو...... الٹا وہ اور بھی چلانے لگتی اور اس کا بس نہ چلتا کہ اس کا گلا گھونٹ کر اس کو مار ہی ڈالے، اس کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔ زہرہ اس سے بات بے بات الجھتی، اس کا بھی اس سارے معاملے میں اتنا ہی قصور تھا جتنا عباس کا تو پھر فقط وہ کیوں سزاوار ٹھہرتی؟ وہ بھی دو بدو بحث کرتی اور بات بڑھتی چلی جاتی۔ اس روز بھی عباس اس سے جھگڑا کر کے بغیر ناشتا کیے بلکہ ناشتے کی سینی کو ٹھوکر مار کر ہر چیز کو گراتا ہوا گھر سے بک بک کرتا نکلا تھا، وہ بیٹھی دھواں دار رو رہی تھی اپنی بے بسی کو...... اس بچی کی قسمت کو اور آنے والے کو بھی۔

وہ چلائے جا رہی تھی بغیر اس بات کا احساس کیے کہ اس کی ماں جانے کون کون سے دکھوں کو رو رہی تھی، وہ بھوک سے چلا رہی تھی اور زہرہ آنسوؤں کے گولے حلق سے اتار رہی تھی۔ اس روز بھی اسی بات پر جھگڑا شروع ہوا تھا کہ بچی کی ضرورت کے لیے دودھ ناکافی ہوتا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر عباس اپنا سگریٹ کا خرچہ کم کر دے تو بچی کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

”اس کے بعد تم کہو گی کہ روٹی کھانا چھوڑ دوں تا کہ وہ بھی بچی کھا لے......“ اس نے چلا کر کہا تھا۔

”بچی صرف میری نہیں ہے عباس، تمہاری بھی ہے، اس کے لیے میں نے تو نہیں کمانا، تم ہی گھر سے کمانے کے لیے نکلتے ہو اور پھر سگریٹ کون سا کوئی اچھی چیز ہے جو تم درجنوں کے حساب سے پھونک ڈالتے ہو!“ اس نے کوشش کی تھی کہ نرمی سے بات کرے۔

”تو کیا سگریٹ کا خرچ تمہارا باپ دیتا ہے......؟“ اس نے ناشتے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

”اچھا چلو اتنا غصہ ٹھیک نہیں...... ناشتا کرو!“ اس نے کہا تو وہ اور بھی بپھر گیا، اس کے چمکارنے پر ناشتے کی ٹرے کو غصے کے اظہار کے طور پر پرے پھینکا۔ وہ اس کے جانے کے بعد بھی رزق کی اس بے قدری پر روتی رہی، خود وہ رات کی بچی کھچی کھا کر بھی اپنا پیٹ بھر لیتی تھی مگر اسے تازہ ناشتا بنا کر دیتی کہ وہ محنت مزدوری کرتا تھا اور اسے ضرورت بھی تھی کہ مرد تھا اور وہ اس رزق کو اس طرح پھینک کر گیا تھا کہ اسے گھر میں کوئی دوسرا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

رو دھو کر وہ اٹھی اور روٹی اٹھا کر اسے جھاڑا، جہاں زیادہ مٹی لگ گئی تھی ان حصوں کو توڑ کر الگ کیا اور اچار کے ساتھ اسے زہر مار کرنے لگی، زرینہ روئے جا رہی تھی۔ اس نے اسے گود میں لیا اور اپنی حالت کی پروا کیے بغیر اس کی بھوک مٹانے کو اسے اپنے سینے سے لگا لیا، وہ چپ ہو گئی۔ ماں ایک بچی کچھی، سوکھی روٹی کھا کر اس پر کئی انفوس کو پال رہی تھی، آنسو بہہ بہہ کر اس کا دامن بھگو رہے تھے...... اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ماتا پتا

کی بددعاؤں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

اس نے بچی کو سلایا اور دل میں تہیہ کیا کہ وہ گھر سے نکل کر کوئی نہ کوئی ایسا کام محلے میں پکڑ لے گی کہ جس سے اس کے حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔ اپنی بادامی رنگ کی چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا، اس کا ارادہ یہی تھا کہ خود تو گھر گھر نہیں جائے گی، اپنی پڑوسن کے پاس جا کر اس سے کہے گی کہ اسے گھر بیٹھے کام لا دیا کرے۔ بچی کو اچھی طرح سرہانے تکیے رکھ کر محفوظ کیا، زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں اسے لوٹ آنا تھا۔ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے وہ دروازے کے پاس پہنچی، اسے ہلکا سا دھکیلا، اس کے خیال میں تو اس دروازے کو عباس کے جانے کے بعد کھلا ہی ہونا چاہیے تھا مگر دروازہ بند تھا۔ اس نے ذرا زور سے دھکیلا، اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا، دروازہ باہر سے بند تھا، اسی طرح جیسے وہ پہلے پہل بند کر کے جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے سے اس نے باہر سے دروازہ بند کرنا بند کر دیا تھا، جب سے اس زہرہ نے اس سے کہا تھا کہ کسی وقت کوئی اچانک ضرورت پڑ سکتی ہے۔

''تو کیا اسے مجھ پر اعتبار نہیں رہا......'' اس نے سوچا اور دروازے سے ٹیک لگا کر رونے لگی۔

☆☆☆

کلثوم چوہدرانی کے بلاوے پر ان کے پاس گئی تو انہوں نے اسے پیشکش کی کہ وہ اسے اناج وغیرہ بھجوا دیں گی تاکہ اسے اس حالت میں کام نہ کرنا پڑے۔

''میں ایسے کیسے آپ سے مدد لے سکتی ہوں، میرے ماں باپ نے عمر بھر محنت کی کمائی کھائی اور ہمیں بھی یہی درس دیا، قسمت سے دن خراب آ گئے ہیں، میں تب بھی فاقے کر لوں گی مگر خیرات میں کچھ نہیں لوں گی!'' اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکا۔ کیسی بے بسی کا عالم اس پر آ گیا تھا، باپ کو تو اس نے ہوش سنبھال کر دیکھا ہی نہ تھا۔ ماں نے عمر بھر مرغی کی طرح پروں تلے چھپا کر رکھا۔ بھائی نے اسے اتنا مان دیا کہ اس پر کسی کی عمر بھر بری نظر نہ پڑی تھی اور اب کہاں تھا وہ بھائی...... اسے عمر بھر کے لیے سزا دے گیا تھا، کاش وہ دیکھ سکتا کہ وہ کیا کیا بھگت رہی تھی، جس گھوٹو کو دیکھ کر لوگ دور سے راستہ بدل لیتے تھے، جس کے پاس سے آنے والی ناگوار بو سے سارا گاؤں بھاگتا تھا، اس گھوٹو کے ساتھ کو وہ کس طرح برداشت کرتی تھی، ایک ایسا زہر جو اسے اپنے بھائی کے کیے کی سزا کے طور پر پینا تھا، وہ جو اس کا بھی دشمن تھا اور ایک ایسے سانپ کی طرح تھا جو اپنے بچے کو بھی کھا سکتا تھا۔

''خیرات سمجھ کر تھوڑی دے رہے ہیں ہم یہ سب، یہ تو تمہارے ماں، باپ کے ان احسانات کا بدلہ ہے جو انہوں نے ہم پر کیے ہیں......'' انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کون سے احسانات؟'' وہ کچھ نہ سمجھی تھی۔

''ارے ہم سب اور ہمارے بچے اور ان کے بچے...... سب نے قرآن پاک تمہاری دادی پھر تمہارے ابا اور پھر بی بی جی سے ہی تو پڑھا ہے......'' انہوں نے وضاحت کی۔ ''اور یہ ان کا ایسا احسان ہے کہ ہم پر ان کی بیٹی کی نگہداشت فرض ہو جاتی ہے!''

''انہوں نے جو کچھ کیا اس کے بدلے میں یقیناً اس وقت ان کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا رہا ہوگا چوہدرانی جی! جیسے میں نے اپنے ہوش میں اماں کو دیکھا ہے کہ ان کا کپڑا لتا، اناج وغیرہ سب آپ ہی لوگ مل کر کرتے تھے

سارے گاؤں والے...... اب میں کس چیز کے بدلے یہ سب کچھ لوں؟''

''باؤلی ہوئی ہو کیا، معراج بتا رہی تھی کہ تم ٹھیک نہیں رہتی ہو، بس تم گھر بیٹھو...... بے فضول کی بحث نہ کرو!'' انہوں نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''آپ کے مجھ پر پہلے کون سا کم احسانات ہیں......'' اس نے ہولے سے کہا۔

''اس میں احسان کی کیا بات ہے، حافظ کرم اللہ کے خاندان کے ہماری پشتوں پر احسانات ہیں!'' انہوں نے جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر کہا جس میں محبت نہیں بلکہ دنیا دکھاوے کا زیادہ عمل دخل تھا۔

''آپ کا یہ احسان ہی کافی ہے کہ مجھے عمر بھر کے لیے پل صراط پر چلنے پر مجبور کر دیا آپ لوگوں نے......'' وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

''کچھ کہا تم نے؟'' انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''جی......'' وہ چونکی۔ ''میں نے...... میں نے تو کچھ نہیں کہا!'' اگر جو وہ اس کی بات سن اور سمجھ لیتیں تو اس وقت شاید ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو چکا ہوتا۔ ''چلتی ہوں......'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اناج بھجوا رہی ہوں، اسے لوٹانا مت...... ہماری بے عزتی ہو گی!'' اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔

☆☆☆

''یار ذرا سانس لے کر بولو، ہولے سے بات کرو تو مجھے کچھ سمجھ میں آئے کہ تم کہہ کیا رہے ہو؟'' منشی نے آنے والے کو گھرکا۔

''وہ جی ہے نا وہ لمبا سا لڑکا......'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہی پھر بات شروع کر دی۔

''کون لمبا سا لڑکا؟''

''وہ جی جو نیا آیا ہے، گورا سا......'' پھر وضاحت کی گئی۔

''کیا ہوا اس کو؟'' منشی نے غصے سے پوچھا۔

''وہ جی چھت سے گر گیا ہے، کوئی پھٹا ٹوٹا ہوا تھا، اس پر اس کا پاؤں پڑا اور......''

''اوہو!'' وہ جھٹکا کھا کر اٹھے۔ ''کون سا لڑکا ہے یہ، نام کیا ہے اس کا؟'' انہوں نے اس مزدور کے ساتھ بھاگتے ہوئے پوچھا۔

''باسا جی...... باسا نام ہے اس کا!''

☆☆☆

''سچ کہہ رہی ہوں سرکار......'' اس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے چوہدری صاحب کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو یہ حرکت کی نہیں......'' ان کا انداز کچھ سوچنے والا تھا۔ ''اگر بابر نے ایسا کیا ہے تو مجھے اس کو کہنا پڑے گا کہ اس پر میری نظر ہے اس لیے وہ میرے راستے سے ہٹ جائے...... اور اگر یہ حرکت تائے کے پاؤں کی ہے تو پھر بہت بڑا فساد ہونے کا خطرہ ہے......''

''پر سرکار انہیں کیسے معلوم کہ سرکار کی اس پر نظر ہے......'' اس نے خوشامدی لہجے میں کہا تھا۔

''نظر۔'' انہوں نے اسے گھورا۔ ''نظر نہیں کم بخت...... میں نکاح کرنا چاہتا ہوں اس سے!''

”وہی تو......“ اس نے سہم کر کہا۔ ان مالکوں کے انداز ایسے ہی تھے، ذرا سی بات پر پل میں تولہ ماشہ ہو جاتے تھے۔ ذرا دیر پہلے کتنی لگاوٹ سے اس کے کندھوں پر ان کا ہاتھ دھرا تھا، اس سے قبل ان کے ساتھ کتنے ہی قربت کے لمحات بھی آئے تھے اسی لیے تو وہ ان کی سر چڑھی ملازمہ کے طور پر جانی جاتی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اکبر علی کی خاص ملازمہ کو کچھ کہہ سکتا۔ کام بھی وہ اپنی مرضی سے کرتی اور یہاں تک کہ اسے فاخرہ بھی کچھ کہتی تو وہ مصروفیت کا بہانہ پیش کر دیتی۔

”تو کسی طرح جا کر اس سے پوچھ سکتی ہے کہ سارا معاملہ کس طرح ہوا تھا؟“ اکبر علی نے اپنا لہجہ بدل لیا تھا۔

”مم...... میں...میں کیسے جا سکتی ہوں وہاں؟“ اس نے تھوک نگل کر کہا۔

”کیوں، تیرے پیروں میں چھالے ہیں کیا؟“ غصے میں پوچھا گیا۔

”وہ سرکار...... مجھے اس کی اماں سے بہت ڈر لگتا ہے، بہت غصے والی ہے وہ!“

”تجھے شاید میرے غصے کا اندازہ نہیں ہے۔“ اور اس کو درست اندازہ کروانے کے لیے انہوں نے ایک زوردار لات اسے رسید کی، وہ ان سب کی عادی تھی، اسے معلوم تھا کہ یہی لات رسید کرنے والا کسی وقت اس کے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو بھی پونچھتا ہے۔

”جو حکم سرکار......“ اس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہا تھا۔

”اور ہاں۔“ انہوں نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی۔ ”مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر تمہیں جان سے بھی مار دیا جائے تو تم نے یہ نہیں بتانا کہ تمہیں میں نے یہ سب دریافت کرنے کو کہا ہے۔“

”جانتی ہوں سرکار۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”آپ کی پرانی نمک خوار ہوں!“ اور اس کی اسی بات پر تو اکبر علی کو سب کچھ بھول جاتا تھا یہ بھی کہ وہ ان کی ملازمہ تھی اور اس کا تعلق نیچ خاندان سے تھا، تھوکے ہوئے کو چاٹتے وقت وہ اس بات کو ہمیشہ بھول جاتے تھے۔ برآمدے میں قدموں کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے اس کو فوراً پرے دھکیلا، وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے بغلی دروازے سے باہر نکل گئی۔

”اکبر علی۔“ چوہدرانی شکیلہ کو ہمیشہ سے دستک دیے بغیر سب کمروں میں جانے کی عادت تھی۔ ”ایک بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں تم سے بیٹا!“ انہیں وہ ضروری بات اس سے قبل ہی معلوم ہو چکی تھی تاہم ماں کے منہ سے سن کر وہ لاعلمی کے تاثرات چہرے پر سجائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

”عمران کتنا چڑچڑا ہو گیا ہے۔“ جہانگیر اسے کافی دیر سے بہلانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے مگر وہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا، ریں ریں کیے جا رہا تھا۔

”دودھ چھڑوانے سے بچے اس طرح ہو جاتے ہیں!“ رابعہ نے شوہر کو بتایا۔

”تو کیا اس کا حل یہ ہے کہ مائیں بچوں کو عمر بھر دودھ پلاتی رہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”ارے نہیں بھئی، ہو جاتے ہیں بچے چڑچڑے پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ اصل میں ہم دونوں اناڑی ہیں، اس لیے ہمیں اس کو سنبھالنا نہیں آ رہا......“

”تو پھر کسی سیانے سے پوچھو کہ کس طرح اس کی چڑ کم ہو۔“ انہوں نے تجویز دی۔ ”میرا بیٹا تو رونے والا بچہ ہی نہیں تھا!“ انہوں نے پیار سے اسے اپنے سینے سے لگالیا، وہ چپ ہونے کے بجائے اور بھی زور زور سے رونے لگا۔

”لائیں اِدھر مجھے دے دیں۔“ رابعہ نے اسے لے لیا۔

”کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے اسے دودھ پلا ہی دو جب تک ممکن ہو، اس طرح تو رو رو کر اور اوپر کا دودھ نہ پی کر یہ کمزور ہو جائے گا!“ انہوں نے تشویش سے کہا۔

”میں خود کو بہت کمزور محسوس کرتی ہوں اور اوپر سے الٹیوں نے میری طبیعت نڈھال کر رکھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی......“

”کیا سوچ رہی ہو تم؟“

”میں سوچ رہی تھی کہ اس کی دادی اماں کو بلا لیں، ان سے یہ سنبھل بھی جائے گا اور مجھے بھی کچھ آسرا ہو جائے گا۔“

”اپنے آرام اور اپنی سہولت کی خاطر ہم بابو جی کو کیوں تکلیف میں ڈالیں، میں ان سے بات کرتا ہوں اور تم ماں بیٹے کو گاؤں بھجوا دیتا ہوں تھوڑے عرصے کے لیے......“ انہوں نے تجویز دی۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ رابعہ نے فوراً خوشی سے کہا مگر ساتھ ہی اسے اپنی بابو جی سے آنے سے قبل آخری ملاقات یاد آ گئی جب انہوں نے اس کو بتایا تھا کہ جہانگیر نے ان سے شجاع کو ساتھ لے جانے کی بات کی ہے اور انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ شجاع کی کارروائیاں حد سے بڑھ گئی تھیں اور اسی کے خاص آدمی نے انہیں بتایا تھا کہ ان کے مرحوم منشی کی جوان بیٹی پر اس کی نظر تھی اور وہ اسے اغوا کروانا چاہتا تھا۔ یہی بات اسے زرتاج سے بات کر کے بھی معلوم ہوئی تھی کہ اس کا خاص آدمی فیضی اس غرض سے زرتاج کے گھر کی چھت سے کودا تھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ...... وہ چاہتا تو کامیابی سے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا جو اس کی اپنی رضا اس میں شامل ہوتی۔ اس نے جان بوجھ کر اس طرح کام کیا کہ ارد گرد کے لوگ خبردار ہو گئے۔ وہ کامیاب ہو جاتا تو...... وہ تو سوچ کر ہی کانپ گئی تھی کہ اس معصوم چہرے والی لڑکی کا کیا ہوتا، عزت بچانے کی خاطر شاید وہ اپنی جان پر کھیل جاتی یا پھر بے عزت ہو کر خودکشی کر لیتی۔

رابعہ نے اپنے گاؤں کے کئی ایسے قصے سن رکھے تھے جن میں ان بااختیار چوہدریوں کے ہاتھوں رسوا ہونے والی لڑکیوں کا انجام کیا ہوا تھا، وہ خودکشی کر لیتیں یا پھر ان کے ماں باپ ان کا گلا گھونٹ کر انہیں مار ڈالتے...... کئی واقعات میں ماں باپ اپنا منہ چھپانے کی خاطر گاؤں بدر ہو گئے تھے اور جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ اسے یاد تھا وہ واقعہ بھی جس میں ایک گھرانے کی نوجوان لڑکی تعلیم کے حصول کے شوق میں شہر گئی تھی اور کبھی پلٹ کر نہ آئی تھی...... وہ ایک عیسائی گھرانہ تھا اور پھر اس لڑکی کے گھر والے سب کچھ بیچ باچ کر ملک ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر کاجل اور دیا کے واقعے کو کتنا عرصہ ہوا تھا بھلا۔

”مگر مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھی میں بابو جی سے بات کرتا ہوں کہ وہ شجاع کو شہر بھیج دیں یا تم لوگ گاؤں آ جاؤ تو بابو جی ناراض ہونے لگتے ہیں...... مجھے لگتا ہے کہ شاید تم نے ان سے کچھ کہا ہے یا وہ خود ہی سمجھتے ہیں کہ تم شجاع کو پسند نہیں کرتی ہو!“

”میں نے کب ایسی کوئی بات کی ہے؟“ اس نے جہانگیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”یہ تو میں نے نہیں کہا کہ تم نے کوئی بات کی ہے...... صرف ایک خیال ظاہر کیا ہے!“ جہانگیر نے فوراً کہا۔ ”مگر جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم شجاع کو ناپسند کرتی ہو......“

”اور کیا؟“ اس نے تنگ کر کہا۔ ”کہہ لیں اور بھی جو کچھ کہنا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تو جہانگیر کو اپنی بات کی منفی شدت کا احساس ہوا۔ اسے اگر اس بات کا شائبہ بھی تھا کہ رابعہ، شجاع کو کسی وجہ سے ناپسند کرتی ہے تو اسے اس کے لیے کسی مناسب طریقے سے بات کرنی چاہیے تھی۔ شجاع کے لیے رابعہ کی سب سے بڑی بہن کی بیٹی کا رشتہ پوچھے جانے کا ارادہ تھا مگر رابعہ نے منع کر دیا تھا، اس کا کہنا تھا کہ وہ بچی مختلف ماحول کی پلی بڑھی ہے اور اگر رشتہ بھجوا کر ان کی طرف سے انکار ہوا تو شجاع اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لے گا۔

رابعہ کی اس رائے سے کسی کو بھی اتفاق نہ تھا اس لیے انہوں نے رابعہ کو ہی یہ ذمے داری سونپی کہ وہ اپنے طور پر اپنی بہن نادرہ سے بات کر کے اس کی رائے جان لے تو... رابعہ نے بجائے نادرہ کے اپنی ماں سے بات کی اور انہوں نے نادرہ سے اور جواب وہی تھا جو کہ رابعہ پہلے بتا چکی تھی، نادرہ تو اس بات پر بھڑ ہی اٹھی تھی کہ اس کی معصوم سی بچی کے لیے ممانی کو اپنا وہ چھٹا ہوا بدمعاش بیٹا مناسب کیسے لگا...... مگر ماں نے سمجھایا کہ بیٹیوں کے لیے دستِ سوال کوئی بھی دراز کر سکتا ہے، رشتہ دینا یا نہ دینا ان کے ماں باپ کی اپنی مرضی ہوتی ہے مگر ایسی بات کہنا کہ کسی کی مجال کیسے ہوئی یا اپنا آپ نظر نہ آیا، درست رویہ نہیں ہے۔

رابعہ کی ماں کا خیال یہ بھی تھا کہ رابعہ اپنے گھر میں سکھی تھی اور ایسا نہ ہو کہ کوئی اور رشتہ طے ہو جو کہ نہ نبھ سکے تو رابعہ کے گھر کے حالات بھی خراب ہوں۔ وہ تو خود اس حق میں نہ تھی اور اس نے نادرہ کا جواب جہانگیر کو بتا دیا تھا مگر جہانگیر کے دل میں گرہ سی پڑ گئی تھی کہ رابعہ کا اپنا ارادہ ہی نہ تھا اس لیے اس نے بہن کے ساتھ بات ٹھیک سے نہیں کی ہوگی۔

جہانگیر، رابعہ سے بہت محبت کرتا تھا مگر ایک عادت اس میں بری تھی کہ لمحوں میں وہ اس کے بارے میں منفی رائے قائم کر لیتا تھا، اس کی وجہ کا رابعہ کو علم نہ تھا۔ جانے کیوں وہ ذرا ذرا سی بات پر شک میں مبتلا ہو جاتا یا کوئی نہ کوئی ایسا مفروضہ قائم کر لیتا کہ وہ اس کا دل ہی صاف نہ کر پاتی۔ خاموش ہو جاتی اور کچھ وقت گزرتا تو اس کا ذہن خود ہی صاف ہو جاتا تھا یا شاید وہ بھول جاتا تھا کہ اس نے کس طرح اپنے الفاظ سے رابعہ کو تکلیف پہنچائی تھی۔ رابعہ بہت صابر اور سمجھ دار لڑکی تھی، شوہر کے مزاج کو سمجھتی تھی اور ایسی کسی بات سے دل میں رنجش آتی بھی تو چہرے سے اس کا اظہار نہ ہونے دیتی تھی۔

”جو آپ کو مناسب لگتا ہے کر لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں، بابو جی اور اماں سے بات کر لیں، جس طرح وہ کہتے ہیں میں اسی طرح کر لوں گی......“ اس نے فرمانبردار بیویوں کی طرح کہا تو جہانگیر کو اپنی چند لمحے قبل کی بات پر پچھتاوا ہوا اور وہ شرمندگی کا اظہار کرنے لگا۔

”کوئی بات نہیں، کون سا ایسا پہلی دفعہ ہوا ہے یا اس کے بعد نہیں ہوگا!“ اس نے مسکرا کر کہا، اسے شوہر کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات دیکھنا بالکل پسند نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس ایک عادت کے علاوہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔

''لاؤ میں اسے لٹا دیتا ہوں۔'' عمران ماں کی گود میں سو گیا تھا، جہانگیر نے اسے اٹھایا اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور اسے اس کے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ ''لیٹ جاؤ تم بھی آرام کرلو!''

''آپ نہیں لیٹیں گے کیا؟'' رابعہ نے سوال کیا۔

''نہیں...... میں ذرا منڈی تک جارہا ہوں اور یوں بھی دوپہر کی نیند مجھے پسند نہیں!''

''قیلولہ کرنا تو صحت کے لیے اچھا بھی ہے۔'' رابعہ نے تاویل دی۔

''ہم لوگ کون سا قیلولہ کا مطلب سمجھتے ہیں، لیٹتے ہیں تو گھنٹوں کی خبر لاتے ہیں...... یوں بھی دن اللہ نے کام کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کرنے کے لیے!''

''مگر آپ تو رات کو بھی آرام نہیں کرتے......'' اس نے شرارت سے کہا۔

''تم آرام کرنے ہی نہیں دیتی ہو!'' جواباً وہ بھی شوخ ہوئے۔

''اچھا اب آپ جائیں اور ہمیں آرام کرنے دیں!'' اس نے انہیں دھکیلا۔

''میں نکلتا ہوں تو تم دروازے اندر سے بند کرلو۔'' جہانگیر نے کہا۔

''کوارٹر میں ملازم ہیں نا......''

''ملازم ہیں پھر بھی تم گھر کا خیال رکھا کرو اور خاص طور پر جب تم نے آرام کرنا ہے تو دروازے کھلے نہ چھوڑا کرو...... برے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا، جانے کب کس کی نیت خراب ہوجائے!'' وہ کہہ رہا تھا اور رابعہ کے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔

اس سے زیادہ کون اس بات کو سمجھ سکتا تھا کہ کھلے دروازے، بدنیتوں کے لیے آسان ہدف ہوتے ہیں...... مگر وہ یہ بات اپنے شوہر کو کیسے بتاسکتی تھی، اس کا وہی شوہر جو اس بات پر اس سے نالاں رہتا تھا کہ وہ شجاع کو ناپسند کرتی ہے، جو اسے علم ہوتا کہ شجاع کو کس وجہ سے ناپسند کرتی ہے اور اب کیوں اس سے دور بھاگتی ہے تو وہ شاید بھائی کو مارنے پر ہی تل جاتا...... بھائی جو حیوانیت کے اس درجے پر تھا کہ اسے اپنے محترم رشتوں کی پہچان ہی نہ رہی تھی۔

''چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں تم سے بات کررہا ہوں اور تم جانے کہاں کھوئی ہوئی ہو؟''

''جی......؟'' وہ چونکی۔ ''میں...... میں یہیں ہوں!''

☆☆☆

''دیکھیں پرویز میاں......'' انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے انتباہ کیا۔ ''جہاں آرا سب کچھ برداشت کرسکتی ہیں، بدتمیزی اور بدتہذیبی نہیں!''

''میں بدتمیزی کررہا ہوں نہ بدتہذیبی!'' پرویز نے لہجے میں نرمی برقرار رکھی، اسے اندازہ تھا کہ اس کا پالا ایک دبنگ عورت سے پڑا ہے اور اس کے گرگے اسے اس کے گھر سے اٹھا کر باہر بھی پھنکوا سکتے ہیں۔ ''پوچھ رہا ہوں کہ قائم علی سے کیا ڈیل ہوئی ہے، آخر میں اس میں برابر کا حصے دار ہوں، اسے یہاں میں ہی پھانس کر لایا تھا!'' اس نے دعویٰ کیا۔

''تم قائم علی کو نہیں، ہمارے لیے شامت اور مصیبت کو دعوت دے کر یہاں لائے تھے، جانتے ہو تم کہ

اس نے کیا کیا ہے؟''

''بائی جی...... قائم علی تو ایک عام اور دکھی سا مرد ہے اور ایسے ہی لوگ آسانی سے ہمارا شکار بنتے ہیں مگر تمہاری بیٹی اس غلطی میں برابر کی شریک ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ہی قائم علی کو مجبور کرلیا۔'' پرویز نے اسے آئینہ دکھایا جس پر انہیں سر سے لگی اور پاؤں پر بجھی۔

''تم بھی تو ہمارے ہاں آتے رہتے ہو، شکل صورت میں قائم علی سے بڑھ کر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہو، تم پر کیوں نہیں کبھی کسی کا دل آیا؟'' انہوں نے چوٹ کی۔

''بائی جی...... یہ میرا کاروبار نہ ہوتا تو شاید ایسا بھی ہوجاتا مگر مچھلی بیچنے والا مچھلی سے محبت کرنے لگے تو روٹی کیا وہ دریا کے کیچڑ سے کھائے گا؟'' جوابی چوٹ اس سے بڑھ کر تھی۔

''جو کچھ بھی ہوگا...... لکھت پڑھت کے ساتھ ہوگا، جو کچھ ہمیں ملے گا، اس کا آدھا تمہارا ہوگا!'' جہاں آرا نے مزید اس کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا۔

''کوئی ترپ کی چال نہ چلنا بائی جی......'' اس نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''جو کچھ تمہیں ملے گا، اس کا نصف نہیں بلکہ جو کچھ بھی قائم علی سے لیا جائے گا، اس کا نصف...... خواہ وہ الماس کے نام پر ہو، تمہارے یا پھر الماس کے بچے کے نام پر۔'' اس نے کہا تو وہ چونکیں، اس کا مطلب ہے کہ اس کی ملاقات قائم علی سے ہوچکی ہے اور وہ اسے ساری تفصیل بتاچکا ہے۔

پرویز کے کمیشن سے ہی تو بچنے کے لیے انہوں نے جائداد بچے کے نام پر لگانے کو کہا تھا...... وہ ان کے اندازے سے زیادہ چالاک نکلا تھا، وہ خود کو دنیا میں سب سے زیادہ گھاگ سمجھتی تھیں مگر اب تک انہوں نے پرویز کو سمجھا ہی نہ تھا، نہ ہی اس سے قبل قائم علی جیسا شکار ہاتھ آیا تھا۔

''ابھی تو یہ بھی علم نہیں کہ لڑکا ہوگا یا کہ لڑکی...... دونوں صورتوں میں حالات مختلف ہوں گے۔ ہمیں لڑکے کو رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی......'' انہوں نے بات بدلی۔

''رکھ لینا لڑکا...... کام آئے گا بائی۔'' اس نے آنکھ مار کر کہا۔

''ہم نے لڑکے کا کیا کرنا ہے؟'' انہوں نے نخوت سے کہا۔

''یہ تمہارا دلی تو اب گیا کام سے...... ابھی پیچھے کئی پڑی ہیں تمہاری......''

''کیوں کیا ہوا دلی کو؟'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔

''دلی کو عشق ہوگیا ہے بائی...... اور یہ ایسا روگ ہے جو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا!'' اس نے کہا اور اٹھ کر چل دیا، اسے معلوم تھا کہ اس نے چنگاری چھوڑ دی ہے، اب وہ خود ہی اس سے پوچھ تاچھ کرلے گی۔

''رکو۔'' اس نے پکارا۔ ''کیا بات کررہے ہو اور کس کی؟''

''میں نے جو بتانا تھا، بتادیا...... اب باقی تفصیل اپنے دلی سے پوچھ لینا بائی، میں ذرا جلدی میں ہوں!''

☆☆☆

آنکھ کھولی تو اسے چند لوگوں کے سوا اپنے اردگرد سب مسلمان ہی نظر آتے تھے اور اپنے گاؤں میں انہی کی مسجدیں۔ آٹھ دس دیہات میں بھی کوئی گرجا نہ تھا، ہر اتوار کو ماں باپ کے اصرار پر وہ بائبل کھول کر بیٹھ

جاتی مگر اس کا ایک حرف بھی... پڑھ اور سمجھ نہ پاتی۔ اسے اپنے محلے سے آنے والی تلاوتِ قرآن کی آوازیں مسحور کر لیتیں، مسجد سے اذان کی آواز پر اس کا دل کھنچتا، اس کا دل چاہتا کہ اپنی مسلمان سہیلیوں کی طرح وہ بھی نماز پڑھے، اللہ کو اپنے دل میں محسوس کرے مگر اس کے اور ان کے بیچ مذہب کی دیوار حائل تھی۔ اس کا گھرانہ گاؤں کے چند عیسائی گھرانوں میں سے ایک تھا۔

''اماں ہم نماز نہیں پڑھ سکتے؟'' وہ معصومیت سے پوچھتی، وہ معصومیت جو اس کی ماں کو دہلا دیتی تھی، اسے اس کی باتوں سے بغاوت کی بو آتی، اپنے مذہب سے نفرت کی۔

''نماز مسلمان پڑھتے ہیں میری اور تم مسلمان نہیں ہو......'' وہ سختی سے کہتی۔

''میں مسلمان کیوں نہیں ہوں؟'' وہ جرح کرتی۔

''کیونکہ تم ایک عیسائی کے گھر پیدا ہوئی ہو۔'' ماں کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

''کسی کے گھر پیدا ہونے کا اختیار تو ہمارے پاس نہیں ہوتا مگر اپنے لیے مذہب چننے کا اختیار تو ہمارے پاس ہوتا ہے نا؟'' اس کے اس سوال پر اس کی ماں لرز جاتی۔

''تم یہ باتیں کہاں سے سیکھتی ہو، میں اس کے بعد تمہارا گھر سے نکلنا اور سہیلیوں سے ملنا جلنا بند کر دوں گی!'' ماں نے دھمکی دی مگر اسے اندازہ ہوا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اس کی سہیلیوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو اسے اپنے مذہب کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی، وہ سب عام گھرانوں کی ایسی لڑکیاں تھیں جن کا مذہب کا علم فقط قرآن پڑھ لینے کی حد تک ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کو قرآن کے شاید ایک لفظ کے ترجمے کا علم نہ ہوتا۔

وہ تھوڑی بہت اردو پڑھ لیتی تھی اور اس کا ذریعہ بائبل کا اردو میں پڑھنا یا پھر سنیتا آنٹی کی لائی ہوئی وہ دلچسپ کتابیں ہوتی تھیں جن میں خوب صورت اور باتصویر کہانیاں ہوتیں، پریوں کی اور شہزادیوں کی۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر وہ خود کو ان کہانیوں کا ایک کردار محسوس کرتی۔ مگر اسے یہ لگتا تھا کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوئی ہے اور جس ماحول میں رہ رہی تھی وہ اس کے لیے نہ تھا...... وہ کسی اور ہی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

اسی لیے تو اس کی ماں نے فیصلہ کیا کہ اسے اس ماحول سے نکالے، گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی شاید اسی لیے تو وہ ان سے متاثر تھی۔

''یہاں سے نکلے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس کی ماں نے اس کے باپ کو مشورہ دیا تھا۔

''مگر ہماری بیٹی ہے ہم اس کو کہاں بھجوا سکتے ہیں؟ یا تو ہم خود بھی یہاں سے چلے جائیں!'' اس نے حیرت سے کہا تھا۔

''تمہارا یہاں جما جمایا کام ہے، اسے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟'' اس نے فوراً نفی کی۔ ''شہر میں ہم کہاں نئی جگہ پر جا کر اتنی جلدی سیٹ ہو سکتے ہیں...... اسے بھجوا دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ ٹھیک ہو جائے گی تو اسے واپس لے آئیں گے!''

''مگر ہم اسے کہاں بھجوا سکتے ہیں اور کیسے؟'' اس نے ناراضی سے کہا۔

''سنیتا کے ہاں کوئی اولاد نہیں، وہ دونوں میاں بیوی اسے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں، ان کے ساتھ رہ لے گی جب تک ہم خود شہر نہیں جاتے...... کہہ رہی ہوں ابھی وقت ہے اسے سنبھال لیں ورنہ یہ مذہب تبدیل کر

لے گی اور ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گی، اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی ہیں، ان کے لیے بھی مسائل ہوں گے۔'' بات تو اس کے باپ کے دل میں نہیں بیٹھی مگر اسے سنیتا آنٹی کے ساتھ شہر بھجوا دیا گیا اور شہر آ کر سب سے پہلے آنٹی نے اس کا اسکول میں داخلہ کروایا اور اس کے لیے گھر پر ٹیوٹر کا بندوبست کر دیا جس نے اسے محنت سے پڑھایا اور وہ جو عمر کے حساب سے اپنی جماعت میں کافی بڑی تھی، سال میں دو دو دفعہ امتحان دیتے ہوئے جلد ہی اسکول سے کالج میں جا پہنچی۔

سنیتا آنٹی کے ہاں ماحول بہت کھلا ڈلا تھا، پارٹیاں اور محفلیں ان کی زندگی کا اہم حصہ تھیں، ان پارٹیوں میں وہ خود کو ایک فالتو چیز کی طرح محسوس کرتی۔ آنٹی کے بے حد اصرار پر اسے ان پارٹیوں میں شرکت سے الجھن ہوتی، اس کا دل ہی نہ چاہتا کہ وہ ان مخلوط محفلوں میں تتلیوں کی طرح چہکتی پھرے۔ بی اے کا امتحان دیا تو وہ ایک خوب صورت نوجوان لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس دل میں جڑ پکڑتا چلا گیا کہ اسے اپنے مذہب سے نفرت اور اسلام سے محبت کے باعث دیس نکالے کی سزا ملی تھی۔ اس کے دل میں یہ محبت گھٹنے کے بجائے بڑھتی چلی گئی اور اتنی ہی اپنے ماں باپ کے خلاف نفرت...... وہ تو اس کی محبت میں کھنچے اسے ملنے کو چلے آتے تھے مگر اسے ان کی موجودگی سے الجھن ہوتی اور وہ ان سے بے رخی سے ملتی۔ سنیتا آنٹی ہنس کر اس کے ماں باپ کو کہتیں کہ اب وہ ان کی بیٹی ہے اس لیے وہ اس سے محبت کی توقع نہ کریں مگر اس کے پاس اپنے گھر والوں سے نفرت کے کئی جواز تھے۔

اسے ڈیوڈ انکل کی نظریں بری لگتیں جن میں پاکیزگی نہ تھی، ایسی پاکیزگی جو اس باپ نما شخص کی نظر میں ہونی چاہیے تھی مگر وہ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے دلوں اور گھر سے دھتکاری ہوئی ایک معصوم لڑکی تھی جس کی خوب صورتی میں سادگی تھی اور وہ اپنے حسن سے غافل بھی تھی اور اسی بات نے سنیتا آنٹی کی محفلوں کی جان...... پی۔ کے نامی اس نوجوان کا دل لوٹ لیا تھا۔

تنہائی میں اس نے کبھی یسوع مسیح کو مدد کے لیے نہیں پکارا ہمیشہ اللہ سے سرگوشیوں میں بات کرتی۔ وہ چوری چھپے اسلام کے بارے میں پڑھتی اور چاہتی تھی کہ کوئی ایسا ملے جو اس کی مدد کرے اور وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے۔ اکیلے اتنا بڑا فیصلہ کرنا ممکن ہی نہ تھا اس کے لیے اسے کسی کی مدد درکار تھی اور وہ مدد اسے سائرہ آپی کی صورت میں مل گئی تھی...... وہ تو شکر ادا کرتی تھی کہ اس کے دل میں نوکری کا خیال آیا اور سنیتا آنٹی کی لاکھ مخالفت کے باوجود بھی اس نے ایک اسکول میں ملازمت کی درخواست دے دی جہاں اس کی ملاقات سائرہ آپی سے ہونا تھی اور انہوں نے اس کی پیاس بجھانا تھی۔

نہ صرف انہوں نے اس کو معلوماتی کتب دیں بلکہ یہ بھی سمجھایا کہ یہ فیصلہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں واپسی کے راستے بند ہوں...... وہ جتنا جانتی گئی...... اسے اتنا ہی یقین ہو گیا کہ وہ دل سے ہمیشہ سے مسلمان تھی اور ایک روز وہ سائرہ آپی کے ساتھ جا کر کلمہ گو مسلمان بن گئی...... اسے نام تبدیل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کیونکہ وہ پہلے سے مریم تھی۔

اس راز کو اسے اس وقت تک راز رکھنا تھا جب تک... وہ اس قابل نہ ہو جاتی کہ سنیتا آنٹی کو بتاتی کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے تو وہ اسے گھر سے نکالیں اور وہ سڑکوں پر نہ رُل جائے۔

اگر چہ سائرہ باجی نے کہا تھا کہ ان کا گھر حاضر ہے...... مگر وہ انہیں بھی کسی آزمائش میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اسے ماں باپ کی اتنی پروا نہ تھی، ان کی طرف سے اس کا دل باغی تھا کہ انہوں نے اس کی پروا کب کی تھی...... مگر اسے فکر تھی ڈیوڈ انکل جیسے کینہ پرور انسان کی طرف سے جو سائرہ آپی کا جینا محال کر سکتے تھے۔

''میں آؤں گی سائرہ آپی آپ کی طرف...... ضرور آؤں گی اگر کوئی اور چارا نہ رہا تو مگر فی الحال میں آپ کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی کہ آپ میری محسن ہیں اور میں آپ کے احسان کے بدلے آپ کو کیونکر آزمائش میں مبتلا کر دوں؟'' اس نے ان سے پیار سے کہا تھا۔

''تم میری بیٹی جیسی ہو، ثابت قدم رہنا...... اور مجھے تمہارے ساتھ کسی سزا کا حقدار ٹھہرنا پڑے تو میں اسے اپنے لیے اعزاز سمجھوں گی......'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

☆☆☆

''سلام دائی جی۔'' اس نے جاہلانہ انداز میں سلام کیا تو وہ تپ گئیں۔

''تمہیں کسی نے سلام کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کیا؟'' وہ غصے سے بولیں۔ ''ڈھنگ سے السلام علیکم کہو!''

''سلاما لیکم جی!'' اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' کہتے ہوئے ان کے لہجے میں نرمی در کر آئی تھی۔ ''تم حویلی کی ملازماؤں کو ادب آداب کون سکھائے اور وہ بھی تم جیسی......''

''کیا مطلب جی میرے جیسی؟'' اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''چل زیادہ فالتو باتیں نہ کر میرے ساتھ...... بتا کیوں آئی ہے؟'' انہوں نے اس سے سوال کیا۔

''وہ جی۔'' وہ ہکلا گئی، وہ تو سمجھی تھی کہ زرتاج اکیلی مل جائے گی تو اس سے بات کرنا آسان ہوگا، اس جیسی ساری ملازماؤں کے اندرونی حالات معراج کو معلوم تھے اور وہ ان سے بہت خار کھاتی تھی۔

''بات جلدی کر لڑکی، اتنا فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس، مجھے جانا ہے ابھی کہیں، کسی کا کوئی مسئلہ ہے!'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

''آپ جائیں دائی جی...... میں زرتاج باجی کو پوچھ لوں گی۔'' اس نے مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہوتے دیکھا تو فوراً بولی۔

''زرتاج کو بھی میرے ساتھ ہی جانا ہے تو اپنا مسئلہ مجھے بتا، زرتاج کو ابھی بہت سی چیزوں کے بارے میں علم بھی نہیں اور پھر تم نہ جانے کس قسم کے بے ہودہ کام کے لیے آئی ہوگی......'' انہوں نے یہ کہہ کر اس کی امید کو غارت کر دیا تھا۔

''وہ دائی جی۔'' وہ جلدی میں جھوٹی سچی کہانی بنا کر پیش کرنے لگی، گھاک تو تھی ہی مگر معراج جیسی عورت کو الجھانا اتنا آسان نہ تھا۔

''جس کام کے لیے آئی ہے، وہ بتا!'' ان کا کہنا تھا کہ اس کی ہڈیوں میں گرم موسم میں بھی سردی کی لہر دوڑ گئی۔

''یونہی آ گئی تھی جی!'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہاں سے گزر رہی تھی کہ دل کیا زرتاج باجی کو بھی دیکھتی چلوں!''

''زرتاج کیا چڑیا گھر کا جانور ہے جسے دیکھنے کا شوق ہو رہا تھا تجھے اور یہ کون سا راستہ ہے جہاں سے تو یونہی گزر رہی تھی؟'' انہوں نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

''مم...... میں۔'' وہ ہکلائی۔ ''میں کلثوم کی طرف جا رہی تھی، چوہدرانی جی کا پیغام لے کر کہ وہ جب تک ٹھیک نہ ہو جائے، کام پر نہ آئے۔'' اسے بہانہ سوجھ ہی گیا، معراج بی بی کو اس بات پر کوئی شک نہ ہوا۔ اگر چہ یہ بات شکیلہ چوہدرانی کی فطرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی مگر انہوں نے خاموشی اختیار کی اور اسے بتایا کہ انہیں جانے کی جلدی تھی۔

''جی میں جاتی ہوں۔'' کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے تم نے چوہدری اکبر علی مجھے۔''

☆☆☆

''سہیل بیٹا! تمہیں کالج سے چھٹی کون سے دن مل سکتی ہے؟''

''چھٹی؟'' اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ''اتوار کو ظاہر ہے!''

''اتوار کے علاوہ کسی دن کی بات کر رہی ہوں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے تمہیں ساتھ لے کر کہیں جانا ہے، اتوار کے دن ممکن نہیں ہوگا۔''

''کہاں جانا ہے امی؟'' اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔''

''مجھے؟'' اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ''کیوں، کس ڈاکٹر کے پاس......؟''

''تم کسی دن چھٹی تو لو بیٹا، میں تمہیں لے کر جاؤں گی تو تمہیں علم ہو جائے گا کہ کیوں اور کہاں جانا ہے!''

''مگر امی۔'' اس نے پھر بحث کی۔ ''مجھے کوئی بیماری لاحق نہیں ہے تو پھر میں کیوں ڈاکٹر کے پاس جاؤں؟''

''بے مقصد کی بحث ٹھیک نہیں ہوتی بیٹا، ہو سکتا ہے کہ میری کوئی دوست ڈاکٹر ہو اور میں تمہیں اس سے ملوانا چاہتی ہوں......''

''آپ کی دوست ڈاکٹر ہے تو آپ اسے خود مل لیں، میں نے کیا کرنا ہے آپ کی سہیلی سے مل کر؟'' اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

''ماں ہوں میں تمہاری بیٹا اور اگر میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ میری سہیلی کے گھر چلو تو تم اتنی بحث کیوں کر رہے ہو؟'' وہ چڑ کر بولیں۔

''حجت تو آپ کر رہی ہیں بے مقصد۔'' وہ جھنجلایا۔ ''جب میں نہیں چاہتا آپ کی کسی سہیلی سے ملنا تو کیوں اصرار کر رہی ہیں آپ...... میں نہیں ملنا چاہتا کسی سے بھی، خود سے بھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ اٹھیں اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گئیں، اس کا گھنے بالوں والا سر سہلانے لگیں۔

''کیا بات ہے میرے بیٹے، اپنی ماں کو تو بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے، کیا بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے؟''

''کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''میں کسی کو کیا بتاؤں، مجھے خود علم نہیں کہ

میرا مسئلہ کیا ہے۔'' وہ آنسوؤں سے رونے لگا، وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس کررہی تھیں...... سوچ رہی تھیں، یقیناً ہمارے اختلافات کی وجہ سے اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے مگر میں کیا کروں، میں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی ہوں...... اپنی ساری زندگی اس بچے کی خاطر میں نے اس شخص کے ساتھ گزار دی ہے جس نے...... انہوں نے درد سے آنکھیں میچ لیں، پرانی اور تلخ یادیں ان کے پردۂ دماغ پر اسی طرح کندہ تھیں جیسے کوئی تازہ زخم......

☆☆☆

''نینا۔'' انہوں نے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ پر لپیٹا۔ ''ہر وقت مصروف رہتی ہو اور مجھے وقت ہی نہیں دیتی ہو!''

''اسلم...... آپ کا بس چلے تو مجھے اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہ دیں، آپ کا تو رومانوی دور ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا...... اب ہمارا ایک بچہ بھی ہے، اس کے سامنے کچھ خیال کیا کریں!'' انہوں نے مسکرا کر ان کے شکوے کا جواب دیا۔

''ارے بھئی...... ابھی تو وہ اتنا ننھا سا ہے، اس بے چارے کو کیا علم کہ اس کے باپ کے دل کے کیا جذبات ہیں اور اس کی ماں ان کو کس طرح رد کردیتی ہے......''

''یوں تو نہ کہیں اسلم، میں ذرا فطرتاً اس طرح کی ہوں کہ آپ کی طرح کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی اور ذرا......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

''ذرا کیا؟'' انہوں نے شرارت سے کہا۔

''آپ جانتے ہیں اسلم میں ذرا احتیاط انداز پسند کرتی ہوں، ورنہ میری محبت کسی پیمانے سے تولیں تو آپ سے زیادہ ہی نکلے گی!''

''ارے اس سے زیادہ خوب صورت اظہارِ محبت میں نے آج تک کسی کے منہ سے نہیں سنا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسے اور انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹا۔

''جگا دیا نا اس کو۔'' سہیل کے رونے کی آواز سے انہوں نے اپنا وجود شوہر کی مضبوط گرفت سے چھڑوایا اور بچے کی طرف لپکیں۔

''ایک بچے نے تمہاری ساری توجہ مجھ سے چھین لی ہے تو مزید بچے آکر تو مجھے میرے حق سے بالکل ہی محروم کردیں گے۔'' مصنوعی ناراضی سے منہ بنا کر اسلم نے کہا۔

''کیسی باتیں کررہے ہیں اسلم۔'' وہ یوں شرما گئیں جیسے ان کی کل ہی شادی ہوئی تھی، ایسا ان کی فطرت میں تھا۔ وہ اسلم جیسی کھلی ڈلی طبیعت نہ رکھتی تھیں اور اس کی شدتوں کے جواب میں بھی اپنا مخصوص انداز قائم رکھتی تھیں اور اب تو بالخصوص سہیل کے سامنے...... حالانکہ وہ چند ماہ کا تھا، وہ اتنی محتاط رہتی تھیں جیسے کہ وہ سب کچھ سمجھتا ہو۔ اس کی شرارتی آنکھوں سے یہی محسوس ہوتا تھا۔

''اب تک ہے میرے ہاتھوں میں تیرے بالوں کی مہک بسی۔'' اسلم نے رومانوی انداز میں کہا تو وہ ہنس دی۔

''یہ میرے بالوں کی نہیں بلکہ اس صابن کی خوش بو ہے جس سے میں نے بال دھوئے تھے۔'' اس نے

ہنستے ہنستے جواب دیا۔

''نینا...... سارے موڈ کا ستیاناس کردیا...... اتنی غیر رومانوی بات کی کہ میرا منہ تو کیا حلق بھی کڑوا ہو گیا ہے!'' اس نے دل ٹوٹنے کی اداکاری کی۔

''آگئی جناب۔'' نینا سہیل کو واپس پنگھوڑے میں لٹا کر اسلم کے پاس آگئی۔ ''اب فرمائیں، کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''اب کچھ کہنے کا نہیں بلکہ عمل کا وقت ہے میری جان۔'' اس نے ہنس کر کہا اور نینا کی ہلکی سی ہنسی کی آواز ماحول میں جلترنگ بجانے لگی۔

''تمہارا یہ مہکا مہکا وجود مجھے بہت بھاتا ہے نینا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''مجھے تمہاری طرح صاف ستھری اور بجی سنوری عورتیں اچھی لگتی ہیں، تم ہمیشہ یونہی رہنا...... کبھی نہ بدلنا!''

''کیوں بدلوں گی میں اسلم...... میں ہمیشہ ایسی ہی رہوں گی، اگر تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چاہتے رہو گے تو!''

''میں بھی ہمیشہ تمہیں اسی طرح چاہتا رہوں گا نینا...... میری جان!'' اس کی محبت میں ایسی شدت تھی کہ نینا بسا اوقات گھبرا جاتی، کبھی ڈر جاتی...... کوئی کب تک کسی کو ہمیشہ اسی طرح چاہ سکتا ہے، پیار تو پانی کے جوار بھاٹے کی طرح ہوتا ہے...... زندگی میں کبھی کسی جذبے میں یکسانیت نہیں رہتی۔ اسی طرح محبت کی شدت میں بھی اتار چڑھاؤ آنا قدرتی بات ہے تو کیا اسلم کی محبت ہمیشہ ایک جیسی رہ سکتی ہے، کیا وہ اسلم کو ہمیشہ اسی طرح چاہ سکتی ہے؟

فیض نے کہا تھا اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا...... تو کیا وہ زندگی میں اسی طرح رہے گی، اسے اسلم کے علاوہ کوئی مصروفیت نہ ہوگی...... وہ تو ابھی خود کو سہیل کی طرف جھکا ہوا محسوس کرتی تھی، مزید بچے ہوں گے تو انہیں بھی اس کی توجہ چاہیے ہوگی پھر وہ اسلم کی محبت کی شدت کا جواب کیسے دے سکے گی؟

☆☆☆

''یہ اتنا پیارا سا چہرہ کہاں چھپا کر رکھا تھا آپ نے ابھی تک میڈم سنیتا؟'' اس نے نثار ہوتی نظروں سے مریم کو دیکھ کر کہا تھا۔

''پی۔کے!'' وہ مسکرائیں۔ ''بیٹی ہے میری!''

''نہیں نہیں...... مان ہی نہیں سکتا میں، آپ کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی، زیادہ سے زیادہ آپ سے چند برس چھوٹی آپ کی بہن کہیں تو مان لیتا ہوں!'' اس نے کاروباری خوشامد سے کہا۔

''بہت شرارتی ہو تم۔'' ایسی تعریف کس کو بھلی نہیں لگتی حالانکہ عمر میں سنیتا مریم سے پندرہ سولہ برس بڑی تھیں مگر اس وقت پی۔کے کے الفاظ نے انہیں شیشے میں اتار لیا تھا اور پی۔کے جانتا تھا کہ وہی وقت تھا چوٹ کا۔

''ملوا تو دیں، تعارف کروادیں اس ناچیز کا اپنی......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''بھانجی ہے میری۔'' انہوں نے کہا۔ ''آؤ ملواؤں تمہیں!'' اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس طرف بڑھیں جہاں مریم سب سے الگ تھلگ ایک نشست سنبھال کر بیٹھی تھی، سنیتا آنٹی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے بیٹھو بھئی، میں ایک خاص مہمان کو تم سے ملوانے کے لیے لائی تھی۔'' وہ واپس بیٹھ گئی۔ ''ان سے ملو، یہ ہیں مسٹر پی۔کے...... اور پی۔کے یہ ہے میری بھانجی...... مریم!''

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" پی کے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، جسے اس نے یوں نظر انداز کردیا جیسے اس نے دیکھا بھی نہ ہو۔

"ہیلو۔" اس نے مختصراً کہا۔

"کیا آپ نہیں کہیں گی کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہوئی؟" پی۔ کے نے شرارتی انداز سے پوچھا۔

"جی نہیں، میں جھوٹ نہیں بولتی...... اور مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ آپ ہیں کون، مجھے ایسی باتوں پر خوشی کیوں کر ہوسکتی ہے؟" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ آپ میرے بارے میں جاننا چاہتی ہیں؟" اس نے خوش فہمی سے کہا۔

"ارے نہیں...... ہرگز نہیں!" اس نے فوراً تردید کی۔ "صرف یہ بتادیں کہ پیکے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" اس کے پی۔ کے کو پیکے کہنے کے انداز سے سنیتا اور پی۔ کے دونوں کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا، کئی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور مڑمڑ کر دیکھنے لگے۔

"پرویز خان نام ہے میرا...... پی۔ کے تو آپ کی آنٹی جیسے مہربانوں نے بنادیا ہے ناچیز کو......" اس نے وضاحت کی، اب...... ہلکی سی مسکراہٹ مریم کے لبوں پر آکر دم توڑ گئی، اسے اپنا "پیکے" کہنے کا انداز انتہائی بے وقوفانہ لگا تھا۔

"معذرت چاہتی ہوں!" وہ اٹھی۔

"کوئی بات نہیں، مجھے خوشی ہوئی۔"

"کس بات کی؟" اس نے مڑکر پوچھا تھا۔

"آپ کسی وجہ سے مسکرائیں تو اور مجھے اندازہ ہوا کہ آپ مسکراتے ہوئے بھی اتنی ہی اچھی لگتی ہیں جتنی کھوئے کھوئے انداز میں۔" وہ اس کی تعریف پر خوش نہیں ہوئی تھی، اسے معلوم تھا کہ ڈیوڈ انکل کے کاروباری رابطے ایسے لوگوں سے ہی ہیں جن کا کام ہی خوشامد کرکے اپنا کام نکلوانا ہوتا ہے۔

☆☆☆

"ایسی گندی گندی ملازمائیں گھر میں رکھ چھوڑی ہیں تم نے نینا!" انہوں نے نینا سے جھنجلا کر کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ مجھے گندگی سے کتنی نفرت ہے......"

"کیا کروں اسلم، کام والی ساری اسی طرح کی ہوتی ہیں اور ہمیں ان کی صفائی یا گندگی سے کیا لینا، انہوں نے گھر کی صفائی کرنا ہوتی ہے، کون سا ہمارے برتنوں اور کھانے پینے کی اشیا کو ہاتھ لگاتی ہیں؟"

"تم کرسکتی ہوگی ان کو برداشت، میں نہیں کرسکتا۔" اس نے پھر کہا۔ "مجھے تو یہ سوچ کر ہی الجھن ہوتی ہے کہ کہیں وہ غسل خانے کی صفائی کرتے ہوئے میرے تولیے کو نہ چھوتی ہو، میرے کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کو ہاتھ نہ لگاتی ہو......"

"خدا کے لیے اسلم...... اتنا وہم اچھا ہے نہ کسی سے اتنی نفرت...... وہ بے چاریاں اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں دن بھر محنت مزدوری کرتی ہیں، ان کے پاس اگر صاف ستھرے لباس ہوں یا نہانے دھونے کا وقت تو وہ کب گندا رہنا پسند کرتی ہوں گی!" نینا نے اسلم کو اللہ کے قہر سے ڈرایا۔

"کپڑے گندے بھی ہوں تو انسان خود کو تو صاف رکھ سکتا ہے نا...... نینا سچ مانو اگر میں کسی کمرے میں اس کے پاس سے گزر جاؤں تو اس کے وجود سے اٹھنے والی بدبو سے میرا سر دکھنے لگتا ہے۔" اسلم نے سر تھام کر کہا۔

"کیا ابھی وہ یہاں سے ہوکر گئی ہے؟" نینا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں یہاں تو ابھی نہیں آئی مگر لگتا ہے کہ ساتھ والے کمرے کی صفائی کررہی ہے اور اس کی بو یہاں تک آرہی ہے......" اس کے لہجے میں اتنی حقارت تھی کہ نینا ڈر گئی، جانے اللہ تعالیٰ انسان کو یوں کسی دوسرے انسان سے نفرت کرنے پر کیسی سزا دے، سبھی اس کے بنائے ہوئے انسان ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ وہ ثریا کو سمجھائے گی کہ اپنی صفائی ستھرائی کا دھیان رکھا کرے اور اپنے کوئی پرانے کپڑے بھی اس کو دے گی کہ وہ پہن لیا کرے، کم از کم ان کے گھر پر کام کے لیے آتے ہوئے۔

"اچھا چلتی ہوں، میرا اسکول کا وقت ہورہا ہے......" اس نے تیار ہوکر کہا تھا۔

"سہیل کو تم جاتے ہوئے اماں کی طرف چھوڑ دوگی؟" اسلم نے پوچھا تھا۔

"مجھے دیر ہورہی ہے، آپ ہی دفتر جاتے ہوئے چھوڑ دیں، یوں بھی میں سائرہ کے ساتھ جاتی ہوں تو ہر روز اسے یہ کہنا اچھا نہیں لگتا کہ اماں کے گھر کی طرف سے ہوتے ہوئے چلو...... کبھی کبھار انسان مجبوری سے ایسا کرلے تو اور بات ہے!"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اسلم نے مختصراً کہا۔

"اللہ حافظ۔" اس نے لیٹے ہوئے سہیل کے گال پر پیار کیا اور نکل آئی۔ سہیل کی پیدائش کے بعد چھ ماہ کی چھٹی لی تھی اس نے اور اب اسے اسکول جانا ہی تھا۔

"اللہ حافظ۔" باہر کے دروازے کے پاس پہنچی تھی جب اسے اسلم کی آواز آئی اور وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"کیا بات ہے، کس بات پر اتنا مسکرایا جارہا ہے؟" سائرہ نے اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی سوال کیا تھا۔

"یونہی......" اس نے ڈرائیور کی موجودگی کے باعث مختصراً کہا تھا۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" سائرہ نے ہولے سے کہا۔

"ہاں کچھ تو ہے۔" وہ بھی جواباً مسکرائی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی گڑگڑ گڑ کی عجیب سی آواز آنے لگی اور پھر چلتی ہوئی گاڑی جھٹکے لے لے کر رک گئی۔

"کیا ہوا اشرف؟" سائرہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں جی، دیکھتا ہوں اٹھ کر......" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، سڑک پر دور دور تک کوئی اور گاڑی نہ تھی کیونکہ شہر میں گنتی کی چند گاڑیاں تھیں۔

"دیر ہوجائے گی اور خوب ڈانٹ پڑے گی۔" سائرہ نے کہا۔

"حاضری کا رجسٹر بھی اٹھالیا جائے گا اور ہم دونوں کی آج کی غیر حاضری لگ جائے گی......" نینا نے کہا۔

"اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ہم اسکول جائیں ہی نا۔" سائرہ نے کہا۔ "جب جاکر سارا دن کھپائی بھی کرنی ہے اور غیر حاضر بھی ہونا ہے کاغذات میں تو بہتر ہے کہ گھر واپس لوٹ چلیں۔"

"یہی ٹھیک ہے۔" نینا نے فوراً تائید کی۔

"اشرف۔" سائرہ نے اپنی طرف کا شیشہ اتار کر ڈرائیور کو آواز دی۔ "کچھ سمجھ میں آیا کہ کیا مسئلہ ہے؟"

"مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا بیگم صاحبہ۔" ڈرائیور نے کہا۔ "گاڑی لاک کر کے کسی مستری کو یہیں لانا پڑے گا کیونکہ گاڑی تو ایک انچ بھی نہیں ہل رہی۔ میں آپ کے لیے تانگا روکتا ہوں تاکہ آپ لوگ تو اسکول پہنچ سکیں!"

"اسکول کے لیے نہیں، گھر کے لیے تانگا روکو...... اب ہم اسکول نہیں جا رہے!" ڈرائیور سے کہہ کر اس نے شیشہ چڑھا دیا۔ "گھر چلتے ہیں، میری طرف چل کر اچھی سی چائے پیتے ہیں......"

"ارے نہیں سائرہ...... میری طرف چلتے ہیں، اس سے پہلے کہ اسلم، سہیل کو لے کر نکل جائیں، میری طرف ہی چائے پیتے ہیں۔"

"چلو پھر چائے ادھار کر لیتے ہیں، آج میں بھی اپنی سسرال کا چکر لگا لوں، کافی عرصے سے جانا نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ میری مصروفیت کا گلہ کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے تانگا روک لیا تھا اور وہ دونوں اپنے اپنے پرس سنبھالتی نکل آئیں۔

☆☆☆

سنیتا کوئی بچی تو نہ تھیں جو پی۔ کے کی مریم پر پڑنے والی نظر کے مفہوم کو نہ سمجھتیں، وہ جانتی تھیں کہ مریم کو مہرے کے طور پر استعمال کر کے ڈیوڈ کے کاروبار کو زمین سے آسمان تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ ڈیوڈ سے بھی اس نے اس کے بارے میں بات کی۔ ڈیوڈ اور سنیتا کو علم نہ تھا کہ پی۔ کے کا کاروبار کیا ہے، انہیں صرف یہ اندازہ تھا کہ وہ کوئی موٹی آسامی ہے...... اس کا لباس، اس کے قیمتی پرفیوم، کلائی پر بیش قیمت گھڑی، ہونٹوں میں دبے مہنگے ترین برانڈ کے سگریٹ...... اس کے وجود کی ایک ظاہری قیمت بتاتے تھے جس سے ہر کوئی متاثر ہو سکتا تھا۔

وہ ان کی ہر پارٹی اور محفل کی جان ہوتا تھا، لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتیں اور وہ ان سے کتراتا تھا۔ سنیتا کے پوچھنے پر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ تھا، وجہ معلوم کرنے پر اس نے ہنس کر کہا تھا کہ اسے کوئی ملی ہی نہیں اور اس جیسوں سے کون شادی کرتا ہے...... وہ جانتی تھیں کہ وہ کسرِ نفسی سے کام لے رہا تھا۔

"یوں کیوں کہا تم نے پی۔ کے؟" سنیتا نے پوچھا تھا۔ "تم تو ایسے ہو کہ تم سے کوئی بھی لڑکی بغیر سوچے سمجھے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گی۔"

"کوئی بھی لڑکی......؟" اس نے حیرت کی شاندار اداکاری کی۔

"سچ کہہ رہی ہوں...... کوئی بھی لڑکی!"

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا سنیتا؟" اس نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تھی۔

"شرم کرو پی۔ کے میں شادی شدہ ہوں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا ورنہ تو اس کے دل کی کئی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئی تھیں۔ "لیکن اگر نہ ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا......" اس نے پوری ایمان داری سے کہا تھا۔ پی۔ کے نے دل میں اس لال لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں اور چہرے پر عمر کے تاثرات کو میک اپ کی تہوں میں چھپاتی عورت کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں خود کو ملامت کی۔

"نوازش ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔" اس نے مصنوعی احسان مندی کا مظاہرہ کیا اور سنیتا...... اور بھی بچھ گئی۔

"یوں بھی میرے اور تمہارے درمیان تو مذہب کی مضبوط دیوار بھی حائل ہے پی۔ کے......" انہوں نے اس انداز سے کہا جیسے پی۔ کے تو ان سے شادی کرنے کے لیے مرا ہی جا رہا ہو۔

"یہی دیوار تو میرے اور مریم کے درمیان بھی حائل ہو گی۔" پی۔ کے نے دل ہی دل میں سوچا۔ "وہ بھی تو اس بوڑھی چڑیل کی سگی بھانجی ہے!"

☆☆☆

"آ جائیں سائرہ...... ایک کپ چائے تو ہو جائے!" نینا نے اپنے دروازے کے پاس تانگے سے اترتے ہوئے کہا، اس سے قبل کرایے میں حصہ دینے پر سائرہ سے بحث ہو چکی تھی اور وہ ڈانٹ بھی کھا چکی تھی۔

"چائے ادھار رہی۔ پھر کبھی سہی۔" سائرہ کے جاتے ہی وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر کی طرف چلی، دروازہ جس طرح وہ بھیڑ کر گئی تھی، اسی طرح تھا۔ وہ اسلم کو خوشگوار سرپرائز دینا چاہ رہی تھی، اسے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوتا...... مگر اسے کیا معلوم کہ اس کی زندگی کا بدترین سرپرائز اس کا منتظر تھا۔

اس کے کمرے میں حیوانیت کا کھیل جاری تھا...... گندی عورتوں سے نفرت کرنے والا اسی گندگی میں لتھڑا ہوا...... اور ننھا سا سہیل...... باپ کے تماشے کو گھور گھور کر دیکھتا ہوا اور خوش ہو کر تالیاں بجاتا ہوا......

نینا کے دماغ پر وہ منظر نقش ہو گیا...... اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا شوہر...... وہ تو خیر چونکے ہی مگر نینا نے فوراً سہیل کو چیل کی طرح جھپٹ کر اٹھایا اور اس کمرے سے یوں نکلی جیسے جسم سے جان نکلتی ہے کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

اسلم ٹپٹایا اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ نینا کے سامنے کھڑا معافی مانگ رہا تھا تو اس کا جی چاہا کہ اس کے منہ پر تھوک دے۔ وہ اس کا گھناؤنا چہرہ دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی، معافی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ تم......" اس نے چلا کر کہا۔

"نینا...... نینا ڈیر!" اسلم نے اپنی طرف سے اسے پیار سے مائل کرنے کی کوشش کی۔

"خبردار جو تم نے مجھے ڈیر کہا تو......" وہ دھاڑی۔ "ڈیر وہی ہے تمہاری...... ٹریسا! جاؤ اور مرو اسی کے ساتھ!"

"اے...... ذرا زبان سنبھال کر۔" اسلم سینہ زوری پر اتر آیا۔ "شوہر ہوں میں تمہارا......"

"اس سے بڑھ کر میری بدقسمتی کیا ہو گی کہ تم میرے شوہر ہو، کاش یہ منظر دیکھنے سے پہلے میں مر گئی ہوتی یا تم!"

"دماغ چل گیا ہے کیا تمہارا؟" اس نے ہاتھ بلند کیا مگر نینا نے اسے اس نظر سے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کٹے ہوئے تنے کی طرح نیچے گر گیا۔

"ہوش میں تو تم نہیں ہو...... گندی شراب کا نشہ چڑھا ہوا ہے تمہیں۔" نینا نے سہیل کو ساتھ لگایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی، اندر سے دروازہ اس نے بند کر لیا۔

"دروازہ کھولو نینا...... میری بات سنو!"

"ختم ہو گئیں میرے اور تمہارے درمیان کی باتیں۔" نینا نے دل پر پتھر رکھ کر کہا، اس کی آنکھیں لبریز ہو رہی تھیں مگر وہ اپنی کمزوری اسلم پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے اور کیسے

کرچیوں میں ٹوٹتا ہے، اس کا اندازہ اسے ہورہا تھا۔ اسلم کی نظر بازی کی عادت تو تھی مگر اسے نینا کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی، مرد کی فطرت سمجھ کر نظر انداز کرتی تھی مگر اب تو اس نے حد ہی ختم کردی تھی۔

''نینا پلیز۔'' اس نے بارہا دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ دروازہ نہ کھلا اور اس کے بعد ان کے درمیان یہ خلیج کبھی ختم نہ ہوسکی...... نینا کو اس بات کی پروا نہ تھی کہ وہ اسے طلاق دے دے گا کیونکہ اس کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ صرف اس کے بچے کا باپ تھا اور اس کے علاوہ ان دونوں کے بیچ کوئی رشتہ نہ تھا۔ ان کے درمیان سہیل کے علاوہ کسی موضوع پر بات نہ ہوتی تھی۔ اسلم نے کتنا ہی عرصہ نینا کے دل کے بند در پر دستک دینے کی کوشش کی مگر بالآخر وہ بھی تھک گیا اور اس کی زندگی میں رنگینیوں کی کمی تو پہلے بھی نہ تھی، نینا کی مستقل ناراضی نے اس پر کوئی فرق نہ ڈالا اور عمر کے کئی سال انہوں نے ایک چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح گزار دیے تھے۔

اب نینا کو دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اسلم سے علیحدگی اختیار کرلیتی اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرلیتی تو شاید اسلم جیسے باپ کے زیرعتاب رہ کر آجانے والی کجیاں سہیل کی شخصیت کا حصہ نہ بنتیں...... کیا کھویا اور کیا پایا...... حساب کرتی تو اس کے کھاتے میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔

☆☆☆

''تم تو شادی شدہ ہوگئی ہو سنیتا اس لیے کوئی اسکوپ نہیں...... ورنہ میں تمہیں شادی سے پہلے ملتا تو یقین کرو...... کوئی دیوار ہمارے درمیان حائل نہ ہوتی، عمر کی نہ مذہب کی۔'' پی۔ کے کو عورت کو شیشے میں اتارنے کا فن آتا تھا، خواہ وہ عورت سنیتا ہو یا کوئی اور... مریم اسے مشکل ہدف نظر آئی تھی اس لیے اس نے سنیتا کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ سنیتا نے ہی بتایا تھا کہ وہ مختلف مزاج کی لڑکی تھی اور جلد کسی سے گھلتی ملتی نہ تھی۔

''ایک بار قابو آجائے تو گھل مل جائے گی...... کچھ عرصہ ساتھ گزارنے کے لیے لڑکی بری نہیں، عیسائی ہے تو کیا ہوا، میں کون سا اس سے شادی کررہا ہوں، اپنا تو اصول ہے کہ شراب جو بھی ملے اچھی ہونی چاہیے، دیسی یا بدیسی کا کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ خود سے ہی باتیں کررہا تھا۔ سنیتا کے گھر کی ہر پارٹی میں وہ سب سے پہلے موجود ہوتا تھا اور موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ مریم سے ملاقات ہوجائے...... وہ اسے آہستہ آہستہ اپنے راستے پر لے آئے گا...... اسے خود پر یقین تھا۔ مریم کی نظروں میں کس طرح سمانا ہے اسے معلوم تھا۔ اسی لیے تو جس پارٹی میں مریم، سنیتا کے بے حد اصرار پر شامل ہوتی تھی اس پارٹی میں پی۔ کے کسی بھی لڑکی کو زیادہ لفٹ نہ کرواتا تھا اور بے نیازی کا رویہ رکھتا تھا...... شریف لڑکیاں کیسے لڑکوں کو پسند کرتی ہیں، وہ بخوبی جانتا تھا۔

اس کا اندازہ غلط نہ تھا، مریم اس بے نیاز سے خوبرو نوجوان کو کن انکھیوں سے دیکھتی تھی جو اُن لڑکیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا جو اس سے بات کرنے کو مری جاتی تھیں اور اوچھے ہتھکنڈے اختیار کرتی تھیں۔ عمر ہی ایسی تھی کہ وہ اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

☆☆☆

''اماں۔'' وہ ہولے سے سرگوشی میں بولی تھی۔ مگر جواب نہ پاکر اس نے ذرا بلند آواز میں دوبارہ ماں کو پکارا، وہ کسمسائیں اور اس کی طرف کروٹ بدل لی۔

''اماں...... چھت پر کوئی ہے۔'' اس کی سرگوشی بھی بلند تھی اور الفاظ بھی ایسے کہ معراج بی بی کی ساری

حسیں بیدار ہوگئیں۔ وہ جھٹ سے اٹھ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گئیں، اندھیرے میں ہی پیروں سے تلاش کرکے جوتے اڑسے اور اٹھنے کا ارادہ کررہی تھیں کہ زرتاج نے پکڑلیا۔ ''کہاں جارہی ہیں اماں؟''

''ارے چھوڑو...... دیکھنے تو دو کہ کون ہے؟'' انہوں نے اپنا دوپٹا اس کی گرفت سے چھڑوایا۔

''اماں باہر نہ نکلیں۔'' اس نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''تو باہر جائے بغیر کیسے علم ہوگا کہ چھت پر کون ہے۔'' انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے اماں۔'' وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر ماں سے لپٹ کر کھڑی ہوگئی، اس کا وجود باقاعدہ لرز رہا تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ معراج نے اسے پیار سے ساتھ لپٹا کر اسے حوصلہ دیا، اس کا سر تھپکا۔

''تم یہیں ٹھہرو...... میں دیکھتی ہوں جاکر، میرے باہر نکلتے ہی تم دروازہ اندر سے بند کرلینا، جب تک میں نہ کہوں...... تم کسی طرح بھی دروازہ نہ کھولنا، چاہے جو بھی ہوجائے، جو کچھ بھی ہوجائے، سمجھیں!'' اسے اچھی طرح سمجھا بجھا کر وہ باہر کی طرف چلیں، زرتاج نے لپک کر ماں کو پھر پیچھے سے پکڑلیا، انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر پھر سے تسلی دی۔

''فکر مت کرو زرتاج...... تمہاری ماں اتنی کمزور عورت نہیں ہے۔'' وہ اپنی چادر سمیٹتے ہوئے باہر نکلیں تو وہ دروازہ بند کرنے کے بجائے ماں کے پیچھے ہی باہر نکل کر کھڑی ہوگئی، معراج نے پلٹ کر دیکھا اور آہستگی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ پورے صحن میں ان کے قدموں کی چاپ کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی...... اتنا سناٹا تھا کہ زرتاج کو اپنے دل کی دھڑکن اور سانسوں کے زیروبم کی آواز بھی آرہی تھی، وہ دل ہی دل میں کئی آیتوں کے ورد کررہی تھی۔

وہ سرتاپا منتظر تھی کہ ابھی کوئی ہنگامہ ہوگا...... ابھی کوئی بھاگتا ہوا نیچے آئے گا، وہ کسی برے منظر کو دیکھنے کے لیے تیار ہورہی تھی کہ اوپر سے اماں کی آواز آئی۔

''کم بختیں۔'' انہوں نے کوئی چیز اٹھا کر کسی کو ماری تھی غالباً۔ ''آرام بھی نہیں کرنے دیتیں کسی کو۔'' بلیوں کے چوٹ کھا کر بھاگنے اور تکلیف دہ آواز میں میاؤں میاؤں کی آوازیں، زرتاج کے لیے زندگی کی نوید جیسی تھیں۔ وہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر کی طرف گئی اور ماں سے لپٹ گئی۔

''جانے دیں اماں بے چاریوں کو، ہمارا کیا بگاڑتی ہیں۔ اس وقت شور کی آواز سے بے چارے پڑوسی جاگ گئے ہوں گے......''

''تو کیوں اوپر آگئی ہے، تجھے کہا تھا کہ کمرے میں رہنا اور ہرگز باہر نہ نکلنا، چاہے جو بھی ہوجائے۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر معراج نیچے کو چلیں۔

''اماں...... ہمارا گھر بہت غیر محفوظ ہے!'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

''اللہ مالک ہے میری بیٹی، وہ ہے ناسب کا رکھوالا...... بس اسی پر بھروسا کرنے والے بہادر ہوتے ہیں!'' ان نے زیرلب کچھ پڑھ کر زرتاج کی طرف پھونکا۔

☆☆☆

پتھر پر بھی پانی پڑتا رہے تو اس میں سوراخ ہو جاتا ہے، نوجوان لڑکیوں کے دل تو پتھر نہیں ہوتے، وہ تو انتہائی نرم ہوتے ہیں اور ان پر پڑنے والی پیار کی نظر جلد ہی دل تک راہ پا لیتی ہے۔ مریم کے دل میں یہ بھی تھا کہ اسے اس ماحول سے فرار کے لیے کسی مسلمان نوجوان کی ضرورت ہوگی۔ وہ جلد بازی میں کسی پر اعتبار بھی نہیں کر سکتی تھی اور بہت عرصے تک سنیتا آنٹی کے گھر میں بھی نہیں رہ سکتی تھی کہ اس کا راز افشانہ ہو جائے...... وہ چھپ چھپ کر اپنی عبادات کرتی اور چپکے چپکے اللہ سے باتیں کرتی۔ اسے معلوم تھا کہ جس دن سنیتا آنٹی یا اس کے والدین کو علم ہوا کہ وہ بغاوت میں کس حد تک چلی گئی ہے اس روز کے بعد اس کی زندگی عذاب بن سکتی تھی۔ اب وہ اگرچہ پی۔ کے کی حوصلہ افزائی تو نہیں کرتی تھی مگر فرق یہ پڑا تھا کہ اتنی مردم بیزاری کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی جتنی پہلے تھی...... پہلے وہ جن پارٹیوں میں شرکت سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اپنے کمرے میں محدود بلکہ محصور ہو جاتی تھی اب وہ مارے باندھے ہی سہی مگر سنیتا آنٹی کے کہنے پر وہاں آ جاتی اور تمام تقریب کے دوران ایک کونے میں گھسی بیٹھی رہتی۔ پی۔ کے خود ہی اس تک رسائی حاصل کر لیتا تھا، اسے وہ سہمی سہمی نظروں والی لڑکی اچھی لگنے لگی تھی، شادی نہیں کر سکتا تھا تو دوستی میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔

”کیا بات ہے مریم...... کوئی پریشانی ہے کیا؟“ اس روز وہ ہمیشہ کی طرح اپنی طرف لپکتی لڑکیوں کو نظر انداز کر کے اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، کوئی پریشانی نہیں!“

”پی۔ کے اتنا نادان تو نہیں ہے مریم...... کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟“

”وہ......“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی، ایک نظر پرویز کی طرف دیکھا کہ وہ قابلِ بھروسا ہے بھی کہ نہیں۔ اس ایک نظر نے پی۔ کے کے دل کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر دیا تھا، گھاک تھا...... جان گیا تھا کہ اسے کسی مسئلے کا سامنا تھا اور وہ اس کی مدد چاہتی تھی۔ ”ہم کہیں باہر مل سکتے ہیں کیا؟“ اس نے ڈرتے ہوئے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

”بالکل۔“ اس نے اپنے سینے میں اٹکی ہوئی گہری سانس خارج کی...... ”آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر باہر لے جاتا۔

”کب؟“ اس نے سوال کیا۔ ”اور کہاں؟“

”میں آپ کو بتاؤں گی۔“

”کب بتائیں گی؟“

”جب ہم اگلی دفعہ ملیں گے۔“

”کیا ہم پانچ منٹ کے بعد اگلی دفعہ مل سکتے ہیں؟“ اس کے لہجے میں لگاوٹ تھی اور بے تابی۔

”معذرت چاہتی ہوں، اتنی جلد بازی پسند نہیں مجھے۔“ اس نے چڑ کر کہا تو پی۔ کے کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا، سنیتا نے دور سے یہ منظر دیکھا کہ مریم کی نظر میں کچھ مختلف تھا، جس نظر سے وہ پی۔ کے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی، اس میں ہمیشہ کی طرح بیزاری مفقود تھی۔ سنیتا کو دلی مسرت ہوئی...... اگر مریم، پی۔ کے سے دوستی کر لیتی تو اپنے مطلب کے کئی کام نکلوائے جا سکتے تھے۔

(باقی آئندہ)



نئی پڑوسن

عتیقہ محمد بیگ

صبح صادق بغیر ناشتے کے وہ رباب کے گھر کی طرف دوڑے۔ جانو کا مقصد یہ تھا کہ وہ مانو سے پہلے رباب سے جا ملے اور مانو کی منشا کہ وہ...... مگر دونوں کی قسمت نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور وہ دونوں ایک ہی لمحے اس کی چوکھٹ پہ آ کھڑے ہوئے۔ جانو نے مانو کو دیکھا اور مانو نے جانو کو۔ دونوں کے چہرے جو پہلے ٹماٹر کی طرح لال تھے اب لیموں جیسے ہو گئے۔ دونوں ویلنٹائن ڈے رباب کے ساتھ منانا

چاہتے تھے۔ جانو نے اپنے گیلے بالوں پر خفگی سے ہاتھ پھیرا جیسے وہ کسی سلطنت کا شہزادہ ہو۔ مانو جس کے بال لمبے نہ تھے اور وہ جانو کے بالوں سے حاسد تھا...... اس نے منہ بسور لیا اور اپنی شرٹ کے بازو چڑھا دیے مانو نے کسرت کر کے اپنے بازو سڈول بنا لیے تھے جس سے جانو گھبراتا تھا...... دونوں نے اپنی اپنی خوبی کو ظاہر کیا جیسے وہ ایک دوسرے کو خاموش لفظوں سے سمجھا رہے ہوں کہ وہ اس سے بہتر ہے اور وہ اس سے اعلیٰ۔ آخر کار جانو نے سوچا کہ ایک دوسرے سے لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بات کر کے مسئلے کو سلجھایا جائے پھر جانو نے پیار سے مانو کو مخاطب کیا۔

''دیکھ مانو، میں تجھ سے ایک سال بڑا ہوں اور تیرا تایا زاد ہوں اس لیے رشتے میں رباب تیری بھابی ہے تو ہماری زندگی میں قدم نہ رکھ تیرے قدم جل جائیں گے۔'' جانو نے آہ بھر کر اسے مشورہ دیا۔ مانو نے اسے گھورا۔

''واہ، واہ کون کس کی زندگی میں آرہا ہے...... آنکھیں کھولو، رباب تیری بھابی ہے اور تو مجھ سے بڑا ہے اس لیے تو زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ ہم بچوں کی زندگی سے دور چلا جا، بڑے ہمیشہ چھوٹوں کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔'' مانو نے اپنے شرٹ کے کالر کو کھڑا کر کے غصیلی نظروں سے اسے جواب دیا۔

''تجھے شرم آنی چاہیے، میری پسند پر نظر رکھ رہا ہے۔'' جانو نے اس دفعہ غصے سے اسے انگلی دکھا کر کہا جس پر مانو چیخا۔

''تم اپنی نظروں کو میری رباب سے دور رکھو...... ورنہ میرے ہاتھوں سے گناہ ہو جائے گا۔'' اس نے ہاتھوں کو مسل کر جواب پھینکا۔

دونوں صبح صبح نہا دھو کر لڑائی کے لیے تیار کھڑے تھے، دل کا جو معاملہ تھا۔ بے چارے جانو مانو سے کوئی لڑکی دوستی جو نہیں کر رہی تھی۔ دل کے دونوں اچھے تھے مگر دل پھینک، توبہ توبہ...... اُن کی اسی عاشقانہ عادت کی بنا پر محلے کی لڑکیوں نے نین نہ ملائے۔

ان دونوں کا ایک ہی پیارا دوست سعد تھا۔ سعد جسامت میں دبلا پتلا تھا۔ وہ دونوں اسے اسمارٹ، اسماٹو پکارتے۔ سعد کو اس نام سے چڑ تھی مگر جانو مانو اس کے کمزور جسم پر خوب لطیفے بنا ڈالتے۔ پھر سعد کا افیئر محلے کی پڑھی لکھی لڑکی نیلم کے ساتھ شروع ہوا تو سعد کے لیے لطیفے بند ہوئے۔

نیلم کے لیے ان دونوں نے کافی پاپڑ بیلے تھے مگر اسماٹو اسے لے اڑا جس پر دونوں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے اور جلد ہی محبت کی بیماری انہیں آ لگی۔ اسماٹو ان کے سامنے شیر اور وہ دونوں چوہے لگنے لگے۔ اسماٹو سے برتری پانے کے لیے وہ ہر لڑکی کے دیوانے بن جاتے۔

رباب پندرہ دن پہلے ان کے محلے میں شفٹ ہوئی تھی۔ وہ بلا کی خوب صورت تھی اور ماشاء اللہ بی اے پاس تھی۔ اب پتا نہیں ڈگری نقلی تھی یا اصلی خدا ہی جانتا ہے۔ رباب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ رباب کے والد ..... دبئی میں رہائش پذیر تھے۔ رباب اپنی ماں سکینہ کے ساتھ اس محلے میں آئی تھی۔ رباب کا گھر جانو، مانو کے گھر سے تیس قدم کی دوری پر تھا۔ دونوں پر محبت کا بھوت اتنا سوار تھا کہ وہ دونوں تیس قدم کو دس قدموں میں بدل دیتے۔ رباب کی ماں سکینہ سے ان کی سلام دعا تھی۔ ان کے پچھلے گھر کا سارا سامان جانو، مانو نے اپنے کندھوں کی مہربانیوں سے نئے مکان میں شفٹ کیا تھا۔ سکینہ تو ان پر اپنی جان نچھاور کرنے لگی۔ پیسوں کی دنیا ہے، جو پیسا دیتا ہے یا جس سے پیسوں کی بچت ہو جائے وہ جان سے عزیز ہو جاتا ہے۔ پیار اندھا ہوتا ہے یہ تو سنا تھا مگر پیار گدھا بھی بنا دیتا ہے یہ نہیں...... چلیے چھوڑیے...... محبت کے سفر میں آپ اور ہم تھوڑی چل رہے ہیں، بس جانو اور مانو، رباب کی خاطر جان دینے کے لیے تیار تھے۔ دونوں اس کے دروازے پر ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہوئے تھے۔ سعد جو گھر سے دودھ لینے کے لیے نکلا تھا اس کی نظریں رباب کے دروازے پر پڑیں تو دوڑ کر دونوں کی طرف بھاگا۔ دبلا پتلا سعد دونوں کے درمیان آ گھسا تا کہ معاملہ بگڑنے سے بچ جائے مگر اس نے نیکی کر کے عذاب کما لیا، جانو نے مانو کو ایک گھونسا دے مارا۔ جو مانو کے بجائے اسماٹو کو لگا۔ اس کا سر گھوم گیا۔ مانو نے بھی طیش میں آ کر جانو کو گھونسا مارا وہ بھی اسماٹو کو جا لگا، وہ زمین پر جا پڑا۔ صبح، صبح اس کے بارہ بج گئے۔ وہ لمبی لمبی آہیں بھرنے لگا۔ جانو، مانو گھبرا سے گئے اور اس کے پاس آ گئے۔ اسماٹو نے لرزتی آواز میں کہا۔

''میرے دوستو! میری قبر چوڑائی میں رکھنا۔ شاید مرنے کے بعد خدا میری دعا سن لے اور مجھے بھی سڈول جسم سے نواز دے۔'' اس نے رونی صورت بنا کر کہا۔ جانو نے اسے اپنے ایک ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا، مانو اس کے کپڑے جھاڑنے لگا۔ اسماٹو آہیں بھرنے لگا۔

''آہ...... آہ...... میرے دانت پورے کے پورے تم دونوں کی لڑائی نے ہلا دیے ہیں، اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ کبھی بھول کے زیادہ ہنسا تو دانت نہ گر پڑیں۔'' اسماٹو نے اپنے دل کا درد بیان کیا۔ مانو نے ایک غصیلی نظر جانو پر ڈالی اور تلخی سے کہا۔

''کچھ تو دوست کا خیال رکھتا۔'' اس نے اسماٹو کے کندھے دبانے شروع کر دیے جس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ جانو نے اسماٹو کا ہاتھ تھام لیا اور مانو کو دیکھ کر بولا۔

''تجھے نہ تو بھائی کا خیال ہے نہ دوست کا، میری زندگی برباد کرنے کے ساتھ تو اسماٹو کے دانتوں کا بھی صفایا کرنے والا تھا، شرم تو تجھے آنی چاہیے۔'' جانو نے معصومیت سے بات کی کہ شاید مانو کا دل پگھل جائے اور وہ رباب کا خیال چھوڑ دے۔ اسماٹو کراہ کر بولا۔

''تم دونوں کیوں یہاں صبح صبح کھڑے ہو؟'' اس نے رباب کے دروازے پر نظریں ٹکا کر پوچھا۔ مانو نے جلدی سے چاکلیٹ جیب سے نکالی اور مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

''یار! آج ویلنٹائن ڈے ہے، اپنی محبوبہ رباب صاحبہ کو دینے آیا ہوں مگر مجھے یہ معلوم کہاں تھا کہ میرا سگا خون میرا رقیب بنا بیٹھا ہے۔'' مانو نے رونی صورت بنا کر اسماٹو پر اپنے دل کی بات ظاہر کی۔ اسماٹو نے اس کو گلے سے لگا لیا اور جانو کی طرف معصومیت سے دیکھا۔ جانو نے خفگی سے کہا۔

''میں رانجھا اور رباب میری ہیر ہے اور مانو کیدو کا رول ہے...... اسماٹو دیکھ میں رباب کے لیے سرخ گلاب لایا ہوں۔'' اس نے اپنی شرٹ سے سرخ گلاب نکال کر اپنے دل کی داستان سنائی۔ اسماٹو جس کی ہیر رانجھا داستان فیورٹ تھی اس نے مانو سے کہا۔

''مانو تو کوئی دوسری لڑکی دیکھ لے۔'' اسماٹو نے جانو کی سائڈ کیا لی مانو نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ چیخنے لگا۔ جانو نے مانو سے اسماٹو کی گردن چھڑواتے ہوئے کہا۔

"محبت چیزوں کی بھوکی نہیں کہ تو چاکلیٹ اٹھالایا ہے۔ رباب میرا گلاب کا پھول سینے سے لگالے گی اور تیری چاکلیٹ محلے کے کسی ننھے منے بچے کو تھمادے گی۔" مانو نے یہ سن کر اسماٹو کی گردن پر گرفت اور مضبوط کرلی۔ اسماٹو نے اپنی جان بچانے کے لیے لرزتی آواز میں کہا۔

"یار مانو، میں تجھ سے مذاق کررہا تھا۔ تیری محبت کی آگ اتنی تیز ہے کہ دومنٹ میں چرغہ تیار ہوجائے...... پلیز مجھے چھوڑ دے۔ بخش دے...... میرے دوست ......" اسماٹو نے چیخ کر اسے کیدو نہیں رانجھا بنادیا۔ جس پر جانو نے اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ چیخنے لگا۔

اسماٹو کے چیخنے پر رباب نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں نے اسماٹو کی گردن چھوڑدی اور مسکرانے لگے۔ مانو اور جانو کا دل بلے بلے کرنے لگا۔ جانو کی سماعتوں میں یہ گانا گونجنے لگا۔

"اِک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا ...... جیسے کھلتا گلاب...... جیسے شاعر کا خواب......" اور مانو کی نظروں میں رباب جھومنے لگی اور اس کے دل کی دھڑکن گنگنانے لگی۔

"بانہوں کے درمیان دو پیار مل رہے ہیں، بانہوں کے درمیان۔" مانو اور جانو کو بت بنا دیکھ کر اس نے اسماٹو سے پوچھا۔

"آپ لوگ یہاں......؟" اسماٹو نے گھبرا کر کہا۔

"وہ ......وہ میں تو دودھ لینے آیا تھا...... شاید یہ لوگ......" اس نے مانو، جانو کو ہلایا تو وہ ہڑ بڑا اٹھے۔ جانو نے ہوش میں آکر اسماٹو کے کان میں سرگوشی کی۔

"چل تو نکل، کہیں ہم دونوں لڑتے رہ جائیں اور تو رباب کو نہ لے اڑے۔" اسماٹو کو انہوں نے پیچھے کیا۔ دونوں رباب کے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہوگئے۔ رباب نے کرسی پر قبضہ جمایا...... اور ایک لمبی آہ بھری۔ جانو نے مسکرا کر پوچھا۔

"خالہ جان نظر نہیں آرہیں، کہیں گئی ہیں کیا؟"

گھر میں سکینہ خالہ کو کہیں نہ پا کر اس نے مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ اس سے پہلے وہ منہ کھولتی مانو پھٹ پڑا۔

"رباب کتنی دفعہ کہا ہے کہ کوئی سودا سلف منگوانا ہو تو بندہ حاضر ہے، خالہ جان کو کیوں بازار بھیجا؟" اس نے آتے ہی اپنے نمبر بنانے شروع کردیے۔

"سالے پہلی بات پر چھکا مارلیا۔" جانو نے دل میں جل کر کہا۔ رباب جمائی لے کر بولی۔

"نہیں، نہیں مانو، اماں اسٹیشن گئی ہیں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ دل پر رکھ دیے۔ رباب ان کی حرکت پر ہکا بکا رہ گئی۔

"کیا تم یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہو؟" جانو نے فکر مندی سے پوچھا۔ مانو نے معصومیت سے نظریں افسردہ سی کرلیں۔

"اوہو، خالہ خورشید آرہی ہیں، اماں انہیں لینے گئی ہیں، انہیں ہمارے اس نئے گھر کا پتا جو نہیں۔ بے فکر رہو میں یہاں ہی ہوں۔ تم لوگ بتاؤ کیا کام ہے، مجھے پلیز بہت کام ہیں......" وہ کرسی سے اٹھی۔

"مجھے تو کوئی کام نہیں، میں تو خالہ سکینہ کا حال پوچھنے آیا تھا، اب تمہارے کاموں میں مدد کردیتا ہوں۔" جانو نے ہنس کر چھکا مارا۔ مانو نے غصیلی نظروں سے دیکھا اور دل میں بولا۔

"سالا! اپنے نمبر بنارہا ہے۔" رباب ہنس کر بولی۔

"وہ کام لڑکیوں کے ہیں اور تم دونوں...... نہیں نہیں تم جاؤ، میں تنہا گھر کی صفائی ...... کھیر، بریانی تیار کرلیتی ہوں۔" اس نے صحن کے کونے سے جھاڑو اٹھالی۔ مانو نے جھٹ ...... جھاڑو اس کے ہاتھ سے چھین لی...... وہ گھبرا سی گئی۔ جانو نے کچن کا رخ کیا۔ دونوں کی بے قراری دیکھ کر وہ پشیمان سی ہوگئی۔ اس نے صحن کا رخ کیا۔ صحن میں مانو نے جھاڑو دینا شروع کردی تھی۔

کچن کا منظر دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔ جانو نے پیاز کاٹنی شروع کردی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی حالت پر رباب مسکرا کر بولی۔

"جانو! آپ رہنے دیجیے، میں یہ کام دیکھ لیتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں رباب، مجھے وہ مرد بہت برے لگتے ہیں جن کی بیویاں کچن سنبھالیں اور وہ کھا کھا کر تعریف تک نہ کریں۔ عورتیں بھی کتنی معصوم ہوتی ہیں۔" اس نے افسردگی سے خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے عورتوں کے حق میں آواز اٹھائی۔

"جانو! آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔" رباب نے چاول ڈبے سے نکال کر پرات میں ڈالتے ہوئے اس کی تعریف کی۔ جانو کے ہاتھوں میں تیزی آگئی اور دس منٹ میں اس نے پیاز کاٹ کر ایک طرف کی پھر اس نے ٹماٹر پکڑے۔

"آپ کوکنگ میں کافی ماہر ہیں۔" رباب نے ہنس کر کہا۔ اس نے ٹماٹر بھی کاٹ لیے تھے، اب وہ ایک دیگچی پکڑ رہا تھا۔ وہ ہنسا۔

"میں گھر میں اماں کے ساتھ بھی کافی مدد کرتا ہوں۔ پتا ہے میری اماں مجھے کہتی ہیں کہ تیری بیوی بہت خوش نصیب ہوگی تو اسے بٹھا کر کھلائے گا۔" جانو نے ہنستے ہنستے اپنی تعریف پھینکی جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، وہ تو رباب کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ بہت اچھا شوہر ثابت ہوگا اگر اس نے اسے پسند کرلیا۔

"یہ تو خالہ جان نے درست فرمایا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور چاول دھونے لگی۔

"رباب ...... یہ تمہارے لیے۔" اس نے جلدی سے شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر سرخ گلاب اس کی طرف بڑھایا۔ وہ سرخ گلاب کی دیوانی تھی اس نے جلدی سے پکڑ لیا اور اسے سونگھ کر بولی۔

"تمہیں کیسے پتا...... کہ مجھے سرخ گلاب پسند ہے۔" جانو نے مسکرا کر کہا۔

"بس...... میرے دل نے کہا اور میں تمہارے لیے یہ تحفہ لے آیا۔" جانو اس کے گلاب یوں پکڑنے سے مطمئن سا ہوگیا جیسے وہ اس کی ہوچکی ہو۔ جانو کے سر پر گانا بجنے لگا۔

"ساجن جی گھر آئے ...... دلہن کیوں شرمائے......" جانو کو یوں لگا جیسے اس نے اچکن پہن رکھی ہے اور سر پر سہرا باندھ کر وہ رباب کے پاس کھڑا ہے اور رباب دلہن کے روپ میں اس کا انتظار کررہی ہے۔ اس کے پیارے خواب پر مانو کی آواز نے پانی پھیرا۔

"رباب، رباب باہر آؤ، میں نے سب کمروں کی صفائی کرلی ہے، بس تم ایک نظر دیکھ لو کہ سب کام ٹھیک کیا ہے ناں!" مانو نے جھاڑو ہاتھ میں پکڑے رباب کو پکارا۔ جانو کا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ رباب نے ٹیبل پر پھول رکھا اور باہر چلی گئی۔ جانو نے بریانی کا مسالا تیار کرنے کے لیے دکھی دل سے دیگچی چولھے پر رکھی۔ اب وہ پہلے جیسی

پھرتی نہ تھی، رباب جو اس کے ساتھ کھڑی نہ تھی۔
”واہ، واہ مانو جی آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔“ مانو نے سب کمرے شیشے کی طرح چمکا دیے تھے مانو اس کے خوش ہونے پر مطمئن سا ہو گیا۔
”شکر ہے آپ کو میرا کام پسند آیا ورنہ میں تو پتا نہیں کیا، کیا سوچ رہا تھا کہ شاید آپ کو میری نسبت جانو پسند ہے۔“
”نہیں، نہیں مانو جی آپ دل کے بہت اچھے ہیں۔ آپ نے جانو سے زیادہ محنت کی، صفائی کی جائے تو عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔“ رباب نے اسے پیار سے دیکھ کر جواب دیا۔ مانو نے خوش ہو کر کہا۔
”مجھے گھر سجانے کا بہت شوق ہے، میں اپنے گھر میں بھی صفائی کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ میں ان مردوں سے نفرت کرتا ہوں جن کے نزدیک گھر کی صفائی صرف بیوی پر عائد ہوتی ہے۔ میری بیوی ہوگی تو میں اس کے ساتھ ساتھ گھر کا بھی خیال رکھوں گا۔“ مانو نے رباب پر اپنا جال پھینکا۔ وہ مسکرائی۔
”آپ کی بیوی بہت خوش قسمت ہوگی۔“ رباب نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ رباب کو مسکراتا دیکھ کر اس نے جلدی سے چاکلیٹ جیب سے نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔ وہ خوشی سے چیخی۔
”چاکلیٹ......! یہ کس خوشی میں؟“ اس نے چاکلیٹ مانو کے ہاتھ سے جھٹ پکڑ لی اور خوشی خوشی اس سے پوچھا۔
”آپ خوش ہیں اس لیے میٹھا کھلانے کو دل چاہا۔“ مانو نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔ رباب نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولی۔
”آپ...... آپ بہت اچھے ہیں۔“ مانو کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ رباب کے یوں ہاتھ پکڑنے پر اس کے سر پر گانا بجنے لگا۔

”ہوش والوں کو خبر کیا
بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے...... پھر سمجھیے
زندگی کیا چیز ہے“

رباب کمرے سے نکل گئی مگر وہ خوابوں میں رہ گیا۔ جانو نے مانو کو یوں بے ہوش پایا تو اس کے کان میں زور سے چیخ ماری۔ وہ ہڑبڑا سا گیا۔
”تو...... تو...... میرے ساتھ......“ مانو نے دیکھا اس نے جانو کا ہاتھ تھاما ہوا ہے۔ جانو نے خفگی سے ہاتھ چھڑوایا۔
”پاگل رباب کا ہاتھ سمجھ کر کب سے تو میرے ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔“ جانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر اپنی شرٹ سے صاف کیا۔ مانو غصے سے بولا۔
”رباب کدھر ہے؟“
”صحن میں کھڑی ہے، اس نے مجھے آرام کے لیے یہاں بھیجا تھا اس نے میرا پھول قبول کرلیا ہے، میں کل ہی اماں کو خالہ سکینہ سے بات کرنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔“ جانو نے کرسی پر بیٹھ کر خوشی خوشی اپنی شادی کا اعلان کیا۔
”پاگل ہے تو...... اس نے میرا ہاتھ تھاما، اس کا مطلب یہ کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چاہتی ہے۔ میں کل کیا آج رات ہی اماں کو خالہ سکینہ کی طرف بھیج رہا ہوں۔ مجھے دنیا کی نظروں کا ڈر ہے کہیں میری زندگی کو نگل نہ جائیں۔“ مانو نے دوسری کرسی پر قبضہ جما کر ہنستے ہنستے اپنی محبت کا فرمان جاری کیا۔
”دیکھ مانو مجھے تجھ سے ہمدردی ہے، اس نے دیور سمجھ کر تیرا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بھابی ہے تیری۔“ جانو

نے ہنس کر اسے رباب کا دیور پکارا۔
”ابے سالے چل ہٹ، تجھے اپنا جیٹھ جی سمجھ کر اس نے گلاب کا پھول لے لیا، اب بڑوں کو وہ انکار تو نہیں کر سکتی۔“ مانو نے بھی اسے جیٹھ جی کہہ کر چھیڑا۔
دونوں رباب کے لیے لڑنے لگے۔ دونوں کی تیز آوازیں صحن میں پہنچیں تو رباب دوڑی چلی آئی۔
”کیا ہوا؟“ دونوں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے کہ وہ میری ہے، وہ میری ہے۔ رباب کمرے میں آ کھڑی ہوئی۔ جانو نے مسکرا کر کہا۔
”کچھ نہیں وہ مانو کی گرل فرینڈ ہے، وہ اس کے ساتھ جھگڑ پڑا ہے تو میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اب چھوٹی چھوٹی باتوں سے رشتہ تو نہیں توڑا جاتا۔ اسے سمجھا شاید وہ جھگڑا کرنے سے باز آجائے۔“ جانو نے مانو کو آنکھ مار کر اس کی پچھلی پرانی گرل فرینڈ کا مسئلہ پیش کر دیا۔ مانو بھی کسی طرح پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا مانو نے رونی صورت بنا کر کہا۔
”رباب اب وہ جانو کی دیوانی نکلی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ جانو نے کسی کے ساتھ شادی کی تو وہ زہر کھا لے گی، بے چارہ جانو...... اس لیے کنوارا ہے۔“ مانو نے آہ بھر کر اس پر حملہ کیا۔ جانو کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ رباب افسردہ سی ہو گئی۔ اس نے معصومیت سے کہا۔
”پلیز! اس لڑکی کو پیار سے دونوں سمجھاؤ، مجھے اس کے لیے بہت دکھ ہو رہا ہے۔“ رباب نے افسردگی سے اپنے دل کا حال بیان کیا۔ جانو نے سنجیدگی سے کہا۔
”آپ فکر نہ کریں، میں اسے سمجھا رہا ہوں۔ میں کبھی کسی کی جان نہیں لے سکتا مگر شاید کسی کے لیے جان دے سکتا ہوں۔“ اس نے رباب کے ساتھ کھڑے ہو کر مانو کو جواب دیا۔ مانو نے منہ بسور لیا۔ رباب نے گھڑی پر نظریں ٹکائیں اور پھر افسردگی سے بولی۔
”اماں ابھی تک نہیں آئیں مجھے بہت فکر ہو رہی ہے، اب تک تو اماں کو آجانا چاہیے تھا۔“ گھر کی صفائی ہو چکی تھی بریانی دم پر تھی اور کھیر کا ڈونگا اس نے فریج میں رکھ دیا تھا۔
”تم فکر مت کرو، میں اسٹیشن جاتا ہوں۔“ جانو نے پیار سے اسے تسلی دی۔ مانو نے بھی فکر مندی دکھائی۔
”ہاں، ہاں میں بھی جاتا ہوں، تم فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں، ابھی گیا اور تمہاری اماں کو لے کر آیا۔“ مانو گھر سے باہر جا نکلا...... جانو بھی اس کے ساتھ باہر دوڑا...... رباب نے پھر نظریں گھڑی پر جما دیں۔

☆☆☆

اسٹیشن پر وہ ایک گھنٹا سکینہ خالہ کو ڈھونڈتے رہے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ خالہ سکینہ کی ملاقات جلد ہی اس سے ہو جائے۔ صبح سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آخر کار پوری ریل گاڑی کی چھان بین کر کے وہ گھر پہنچے۔ انہوں نے گھر میں آوازوں کا شور سنا تو دونوں کو احساس ہو گیا کہ خالہ سکینہ اپنی بہن کے ساتھ آ پہنچی ہیں۔ مانو اور جانو نے اپنے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا جیسے لڑکی والے ان دونوں کو دیکھنے آئے ہیں...... مگر اندر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خالہ سکینہ اور ان کی بہن صحن میں چارپائی پر بیٹھی تھیں اور کچن کی ٹیبل پر ایک خوب صورت نوجوان بیٹھا تھا جس کے ہاتھ میں سرخ گلاب اور چاکلیٹ تھی جانو کو یوں لگا جیسے اس کا دل سرخ گلاب ہو اور وہ اس خوب صورت نوجوان کی مٹھی میں قید ہو گیا ہو۔ نوجوان کے ہاتھ سے

رباب نے چاکلیٹ لے کر کھولی اور اس کی طرف بڑھائی۔ مانو کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ جب نوجوان نے چاکلیٹ پر اپنے دانت گاڑے۔ اسے ایسا لگا... جیسے وہ نوجوان اس کے دل کو چبا رہا ہو۔ رباب دوپٹا لہرا لہرا کر اس کے سامنے گانا گنگنا رہی تھی۔

"غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو...... میری زندگی ہے تو"

مانو نے روتی آواز سے کہا۔

"میری زندگی ہے تو......"

جبکہ جانو نے بھی افسردگی سے زبان کھولی۔

"بس ان دونوں کی نہیں صرف میری زندگی ہے تو......" پھر ان دونوں نے سرگوشی کی اس نوجوان کی نظریں پڑیں تو اس نے رباب کو آہستگی سے کہا۔

"رباب دروازے پر دیکھو۔" رباب نے مڑ کر دیکھا تو جانو، مانو منہ لٹکائے کھڑے تھے۔ رباب پُرجوش ہو کر بولی۔

"مراد یہ جانو، مانو ہیں۔" مراد نے ان دونوں پر ایک خفگی بھری نظر ڈالی اور پوچھا۔

"جانو، مانو...... کون؟" اس نے کندھے اچکائے۔ رباب نے ہنس کر کہا۔

"اوہو مراد، تمہیں فون پر بتایا نہیں تھا کہ جانو، مانو نے گھر کا سامان یہاں شفٹ کرنے میں ہماری کتنی مدد کی تھی۔" رباب نے سامان والی بات کا حوالہ دیا۔

"ہاں...... یاد آیا۔" مراد نے ہنس کر کہا پھر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ دونوں افسردہ تھے۔ مراد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم لوگوں نے رباب کے بھائی کی کمی کو پورا کردیا، ویل ڈن بوائز۔" مراد نے دونوں کو خوشی خوشی دیکھ کر بات ختم کی۔

جانو اور مانو رباب کی طرف پھٹی نظروں سے تکنے لگے کہ وہ اس کے بھائی نہیں۔ رباب نے جانو، مانو کا ہاتھ تھام لیا دونوں پھر خوش ہو گئے کہ اب وہ مراد سے صاف صاف بول دے گی کہ وہ ان دونوں میں سے ایک کو جیون ساتھی بنانے والی ہے۔ جانو اور مانو نے آنکھیں بند کرلیں جیسے مسٹر یونیورسل کا خطاب انہیں ملنے والا ہو۔ رباب پیار سے بولی۔

"مراد یہ میرے بھائی نہیں......" دونوں نے آنکھیں کھول دیں اور اکڑ کر مراد کو تکنے لگے اس سے پہلے کہ وہ زیادہ خواب میں رہتے رباب نے پیار سے کہا۔

"جانو، مانو میرے سگے بھائی سے بھی بڑھ کر نکلے ہیں۔" دونوں نے ایک دوسرے کو رونی صورت بنا کر دیکھا۔ مراد نے رباب کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولا۔

"تو پھر آج ویلنٹائن ڈے پر اپنے بھائیوں کو ایک اور خوشی دے دو کہ اگلے ہفتے ہمارا نکاح ہے۔"

جانو، مانو دونوں کے دل مرجھا گئے پھر ان کی دھڑکنوں سے سُر نکلا۔

"دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم وفا کر کے بھی تنہا رہ گئے"

دونوں نے بجھے دل سے رباب کے گھر سے رخصت لی اور گھر کی طرف دوڑے، صبح سے بھوکے جانو، مانو کو اب لڑکی کے بجائے مرغی کا انڈا نظر آ رہا تھا بے چارے جانو، مانو کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ فریج میں انہیں انڈا نہیں ملنے والا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کی ماؤں نے اپنے اپنے شوہر بہادر کو بڑے پیار سے ناشتا کرا دیا تھا اور وہ سارے انڈے چٹ کر گئے تھے۔ اگر آپ سب کو جانو، مانو کے دل کی فکر ہے تو جلدی سے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں کہ اُن کے لیے خدا ایک، ایک لڑکی آسمان سے پھینک دے جن میں ویلنٹائن ڈے منانے کی بیماری بھی شدت سے موجود ہو۔

☆☆

ناولٹ

کانچ سی لڑکی

انجم انصار

تیسرا حصہ

ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے
ہر لڑکی نازک ہوتی ہے
ہر لڑکی کانچ سی ہوتی ہے
ہر لڑکی حساس ہوتی ہے

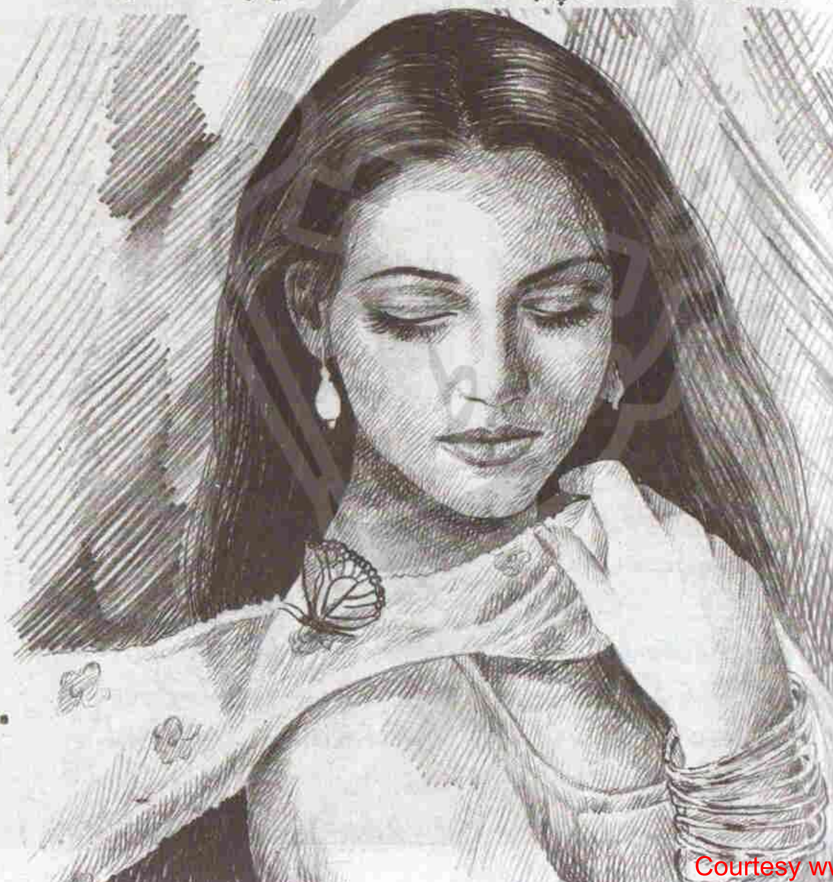
اور

ہر لڑکی اپنے والدین کے دل کا ٹکڑا ہوتی ہے۔
کیا ہمارے یہ احساسات صرف اپنی بیٹیوں کے لیے ہوتے ہیں؟

دوسروں کی بیٹیوں کے لیے نہیں؟

"پتا نہیں میری آنکھوں پر پٹی کیسے بندھ گئی...... کہ اپنے لیے ایسی بہو پسند کرلی...... جو کسی بھی طرح میری پسند کے آئینے میں فٹ ہو ہی نہیں سکتی۔" ان کی نظروں میں بوتیک کا وہ منظر گھوم رہا تھا اب یونیورسٹی کا کوئی لڑکا مینا کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالے اپنے لیے شاپنگ کر رہا تھا اور مینا چپ چاپ اس کو شاپنگ کروا رہی تھی۔

"منو...... ! میں یہ شرٹ لے لوں، یہ رنگ تو



تمہارا فیورٹ ہے؟" وہ خوشامدی لہجے میں ہر شرٹ لیتے ہوئے ندیدے سے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

ساجدہ بیگم...... جو اپنے بھانجے کے لیے گفٹ لینے اس...... بوتیک میں داخل ہوئی تھیں...... مینا کو اس طرح شاپنگ کرتے دیکھ کر الٹے قدموں ہی واپس ہوگئی تھیں۔ مینا کی تو ان پر نظر تک نہیں پڑی تھی۔ ہاں شہزاد نے انہیں پہلی نظر میں پہچان لیا تھا اور ان کی غصیلی نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں اس نے مینا کو لے لیا تھا۔ مینا کی منگنی ہونا...... ان کے پورے گروپ کو ہضم نہیں ہوا تھا۔ منگنی پھر...... شادی...... اس کا مطلب تو یہی تھا کہ سونے کی چڑیا ان کے ہاتھ سے نکلنے والی تھی۔

ساجدہ بیگم جس طرح پیر پٹختے ہوئے بوتیک سے باہر نکلی تھیں...... ان کے تیور دیکھ کر ہی شہزاد کو ایک آسودگی سی محسوس ہوئی تھی۔

"ان دنوں تو گلاس سے زیادہ منگنیاں ٹوٹا کرتی ہیں...... اگر مینا کی بھی منگنی ٹوٹ جائے تو ہماری وہ پریشانیاں جو اس کے جانے سے آسکتی ہیں وہ آہی نہیں سکتیں۔" شہزاد خود ہی سوچ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

☆☆☆

ریحان اپنے کسی دوست کی شادی میں لاہور گیا ہوا تھا...... اور ظہیر حسن طبیعت خرابی کے باعث دوا کھا کر جلد لیٹ گئے تھے اور ساجدہ بیگم اپنے گھر کے لاؤنج میں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ سر کا درد کسی صورت..... ٹھیک نہیں ہو رہا تھا...... اور طبیعت میں بے چینی بدستور بڑھ رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔

غیر ارادی طور پر انہوں نے ریموٹ ہاتھ میں لے کر چینل سرچ کرنے شروع کیے اور ایک چینل پر بے ہودہ سی ماڈلنگ دیکھنے کے لیے رکیں لاحول ولاقو...... کہہ کر وہ ریموٹ کا بٹن دبانے والی تھیں کہ مینا کو دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئیں...... موسم بہار کے ملبوسات کے لیے لڑکیاں کیٹ واک کر رہی تھیں مگر انتہائی مختصر اور باریک سا لباس جو کسی طرح بھی ستر پوشی کا حق ادا نہیں کر رہا تھا...... مینا اسے پہنے...... زگ زیگ انداز میں ریمپ پر چل رہی تھی۔ ساجدہ بیگم کی آنکھوں سے تو جیسے برسات شروع ہوگئی۔ کب پروگرام ختم ہوا...... اور اس میں کیا کیا ہوا......؟ یہ سب انہیں بالکل معلوم نہیں تھا...... انہیں تو بس یہ پتا تھا کہ سینے سے شروع ہونے والا جھبلا جو اُن کی ہونے والی بہو نے پہن رکھا تھا، وہ انتہائی معیوب سا تھا جسے پہن کر وہ انہیں واقعی ایک چڑیل سی لگ رہی تھی۔

اگلے دن انہوں نے فون کر کے انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "کل رات ٹی وی پر مینا کو ماڈلنگ کرتے ہوئے دیکھا...... بے حد رنج ہوا۔"

"اس سال تو اس نے کسی ماڈلنگ والے پروگرام میں حصہ لیا ہی نہیں۔" فون چونکہ دادی نے ریسیو کیا تھا تو جواب بھی انہوں نے ہی دیا۔

"میں نے کل رات خود دیکھا ایسا پروگرام......" ان کا لہجہ ہنوز شکایتی سا تھا۔

"جس میں وہ بے بی پنک جارجٹ کا جھبلا سا پہنے ہوئے تھی۔"

"ارے وہ تو دو سال پرانا پروگرام ہے۔ جب گڑیا نے نیا نیا یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا...... اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ ان کے کہنے میں آ کر یہ پروگرام کرلیا تھا۔ سچی بات ہے میں بھی بہت خفا ہوئی

تھی۔ اس کے بعد اس نے کبھی ماڈلنگ کی ہی نہیں۔" دادی نے قصداً جھوٹ بولا۔

ان کا جھوٹ اس وقت کھل گیا جب وہ ٹیلر کے ہاں سے اپنے کپڑے لینے گئیں تو کسی فیشن میگزین کے سرورق پر مینا کی تصویر اسی لباس میں موجود تھی اور ان کا ٹیلر ماڈسی خواتین کو وہ میگزین دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اس سال کے گرمیوں کے نئے ڈیزائن اس میگزین میں ہیں اور ایک چینل پر تو ان ملبوسات کی نمائش گزشتہ تین ماہ سے ہر ویک اینڈ پر ہو رہی ہے۔"

ساجدہ بیگم کو یوں لگا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یہاں رکی رہیں تو چکرا کر گر جائیں گی۔

☆☆☆

"بڑی فتنی عورت ہے بھئی...... زبان پر کچھ، دماغ میں کچھ...... آنکھوں میں کچھ...... ویسے تو بڑی قابلیتی ہیں...... میں ایسی ہوں ویسی ہوں، یہاں نہیں جاتی، وہاں نہیں جاتی...... یہ اچھا نہیں لگتا، وہ پسند نہیں جیسی باتیں ہر وقت اپنے منہ میں دابے پھرتی ہیں اور ٹی وی پر کیٹ واک دیکھ کر ماڈلز تک کو پہچان رہی ہیں۔ ارے بھئی...... تمہیں کس نے کہا تھا کہ یہ فیشن کے پروگرام دیکھو، یہ تو یوتھ کے پروگرامز ہیں...... ان کو دیکھنے چاہئیں نا کہ سٹھیائی ہوئی عورتوں کو......" ساس کی باتیں سن کر شائستہ کے آگ ہی تو لگ گئی تھی۔

"مجھے تو صاف لگ رہا ہے کہ ریحان کی منگنی انہوں نے ہماری مینا کے ساتھ کر تو دی ہے مگر وہ کر کے پچھتا رہی ہیں۔" دادی نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

"پچھتا تو ہم بھی رہے ہیں...... کہ مینا کے لیے یہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا گھرانہ ملے گا...... جہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اعتراض کی انگلیاں اٹھیں گی۔" شائستہ نے کلس کر کہا۔

"مینا نے تو ہم سب کو ہی مشکل میں ڈال دیا ہے۔" دادی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ایسی ویسی مشکل میں، بہت بڑی مشکل میں...... سائیکی بیٹی کو سنبھالنا کوئی آسان کام ہوتا ہے بھلا۔ جس چیز کی ضد ہو جائے اس کو لیے بغیر کبھی باز نہیں آتی۔ یہاں تو پھر...... اس کی زندگی کا معاملہ ہے...... وہ ریحان کو اپنی زندگی کہتی ہے۔" شائستہ نے اپنی ساس سے دل گرفتہ سے لہجے میں کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر مینا کو سائیکی بنانے میں تمہارا ابھی ہاتھ ہے۔" دادی نے قدرے غصے سے کہا۔

"میرا ہاتھ......؟ یہ آپ کہہ رہی ہیں۔ اپنے بیٹے کا مزاج نہیں جانتی...... کہ وہ مینا سے کیسے پاگلوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں...... تم دونوں کا ہی ہاتھ ہے، بیٹی کو بھی ہتھیلی کا چھالا بنا کر نہیں رکھا جاتا مگر تم نے شروع سے اس کے منہ سے نکلی ہر بات کو اپنے لیے حکم کا درجہ دیا۔ کوئی ایسا کیا کرتا ہے بھلا۔ جس کی وجہ سے تم خود پریشان ہو رہی ہو۔ ایسے لوگ...... جن سے تم ناتا کبھی نہ جوڑتیں صرف اپنی بیٹی کی ضد کی وجہ سے جوڑا ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک...... جتن کر کے پہنچانا الگ ہوگا۔"

"جتن کر کے......؟" شائستہ نے حیرت سے ساس کو دیکھا...... اور ان کا کہا ہوا جملہ دُہرایا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ ساجدہ بیگم تو کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں...... کہ موقع ملے تو وہ رسی تڑوا کر بھاگیں۔"

''میں انہیں...... ان ہی کی رسی سے جکڑ دوں گی تب وہ کیسے بھاگ پائیں گی۔'' شائستہ نے مسکرا کر کہا تو دادی بھی بے اختیار ہنس دیں۔

☆☆☆

ظہیر حسن کئی دنوں سے دیکھ رہے تھے...... ساجدہ کے آنسو بات بے بات نکل رہے تھے...... ان کے ہاتھ سے گلاس ٹوٹا تو وہ رو دیں، ملازمہ نے اپنے بیٹے کی بیماری کی کہانی سنائی تو ان کی آنکھیں چھلک پڑیں اور جب مالی نے انہیں بتایا کہ جو انار کا پودا انہوں نے لگایا تھا وہ بالکل جل گیا ہے...... تو وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں جیسے وہ کوئی پودا نہ ہو جیتا جاگتا انسانی وجود ہو۔

''کیا بات ہے ساجدہ......؟'' وہ ان کے مقابل ہو کر حیران سے بولے۔

''کچھ نہیں۔'' کہنی سے آنسو پونچھ کر وہ مٹر چھیلنے میں محو سی ہو گئیں۔

''کوئی بات تو ضرور ہے۔'' انہوں نے ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''کوئی بات نہیں......'' آنسو پھر بہنے لگے۔

''کیا ابھی تک منگنی کا سوگ چل رہا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر بیوی سے پوچھا۔

''نہیں...... یہ بات نہیں ہے۔'' ان کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔

''ساجدہ ...... اب ایک جیسا ماحول تو اپنے بہن بھائیوں کے گھروں کا بھی نہیں ہوتا۔ بینا جب ہمارے گھر آئے گی تو وہ ہمارے ہی ماحول میں ڈھل جائے گی۔''

''ہوں......'' انہوں نے تائید میں سر ہلایا اب وہ ان سے کیا کہتیں کہ اس وقت ان کے دل و دماغ میں ایک قیامت سی چھائی ہوئی ہے جسے وہ کھل کر بیان بھی نہیں کرسکتیں۔ اپنی بات نہ وہ انہیں سمجھا سکتی ہیں اور نہ وہ اسے سمجھ سکتے ہیں کہ اب گانا، ناچنا اور ماڈلنگ کرنا برائی رہی ہی نہیں بلکہ یہ تو اضافی خوبیاں ہیں۔ ہاں، خوبیاں جو چار چاند لگا رہی ہیں مگر ان کے گھرانے میں یہ خوبیاں، خامیاں سمجھی جاتی تھیں۔

وہ ایک عرصے تک کالج میں لڑکیوں کو اسلامک اسٹڈیز پڑھاتی رہی تھیں...... ان کے لیکچرز نے بہت زیادہ پر تو نہیں مگر چند ایک پر واقعی گہرا اثر بھی ڈالا تھا اور ان کے لباس سے لے کر ان کی گفتگو تک میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ جس میں حیا نہیں اس میں ایمان نہیں اور جو عورت یا لڑکی اپنی زینتوں کا نظارہ کرانے کے لیے لباس پہنتی ہے وہ بے حیا ہے اور اب ان کے اپنے گھر میں آنے والی بہو...... ان کے تمام اصولوں کی نفی کر رہی تھی۔ وہ جس بات، جس چیز کو ناپسند کرتی تھیں وہ ساری چیزیں اس میں مزین تھیں سوچ سوچ کر ان کا دماغ پھٹا جا رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔ مسلسل سر کے درد نے ان کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے سے ڈال دیے تھے۔

☆☆☆

ریاض گھر میں آئے تو چپ چپ سے تھے نسرین بیگم نے ان کے سامنے کھانا رکھا تو انہوں نے دو نوالے کھا کر ٹرے پیچھے کھسکا دی۔

''کیا بات ہے...... آپ نے کھانا نہیں کھایا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟'' بیوی کے لہجے میں فکرمندی گھلی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولے۔

''تو پریشان سے کیوں ہیں؟'' اب نسرین ان کے پاس بیٹھ کر پوچھ رہی تھیں۔

''نہاں کے سسرال والے جلدی شادی پر زور

دے رہے ہیں۔''

''کتنی جلدی چاہ رہے ہیں؟''

''وہ کہہ رہے ہیں کہ بس عید کے بعد۔''

''مگر پہلے تو انہوں نے خود کہا تھا کہ نہاں گریجویشن کر لے۔''

''ہاں، اب وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر اسے پڑھنا ہوگا تو شادی کے بعد پڑھ لے گی۔''

''عید آنے میں تو صرف تین ماہ باقی ہیں۔''

''جب ہی تو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں، اتنے کم عرصے میں شادی کی تیاری کیونکر ہو پائے گی۔''

''تو حامی بھر لیں...... شادی تو کرنی ہی ہے۔'' نسرین نے مسکرا کر کہا۔ ''میرے پاس جو کچھ بھی ہے...... وہ نہاں کا ہی تو ہے۔''

''مگر میں اپنی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں، اتنے کم عرصے میں یہ سب نہیں ہو سکے گا۔''

''لڑکی کا لینا دینا ساری زندگی چلتا ہے اگر کوئی کمی رہ جائے گی تو بعد میں اس کا ازالہ کر دیں گے۔'' نسرین بیگم نے شوہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا میں یہ کہہ دوں کہ ہمیں آپ کی رائے سے کوئی اختلاف نہیں...... ہم راضی ہیں۔''

''ہاں، ہم اپنی بیٹی کی شادی جلدی کر دیں گے۔''

ریاض مسکراتے ہوئے اپنے موبائل کے بٹن پش کرنے لگے۔

☆☆☆

موبائل اٹھا کر انہوں نے دور پھینکا۔

''ہونہہ...... جس سے بات کرو، اس کا مشورہ ہی انوکھا ہوتا ہے۔ جب میرا دل بینا کو اپنی بہو بنانے کے لیے قبول ہی نہیں کر رہا تو میں الٹے سیدھے چکروں میں کیوں گھن چکر بنوں۔ جب میں اس لڑکی کو پسند نہیں کر رہی...... تو میں کیوں شادی کا جوا کھیلوں اور پھر ہار کو اپنا نصیب بناؤں۔'' تب ساجدہ بیگم...... اپنے بیٹے کی منگنی توڑنے کی ترکیبیں سوچنے لگیں۔ وہ خود ہی کوئی بات سوچتیں اور خود ہی اسے رد کر دیتیں...... اپنی ترکیبیں انہیں خود ہی بودی اور ٹھس معلوم ہونے لگتیں۔

تین دن اسی سوچنے اور رد کرنے میں گزر گئے اور پھر ایک اچھوتا سا خیال ان کے دل میں ایسا آیا جسے سوچ کر ان کے لبوں پر مسکراہٹ رچ سی گئی۔

بیٹے کی منگنی کے بعد وہ پہلی مرتبہ اپنے سمدھیانے گئیں اور ان کی دادی سے بولیں۔

''آپ لوگوں کا تقاضا ہے کہ شادی جلدی ہو...... مگر میرے بچے کو حال ہی میں ایسا یرقان ہوا ہے کہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ سال بھر تک تو اس کی شادی کا نام نہیں لینا۔ میں نے کہا...... تم اتنے باہر سے جا کر ایم ایس کر آؤ...... شادی کا کیا ہے وہ بعد میں بھی ہو جائے گی۔''

''ایسی بات ہے تو آپ کو فوراً شادی کر دینی چاہیے، بیوی ساتھ ہوگی تو آپ کے بیٹے کا اچھے سے خیال تو رکھ سکے گی۔ بیمار لڑکا، وہ بھی پردیس چلا جائے تو وہ مزید بیمار بھی ہو سکتا ہے۔'' دادی نے بھی جھوٹے کو گھر تک پہنچایا۔

''نہیں بھئی...... اتنی جلدی وہ شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔''

''جب منگنی کی رسم کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے ناں کہ اب اس لڑکی سے ہمارے بچے کی شادی ہوگی اور سیانے کہتے ہیں کہ کبھی شادی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا ہے بینا آپ

کے گھر میں بہو بن کر جائے اور آپ کی خدمت کرے۔'' شائستہ جہاں نے پینترا بدل کر کہا۔

''میں زبردستی تو نہیں کر سکتی ناں...... '' ساجدہ بیگم، ساس بہو کی باتیں سن کر بدحواس سی ہو گئیں۔

''اگر آپ کہیں تو ہم خود ریحان سے بات کر کے پوچھ لیتے ہیں کہ جلدی شادی کرنے میں آخر اسے کیا پریشانی ہے؟''

''وہ یہاں ہوگا تو آپ بات کریں گی...... وہ یہاں ہے ہی نہیں۔''

''دیکھیں یہ گڈے گڑیا کی شادی نہیں ہو رہی، آپ اس کو بلاوجہ کیوں ٹالنا چاہ رہی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ کے پاس ایسی کوئی ٹھوس وجہ بھی موجود ہوگی۔'' شائستہ جہاں کا جملہ تھا کہ برچھی...... وہ بلبلا ہی تو گئیں اور خاصے ہتک آمیز لہجے میں بولیں۔

''ہمارے ہاں تو شادی میں ابھی خاصی دیر ہے اگر آپ لوگوں کو جلدی ہے تو مینا کی شادی کہیں اور کر دیں۔ میں اس بات کا بالکل برا نہیں مانوں گی۔ ظاہر ہے آپ لوگ لڑکی والے ہیں اور آپ لوگ اپنی بیٹی کی جلدی شادی کرنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے آپ کو وہی کرنا چاہیے جو آپ کی خواہش ہے۔ ماشاء اللہ حسین ترین آپ کی بیٹی ہے اور جیسی اچھی آپ کی فیملی ہے اس کے بارے میں تو صرف سن کر ہی اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہوگی کہ آپ سے ناتا جوڑا جائے۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں آپ دوسرے لوگوں کی نہیں اپنی بات کریں صرف اپنی بات؟'' دادی کو ان کی باتیں سن کر غصہ ہی تو آ گیا۔

''میرے بیٹے کی شادی میں تو ابھی خاصی دیر ہے۔''

''کتنی دیر......؟ پانچ سال، دس سال یا اس کو بوڑھا کرنے کے بعد آپ اس کی شادی کریں گی۔'' شائستہ جہاں کے جلال کا گراف بڑھنے لگا۔

''جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہو جائے گی، مجھے کیا معلوم کہ کب ریحان کی شادی ہوگی۔'' ساجدہ بیگم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں وہ ساس بہو کو سوچوں کے منجدھار میں چھوڑ کر چلتی بنیں۔

''یہ سب منگنی توڑنے کا بہانہ ہے۔'' ان کے جانے کے بعد دادی کا لہجہ حتمی سا تھا۔

''ریحان نے کل میرے میسج کا جواب دیا تھا...... وہ لوگ کبھی منگنی نہیں توڑ سکتے......'' مینا اپنی دادی کی بات سن کر سرشار سے لہجے میں بولی۔

''مینا...... یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا...... اپنی منگنی کی تقریب میں تمہیں اپنے یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ ڈانس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ قدامت پسند لوگ ہیں۔ ان کے ہاں کی خواتین کا بس نہیں چلتا کہ خواتین سے بھی پردہ کریں۔ آج بھی تمہاری ساس آئیں...... تو اپنا برقع اوڑھے بیٹھی رہیں۔ صرف تمہارے ڈانس کرنے کی وجہ سے تمہاری منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ تمہاری ساس کے مزاج اور عزائم مجھے کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' شائستہ جہاں نے خفگی بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سب آپ کی خام خیالی ہے، ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ میرا ڈانس دیکھ کر تو ریحان بہت خوش ہو رہا تھا اور اس کے دوست تو ہکا بکا سے رہ گئے تھے...... ان لوگوں نے منگنی کی ایسی تقریب کہاں دیکھی ہوگی۔ ماما نے کس قدر تو تحائف دیے تھے۔ ساس کے لیے کپڑے اور سیٹ چاچیوں، خالہ کے لیے لاکٹ...... اور مردوں کے لیے سب کے

لیے راڈو گھڑیاں......اور بنارسی ساڑیاں تو بے حساب تھیں کہ جس کو دل چاہے وہ ان میں بانٹیں۔"

"بعض لوگ صدیوں کے بھوکے ہوتے ہیں انہیں کتنا ہی کچھ ملے...... وہ سب ڈکار جاتے ہیں ان کی بھوک نہیں مٹتی۔تمہاری ساس کا شمار بھی شاید ایسی ہی خواتین میں ہوتا ہے۔" شائستہ جہاں نے کلس کر کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے پھر تو وہ منگنی توڑنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتیں۔آپ انہیں حلق تک تحائف ٹھنسا دیں......ان کی آواز خود ہی بند ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ آج وہ صرف آئی بھی اس وجہ سے ہوں کہ انہیں مزید تحائف کی بھوک ستا رہی ہو۔" مینا نے تمسخر سے کہا تو ماما بھی اس کی ہم خیال ہو گئیں،واقعی اس نہج پر تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔اس سے قبل کہ وہ سلکی کامدار ساڑیوں کے ساتھ میچنگ گولڈ کے ٹاپس ساجدہ بیگم کے ہاں بھجواتیں۔ ساجدہ بیگم کے گھر سے منگنی کا وہ تمام سامان واپس آ گیا...... جو انہوں نے لڑکے کو دیا تھا یا ان کے عزیز و اقارب کو دیا تھا۔رتی سے رائی تک ایک، ایک چیز اس طرح واپس آئی تھی جیسے اسے کھول کر دیکھا تک نہ ہو اور ایک خط میں انتہائی معذرت کے ساتھ یہ لکھا گیا تھا۔

"ہمارے ہاں شادی میں ابھی دیر ہے اور آپ کو بے حد جلدی ہے اس لیے ہم یہ منگنی صرف آپ کی آسانی کے لیے ختم کر رہے ہیں۔لڑکیوں کی شادی بر وقت ہونی چاہیے،لڑکے کی شادی میں دیر سویر ہو تو کوئی ایسی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔" یہ سب دیکھ کر شائستہ جہاں تو حق دق سی رہ گئیں۔وہ تو ساجدہ بیگم کو بھوکی، ننگی، پتا نہیں کیا کیا سمجھ رہی تھیں......مگر انہوں نے تو ان کی کوئی چیز نہیں رکھی تھی اور اپنے چڑھائے ہوئے کسی زیور کے مانگنے کا مطالبہ تک نہیں کیا تھا۔مینا یہ سب احوال جان کر سراسیمہ سی ہو گئی۔ریحان جو اسے اپنی زندگی لگا تھا جس کو دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ اپنی زندگی اسی کے ساتھ بسر کرے گی اس نے بھی ماں کو نہیں روکا...... تب اس نے ریحان کے موبائل پر میسج کر کے پوچھا۔

"یہ کیا مذاق ہو رہا ہے؟ منگنی کرنے کے بعد کیا کوئی اس طرح کیا کرتا ہے کہ لڑکی کے خوابوں میں آگ لگا دی جائے۔" ریحان نے اس ایس ایم ایس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ اگلے دن اس نے اپنی سم ہی تبدیل کر لی تھی۔

سرفراز صاحب کا مارے طیش کے برا حال تھا...... اور وہ ایک ہی بات کہہ رہے تھے کہ یہ منگنی ٹوٹی نہیں ہے بلکہ کسی نے تڑوائی ہے۔

"ریحان کے باپ سے جب بھی ملاقات یا فون پر بات ہوئی...... مجھے ایسا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ ریحان بہت اچھا لڑکا ہے جہاں وہ جاب کرتا ہے وہاں کا ہر شخص اس کے اچھے اخلاق کی تعریف کرتا ہے۔سیدھا سادہ نیک لڑکا...... دیگر غلط چکروں میں بھی نہیں ہے۔ایسی صورت میں منگنی توڑنے کا فیصلہ ان کا گھرانہ ہرگز نہیں کر سکتا۔یہ کسی اور وجہ سے ٹوٹی ہے۔جس کی وجوہ بھی مجھے جلد پتا چل جائیں گی۔"

"ریحان کی ماں بڑی چلتر عورت ہے،اس کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ریحان کی شادی ہماری مینا کے ساتھ نہیں کرنا چاہتی...... یہ منگنی صرف اور صرف اس کی وجہ سے ٹوٹی ہے۔" دادی نے بیٹے کو بتایا۔

"نہیں اماں......شادی بیاہ کے معاملات ہوں یا دوسرے، ہمارے گھروں میں اتنے بڑے فیصلے کوئی

عورت تن تنہا نہیں لے سکتی۔ ہاں اس وقت لے سکتی ہے...... جب اسے کسی نے ایسی انفارمیشن دی ہو...... اور اس طرح دی ہو...... جس سے وہ پریشان ہوگئی ہو اور میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس شہر میں میرا کون ایسا دشمن چھپا بیٹھا ہے جس نے چھپ کر یوں وار کیا ہے کہ میری جان سے زیادہ عزیز بیٹی کی منگنی تڑوادی۔"

"جو بھی ہوا...... اچھا ہی ہوا...... مجھے تو ریحان کا گھرانا بھایا ہی نہیں تھا...... اپنی مینا کی شادی کہیں اچھی جگہ پر ہوجائے گی۔" دادی نے بیٹے کو تشفی دیتے ہوئے کہا وہ جانتی تھیں کہ وہ غصے میں پاگل ہوجاتے ہیں۔ شائستہ جہاں کا خیال تھا کہ منگنی ٹوٹنے کا سن کر مینا خوب شور وغل مچائے گی اور رونا دھونا ڈالے گی...... مگر وہ تو ایک لفظ بھی شکایت کا اپنی زبان پر نہیں لائی۔ ہاں وہ خاموش ضرور ہوگئی تھی اور اپنے ہاتھ میں پہنی رنگ اتار کر ماں کو دے دی تھی مگر کسی کو بھی کوئی الزام دینے سے احتراز کیا تھا۔

☆☆☆

"طبیعت خراب ہے تمہاری......؟ امتحان میں فیل ہوئی ہو...... یا گھر میں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہے۔" اس شام مینا اپنی ایک پرانی سہیلی کے پاس پہنچی تو اس کا ایک دم اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے کہا۔

"میری منگنی ٹوٹ گئی۔" مینا نے گلوگیر سے لہجے میں بتایا۔

"یقیناً تمہارے پاپا نے توڑی ہوگی۔"

"نہیں...... لڑکے والوں نے توڑی ہے۔"

"کوئی وجہ نہیں بتائی؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں...... بس انہیں ابھی اپنے بیٹے کی شادی ہی نہیں کرنی ہے۔"

"کوئی دوسری لڑکی نظر آگئی ہوگی......؟" سہیلی نے کہا۔

"کیا ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ جب کوئی دوسری لڑکی نظر آجائے تو پہلی والی منگنی تک کو توڑ دیا جاتا ہے۔" مینا نے سادہ لوحی سے پوچھا۔

"ارے یار...... منگنی تو ڈھنگنی ہوتی ہے، یہ تو بغیر کسی وجہ کے ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔"

"بغیر کسی وجہ کے؟" مینا نے اپنی آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ہاں، یار...... قسمیں، وعدے، گھڑے اسمبلیاں اور منگنیاں تو ہمیشہ سے یونہی ٹوٹتی آئی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"کچھ بھی نہیں، تھوڑے عرصے بعد...... ٹھاٹ سے شادی کرو...... اور اب منگنی ونگنی کے چکر میں بالکل بھی مت پڑنا۔ سمجھدار گھرانے تو اب منگنی کے مخالف ہوگئے ہیں۔"

مینا گم صم سی واپسی لوٹ آئی۔ وہ اپنے دل سے جتنا ریحان کو نکالنا چاہ رہی تھی وہ اتنا ہی وہاں جم کر بیٹھا تھا۔ "میرا تم سے اب کوئی واسطہ نہیں، تم میرے دل سے میری یادوں سے نکل جاؤ......" وہ تکیے میں اپنا منہ چھپا کر سسک کر کہتی اور اسے یوں لگتا ...... جیسے وہ اس سے کہہ رہا ہو۔

"جاؤ ہم نہیں جاتے، تم کیا کرلوگی۔" تب اس کی گھٹی گھٹی چیخیں...... تکیے کی روئی میں مدغم ہوجاتیں۔

☆☆☆

"ہماری بات کا مطلب آپ بالکل غلط سمجھے ہیں، ہم نے شادی کی جلدی کے لیے تو ضرور کہا تھا مگر ہماری کسی بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ نہاں کے جہیز کے لیے ہنگامی طور پر شاپنگ کرنا شروع کردیں۔" نہاں کے ہونے والے سسر ریاض

صاحب کے گھر آئے......تو اُن کے گھر سوزوکی سے مختلف سامان اترتا دیکھ کر پریشان ہو کر بولے۔

''بھائی صاحب بیٹی کی شادی ہے......اسے خالی ہاتھ رخصت کروں گا تو سب یہی کہیں گے کہ اپنی بیٹی ہوتی تو میں جہیز دیتا......پالی ہوئی بیٹی کو اپنے سر سے بوجھ کی طرح اتارا ہے......اللہ جانتا ہے کہ نہاں میرے دل کا ٹکڑا ہے......اور اس سے مجھے اتنی محبت ہے کہ جس کا میں لفظوں میں ذکر بھی نہیں کر سکتا۔''

''مجھے آپ کی بات کا یقین ہے اور میں آپ کے حالات سے بھی بخوبی واقف ہوں تو آپ یہ یقین کیوں نہیں کر لیتے کہ آپ کی بیٹی......اب میری بیٹی بن جائے گی......اور جب بیٹیاں اپنے گھر جاتی ہیں تو ان کا استقبال کرنے والے ان کی ضروریات کا خود ہی خیال رکھتے ہیں۔ آپ نے نہاں کو اچھی تربیت دی، پڑھایا لکھایا، یہ فرض کوئی کم ادا کیا ہے آپ نے۔'' نہاں کے سسر کی باتیں سن کر ریاض صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو دوسروں کی پریشانیوں کو سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

''تم نے اپنی پسند سے ریحان کی منگنی کی اور خود ہی ختم کرنے کے لیے ایسی اتاؤلی ہو گئیں کہ بیمار تک پڑ گئیں اور آخر منگنی تڑوا کر ہی دم لیا۔'' ظہیر حسن نے اپنی بیوی سے کہا۔

''ہاں، منگنی ختم ہونے کے بعد میرے سر سے ایک انجانا سا بوجھ اتر سا گیا۔''

''اور میرے سر پر ڈھیر سارے وزنی گٹھڑ آ گئے ہیں۔'' ظہیر حسن نے دھیمے مگر پریشان سے لہجے میں کہا۔

''آپ کو کیسی پریشانی......؟'' ساجدہ بیگم نے حیرانی سے شوہر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سرفراز صاحب کا مقام......نہ صرف ہمارے شہر میں بلکہ ہمارے ملک میں بہت بڑا ہے اور لوگ ان کی بے حد عزت کرتے ہیں، میں تو اس بات پر ہی حیران تھا کہ انہوں نے ہمارے ریحان کا رشتہ قبول ہی کیونکر کر لیا اور اب ہم نے منگنی ختم کر کے ان کو دکھ تو پہنچایا ہے۔ ایک نیک اور نفیس سے شخص کے ساتھ یہ سلوک ہوتا دیکھ کر میرا دل مجھے صبح شام صلواتیں سنا رہا ہے اور جب بھی ان سے اگر ملاقات ہو گئی تو میں تاسف سے چھپتا پھروں گا۔''

''ہم نے کوئی بے عزتی تھوڑی کی ہے اور نہ ہی ان سے کوئی ایسی بات کہی ہے کہ جس سے ان کو کوئی صدمہ ہوتا ہو۔ ہم نے تو بے حد مہذب انداز میں منگنی اس وجہ سے ختم کی ہے کہ ہم اتنی جلدی اپنے بیٹے کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔''

''آپ کچھ بھی کہیں مگر آپ کی بات کا مطلب وہ یہی لیں گے کہ مینا آپ کے معیار پر پوری نہیں اتری، اس لیے آپ نے یہ منگنی ختم کر دی۔''

''اب وہ جو چاہیں سمجھیں......ہماری بلا سے۔ ہمارے بچے کی تو جان چھوٹ گئی۔'' تب ریحان جو اپنے لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' ظہیر صاحب اور ساجدہ نے ایک آواز بیٹے سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......اپنے دوستوں کی شرارت پر ہنسی آ رہی تھی۔''

''کیسی شرارت؟'' ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں، بس ایسے ہی۔'' وہ لیپ ٹاپ بند کر کے کمرے سے جاتے ہوئے بولا۔

''بیٹا تمہیں تو اپنی منگنی ٹوٹنے کا غم نہیں

ہے؟'' ماں نے پوچھا۔

''نہیں امی، غم کیسا جتنی خوش آپ ہیں اتنا ہی میں بھی۔'' وہ ماں کو متفکر سا پا کر دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

''تمہارے پاپا کو بہت افسوس ہو رہا ہے۔'' وہ تمسخر سے بولیں۔

''پاپا کو کیوں افسوس ہو رہا ہے؟'' ریحان نے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ساری زندگی سرکاری افسر رہے ہیں ناں......افسران کے آگے یس سر کی عادت ان کی گھٹی میں رچ بس گئی ہے۔ اب نو سر کہتے ہوئے یا سنتے ہوئے انہیں عجیب سا تو لگے گا ناں......'' ظہیر حسن کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆☆☆

نہ وہ سہیلیوں کے ساتھ کیفے ٹیریا گئی تھی نہ اس نے کوئی کلاس اٹینڈ کی تھی۔ کلاسز آف ہونے کے بعد اس کے دوستوں کا گروپ مووی دیکھنے نکلا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ وہیں گھاس پر بیٹھی گھاس نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی۔

''ارے تم ابھی تک یہاں ہو؟'' شہزاد کسی کام سے دوبارہ وہاں آیا تو اسے یوں پریشان سا بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس آ کر بولا۔

''ہاں......گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''کوئی بات نہیں، مت جاؤ...... آج تم ہمارے ساتھ گھومو۔''

''نہیں......''

''بات کیا ہے، یہ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟'' شہزاد نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''میری منگنی ٹوٹ گئی۔'' وہ شہزاد کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''تو کیا ہوا......؟'' ایک طمانیت کی گہری سانس لے کر اس نے پوچھا۔

''ریحان کی امی نے مجھے ریجیکٹ کر دیا۔''

''تمہیں کوئی ریجیکٹ کر ہی نہیں سکتا اور جس نے ایسا کیا ہے، اس نے اپنے پیر پر خود کلہاڑی ماری ہے۔''

''آنٹی سے کسی نے آ کر کہہ دیا کہ مینا سے شادی مت کرنا......تو انہوں نے منگنی توڑ دی۔''

''ایسا کس نے جا کر کہہ دیا، یہ تو بہت بہادری کا کام ہے۔''

''پتا نہیں، کون میرا دشمن ہے۔''

''میں نے تو نہیں کہا حالانکہ مجھے بھی ریحان سے جلنا تو چاہیے تھا ناں......'' وہ تمسخر سے ہنس کر بولا۔

''میں کیا کروں شہزاد......؟'' مینا گلوگیر لہجے میں بولی۔

''میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر اور غم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، میرے ساتھ گھومو، پھرو اور عیش کرو۔''

''مگر میری تو منگنی ہوئی تھی۔'' اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''مینا ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''کہو......''

''تم جیسی لڑکی کو یہ منگنی ونگنی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے......یہ تو مڈل کلاس فیملیز میں ہوا کرتی ہیں۔ تم جیسی لڑکی کو پانے کے لیے تو لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں، جتن کیا کرتے ہیں، اس لیے تمہیں ریحان کے نہ ملنے کا دکھ بالکل بھی نہیں کرنا

چاہیے۔ اسمارٹ نیس میں کیا میں ریحان سے کم ہوں...... جو تم یہ غم منا رہی ہو۔'' شہزاد ہنستے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔

''یوں بھی جوائنٹ فیملی سسٹم...... تو تم جیسی لڑکیوں کو کبھی سوٹ ہی نہیں کرے گا، سوٹ تو خیر شادی بھی نہیں کرے گی۔'' اور بینا حواس باختہ سی شہزاد کی باتیں سنتی رہی... پھر چپ چاپ اٹھ کر چل دی...... وہ پیچھے سے آوازیں دیتا رہا...... مگر اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ شہزاد نے کہا تھا ہنس کے اور بینا کے لگا تھا کس کے...... اس کے دماغ پر شہزاد کی بات...... ''سوٹ تو تمہیں خیر شادی بھی نہیں کرے گی......'' کسی پتھر کی طرح لگی تھی۔

''جب ہی ساجدہ آنٹی نے یہ منگنی توڑ دی......'' اس نے اپنے آپ کو باور کرایا۔ ''کیا میں ایک نارمل لڑکی نہیں ہوں۔'' اس کے ذہن میں نیا فتور سمایا۔ اپنی سہیلی نوما کو فون کر کے پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا۔

''جو تمہیں نارمل تسلیم کرے، وہ خود ایب نارمل ہوگا۔'' سہیلی کی بات سن کر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''امی...... کیا میں نارمل لڑکی نہیں لگتی آپ کو۔'' وہ ماں کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ نہ جانے کس بات پر آف موڈ میں تھیں غصے سے بولیں۔

''کس نے تم سے کہہ دیا کہ تم نارمل ہو...... اگر نارمل ہوتیں تو تمہاری منگنی کبھی نہ ٹوٹتی۔ کاش تم انسانوں کی طرح رہو تو ہماری پریشانیاں کبھی نہ بڑھیں۔''

''خدایا...... میں گھر کے لوگوں کے لیے پریشانی ہوں اور مجھے اس کا علم ہی نہیں۔ جب ہی تو کسی نے آسانی سے میری منگنی تڑوادی۔'' تب اس نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا...... جس میں اپنی محرومی کا ذمے دار اس ہستی کو ٹھہرایا جس نے اس کی منگنی تڑوائی ہے اسی لیے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ خط لکھ کر کافی دیر تک روتی رہی۔ ماما کی تصویر سینے سے لگا کر معافی مانگتی رہی، پاپا کی تصویر آنکھوں سے لگا کر دھواں دھار روتی رہی مگر سائیکی ہونے کے سبب وہ یہ جان نہیں سکی کہ اپنی جان خود لینا گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسی ضرر رساں گولیاں کھا گئی...... جس کو کھا کر موت یقینی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن جب وہ ناشتا کرنے باہر نہ نکلی تو ملازمہ نے اندر آ کر دیکھا...... تو وہ ہمیشہ کے لیے سو چکی تھی، پورے گھر میں کہرام مچ گیا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی...... معروف صنعت کار سرفراز کی اکلوتی بیٹی نے خودکشی کر لی۔ سرفراز احمد تو جیسے پاگل سے ہو گئے۔

''میری بیٹی نے خودکشی نہیں کی ہے، اس کو قتل کیا گیا ہے۔ ہمارے کسی دشمن نے اس کو مار دیا۔'' وہ تڑپ تڑپ کر ہر آئے گئے سے کہہ رہے تھے اور تعزیت کرنے والوں کو ان کی ذہنی حالت جان کر صدمہ ہو رہا تھا۔

ظہیر حسن، ساجدہ بیگم بھی ان کے ہاں پرسے کو آئے تھے۔ اور اپنے گھر جا کر شکر ادا کیا تھا کہ یہ سانحہ شادی کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔

دادی جان کو بھی اپنی لاڈلی پوتی کی جدائی شاق گزری تھی۔ دونوں بھائی بھی صدمے سے چور تھے ماں کی حالت بھی کچھ جدا نہیں تھی...... مگر جو حالت سرفراز احمد کی تھی...... وہ خاصی تشویشناک تھی انہیں کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔

''میری شہزادی سی بیٹی نے صرف اتنی سی بات پر یہ دنیا چھوڑ دی کہ اس کی منگنی ٹوٹ گئی۔ اس نے اپنے دل پر اتنا غم لے لیا تھا اور میں اس کے غم سے غافل رہا۔ کاش مجھے وہ گھرانہ کہیں ایک بار تو مل جائے تو میں ان سے جا کر پوچھوں...... کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ میری تم سے کیا دشمنی تھی جو تم نے میری بچی کے حق میں یوں کانٹے بو دیے۔ تم کیسے شقی القلب لوگ ہو کہ تم نے میری بیٹی کی جان لے لی...... میری معصوم سی بچی پر کیوں ایسا قہر ڈھایا تم نے۔'' ان کا رونا شروع ہوتا تو کسی صورت رکنے میں ہی نہیں آتا۔

''غلطی تو آپ کے سمدھیانے والوں کی بھی ہے اگر کسی نے کوئی الٹی سیدھی بات کہہ بھی دی تو انہیں منگنی تو نہیں توڑنی چاہیے تھی۔ کوئی پلاسٹک کی منگنی تھوڑی تھی جو چٹ دینی سے توڑ بھی ڈالی۔'' کسی نے سرفراز احمد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں غلطی تو ان کی بھی ہے مگر جب کوئی کسی کے کانوں میں زہر بھرے گا تو میرے لحاظ سے تو اصل مجرم تو وہی ہوا ناں......'' وہ غصے سے سرخ آنکھوں کو گھماتے ہوئے بولے۔

''اور مجھے جلد پتا بھی چل جائے گا کہ یہ حرکت کس کی ہے...... جس کی وجہ سے میری معصوم سی بچی ہم سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہے۔'' دادی جان اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو جاتیں کہ وہ دیکھ رہی تھیں کہ سرفراز احمد کی ذہنی حالت ابتر سے ابتر ہوتی جا رہی تھی اور ان کے دماغ میں بدلے کی آگ بری طرح دہک رہی تھی۔

یہ بھی اللہ کا ہی کرم تھا کہ انہیں اس سارے معاملے میں ریحان کا گھرانہ اتنا قصوروار نظر نہیں آ رہا تھا جتنا کہ وہ گھرانہ نظر آ رہا تھا جس کے کہنے پر آ کر انہوں نے منگنی توڑی تھی اور وہ اس سے ناواقف تھے۔ دادی یہ سوچ کر بھی پُرسکون تھیں کہ اگر کہیں انہیں ظہیر حسن کے رشتے دار ریاض کے بارے میں علم ہو جاتا تو پتا نہیں سرفراز احمد اس کا کیا حشر کرتے۔ اب وہ بیٹے کو تسلی دینے کی اپنی جانب سے پوری کوشش کر رہی تھیں۔

''اللہ کے پاس سب نے جانا ہے، موت کا ذائقہ ہر ذی روح نے چکھنا ہے۔ کوئی جلدی چلا جائے گا تو کوئی دیر سے مگر موت تو برحق ہے۔'' سرفراز احمد ماں کے پاس آ کر بیٹھتے تو وہ اسی طرح کی باتیں کرتیں۔

''مگر بینا کی عمر ابھی جانے کی تو نہیں تھی۔ وہ گئی نہیں ہے، اسے بھیجا گیا ہے اور کسی نے پری پلان بھیجا ہے۔ میں نے ظہیر حسن کی تمام فیملی کی لسٹ بنالی ہے اب مجھے جلد پتا چل جائے گا کہ کس کس گھرانے کی نظر ریحان پر تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو اپنی بیٹی...... ریحان کو دینا چاہتے تھے اور حقیقتاً وہی لوگ ہماری بینا کے دشمن ہوں گے۔ میں ان کے پورے خاندان کو موت کی نیند نہ سلا دوں تو میرا نام سرفراز نہیں۔'' وہ دہاڑتے ہوئے بولے۔

''انہیں پتا تو چل سکے گا کہ وہ کس سے بھڑے ہیں۔ سرفراز احمد...... کوئی معمولی شخصیت کا نام نہیں ہے...... ان جیسوں کو تو میں خرید کر پھینک دوں...... یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا تھے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جائیں گے اور مجھے پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''نہیں بیٹا...... ایسی کوئی بات نہیں ہے، ظہیر حسن کے بہن بھائی ایسے مزاج کے نہیں ہیں اور نہ ہی ان لوگوں نے منگنی توڑنے کی بات کی تھی...... انہوں نے تو تاخیر سے شادی کے لیے کہا تھا تو ہم نے ہی الٹا ان کو باتیں سنا کر کہا کہ ہمیں شادی کی جلدی

ہے۔اسی وجہ سے منگنی کا سامان واپس آ گیا تھا۔ وہ بے چارے تو سب ہی پریشان ہو گئے جب انہیں بینا کے انتقال کی خبر ملی۔ان کے گھر سے سب ہی تو آئے تھے اور بے حد رنجیدہ بھی تھے۔''

''مگر اماں...... یہ باتیں بھی تو آپ نے بتائی تھیں کہ ریحان کی ماں جب مٹھائی بانٹنے اپنے عزیزوں کے ہاں گئیں تو انہوں نے کہا کہ آپ نے اپنے بیٹے کی منگنی کہاں کرلی۔ دونوں خاندانوں کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ان کی تو لڑکی بھی بہت آزاد خیال ہے...... آپ کے گھر میں کیسے چلے گی۔''

''وہ تو ریاض کی بیوی نے کہا تھا۔'' دادی جان کے منہ سے بے ساختہ نکل ہی گیا اور وہ خود ہی سٹپٹا گئیں۔اپنی بات کو ہلکا کرنے کے لیے خود ہی بولیں۔

''ان لوگوں نے صحیح ہی تو کہا تھا ہم لوگ امیر...... وہ لوگ ہمارے آگے غریب ہی تو ہیں فرق تو بہت ہے ناں......!''

''یہ ریاض...... ساجدہ بیگم کے رشتے دار ہوں گے...... ظہیر حسن کی فیملی کی لسٹ میں میرے پاس یہ نام تو نہیں ہے۔''

''ارے بیٹا، یہ تو عام سی باتیں ہیں جو عموماً بولا کرتے ہیں۔'' دادی جان اپنے بیٹے کا ذہن اپنی باتوں کی جانب لگانے کی پوری سعی کر رہی تھیں مگر سرفراز احمد کی حالت تو اس وقت عجیب سی ہو رہی تھی۔

''یقیناً ان کی کوئی لڑکی بھی ہوگی......''

''ہاں ہے مگر نہاں کی تو منگنی ہو چکی ہے اور اس کی شادی بھی جلدی ہونے والی ہے۔ ان کا ریحان اور اس کی فیملی سے کوئی ایسا ناتا بھی نہیں ہے۔''

''میری بیٹی اپنی جان سے گزر گئی، دوسروں کی بیٹیوں کی شادیاں ہوں گی...... ہونہہ، میں بھی دیکھتا ہوں کیسے ہوتی ہے یہ شادی......'' سرفراز احمد ہاتھ میں پکڑا کپ زمین پر مارتے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

''گزشتہ ماہ تو آپ کی پرموشن ہوئی تھی اور آپ کی پی آر اچھی ہونے کی وجہ سے ایک اضافی بونس بھی ملا تھا...... پھر بھی کمپنی کے مالک نے آپ کو نوکری سے کیوں نکال دیا؟'' نسرین بیگم حیرت سے ریاض سے پوچھ رہی تھیں جو خود حیران تھے کہ ان کی یہ نوکری آناً فاناً کیوں ختم کردی گئی۔

''کیا آپ نے پوچھا نہیں کہ کوئی شکایت ہے یا کوئی دوسری بات...... جس کی وجہ سے نوکری جو اتنی پرانی ہے یک لخت کیوں ختم کردی گئی ہے۔''

''ہاں، میں نے یہ سب پوچھا تھا مگر مالک کا یہ جواب تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے...... بس ہمیں اپنا اسٹاف کم کرنا ہے اس لیے چھانٹی شروع کردی گئی ہے۔'' ریاض احمد نے مایوس سے لہجے میں بتایا۔

''کیا کسی دوسرے ورکر کو بھی نکالا گیا ہے۔''

''معلوم نہیں...... میرے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگ خود حیران ہو رہے تھے کہ ایسا میرے ساتھ کیوں ہوا ہے۔اس کا مطلب تو یہی ہے کہ...... فی الحال میں ہی نکالا گیا ہوں۔''

''پریشان مت ہوں، اس شہر میں صرف اکیلی یہی کمپنی تھوڑی ناں ہے۔اللہ آپ کو کسی دوسری جگہ جاب دلوا دے گا۔''

''ہاں، میں اپلائی تو اب ہر جگہ کروں گا۔''

☆☆☆

''دیکھتا ہوں...... یہ ریاض احمد اب کہاں

جاب کرے گا۔فاقے نہ کرنے پڑے تو دیکھوں گا۔'' سرفراز احمد کسی سے فون پر بات کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ریاض احمد کو کسی دوسری کمپنی میں انٹرویو کے بعد رکھ لیا گیا تھا مگر سرفراز احمد کے صرف ایک ہی فون نے ان کو نوکری دینے کے بعد از خود ان سے معذرت کرلی گئی تھی۔اب وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو رہے تھے۔

''آج تک میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا، یہ اب کیا ہو رہا ہے۔'' بہن بھائی...... زبان و اخلاق کے چاہے کتنے ہی برے تھے مگر اس قماش کے ہرگز نہیں تھے کہ بھائی کو یوں نقصان پہنچایا جائے۔

''میری تو نہ کبھی کسی سے کوئی لڑائی ہوئی اور نہ کبھی دشمنی ہوئی...... تو ایسا کون ہے جو مجھے یوں پریشان کر رہا ہے۔'' ریاض دکھ بھرے لہجے میں اپنے چھوٹے بھائی کے پاس جاکر پوچھ رہا تھا۔

''دشمن تو صاف نظر آتے ہیں مگر دوست نما دشمن ہمیشہ چھپے ہوئے ہوتے ہیں، یقیناً یہ آپ کا کوئی ایسا دوست ہوگا جو آپ کے پرموشن سے جلا ہوا اور اس نے ایسا قدم اٹھایا ہو۔''

''مجھے نوکری سے نکالے جانے کے بعد اس کی جلن ختم ہو جانی چاہیے...... یہ کون سی دشمنی ہے کہ کسی دوسری جگہ بھی وہ مجھے کام کرنے نہیں دے رہا۔'' اب وہ خاصے روہانسے سے ہو گئے تھے۔

''بھیا...... اگر ایسی بات ہے کچھ دنوں کچھ نہ کریں۔ دشمن آپ کے سامنے ضرور آئے گا، آپ جاب نہیں کریں گے تو وہ یقیناً کوئی دوسرا وار کرے گا مگر کرے گا ضرور۔''

''ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی تو نہیں بیٹھ سکتا...... نہاں کی شادی سر پر ہے، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔''

''مگر اب کریں گے کیا؟ آپ کا کوئی نادیدہ دشمن آپ کو جاب کرنے تو دے نہیں رہا۔''

''تمہاری ایک شاپ بند پڑی ہے...... کچھ عرصے کے لیے مجھے دے دو تاکہ گھر کا دال دلیہ تو چلتا رہے۔''

''لے لیں...... مگر شاپ کا کرایہ دیجیے گا بہت موقع کی دکان ہے یہ تو آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دے گی۔'' چھوٹے بھائی کو ایسے حالات میں بھی اپنے منافع کی فکر پہلے تھی۔

''تم فکر نہ کرو...... مارکیٹ ریٹ کے حساب سے میں کرایہ بھی ضرور دوں گا۔'' ریاض نے کسی زمانے میں کپڑے کی دکان پر کام کیا تھا اسی کا تھوڑا بہت تجربہ تھا...... بیوی کے مشورے سے ہول سیل مارکیٹ سے کپڑا خریدا اور دکان کا آغاز کیا۔ان کی قیمتیں دیگر دکانوں کی نسبت قدرے کم تھیں اس لیے دکان فوراً ہی چلنے لگی۔

تھوڑا بہت جو جمع سرمایہ تھا اس کا کپڑا لے کر دکان میں ڈال لیا...... اب ریاض مطمئن تھے کہ نوکری کے مقابلے میں دکان کا تجربہ زیادہ بہتر ثابت ہو رہا ہے۔اپنی مدد کے لیے دو سیلز مین بھی رکھ لیے اور دل و دماغ سے پریشانی اور خوف کا چولہ ابھی اترا ہی تھا کہ ایک شب وہ گھر میں سو رہے تھے کہ ان کے چھوٹے بھائی نے موبائل پر اطلاع دی کہ ان کی دکان کو کسی نے آگ لگا دی۔دکان کا کپڑا تو سب جل ہی گیا تھا مگر بھائی کو یہ پریشانی تھی کہ ان کی دکان کو بہت نقصان پہنچا ہے اور جس کا ہرجانہ انہیں ادا کرنا ہوگا اور ریاض احمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سن کیا رہے ہیں اور ہو کیا رہا ہے۔

''کیا کپڑا مارکیٹ کی تمام دکانوں میں آگ لگی ہے؟'' گھبرا کر پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”نہیں بھیا...... صرف آپ کی دکان کو آگ لگی ہے، پولیس نے کہا ہے کہ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔“

”نہیں یہ جھوٹ ہے، سو فی صد جھوٹ...... آگ لگی نہیں ہے لگوائی گئی ہے۔“ ریاض احمد بے اختیار چیخ اٹھے۔

”ہاں، یہ اتفاق نہیں ہوسکتا...... مجھ سے پہلے کی پانچ دکانوں کو چھوڑ کر میری دکان کا ہی انتخاب کیوں کیا گیا اور آگ دکان کھول کر کپڑوں میں لگائی گئی تاکہ نقصان کا تخمینہ زیادہ سے زیادہ رہے۔“

”برا وقت آتا ہے تو کہہ کر آتا نہیں۔“ نسرین بیگم .... شوہر کو دلاسا دے رہی تھیں۔ کسی سے دشمنی کی جانب ان کا دماغ بھی نہیں جا رہا تھا کہ اس قماش کے یہ لوگ ہی نہیں تھے۔

”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے اور میں واقعی یہ جاننا بھی چاہ رہا ہوں کہ آخر وہ ہے کون...... جو میری بربادی سے خوش ہو رہا ہے۔ میں واقعی اس انسان کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں جو مجھے تباہ کرنے کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ پاس رکھا جمع جتھا یہ سوچ کر بزنس میں لگا دیا تھا کہ اس سے دُگنی رقم ملے گی تو نہاں کی شادی میں کام آجائے گی...... مگر یہاں تو اصل رقم بھی ڈوب گئی۔ میری بچی کی شادی کیسے ہوگی؟“ ریاض اپنے نقصان سے زیادہ بچی کا سوچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے...... اور ان کا ہر آنسو نہاں کے سینے پر پہاڑ بن کر گر رہا تھا۔

”کاش مجھے ...... ایدھی کے جھولے میں ڈالنے کے بجائے مجھے بھی مار دیا ہوتا...... تو آج اپنے باپ کو یوں روتے ہوئے تو نہ دیکھنا پڑتا۔“ ٹیوشن کے جمع شدہ پیسے جب اس نے گنے تو وہ پینتیس ہزار نو سو پچاس روپے تھے۔ اس نے یہ رقم جب نسرین بیگم کے ہاتھ پر رکھی تو وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر بلک ہی تو پڑیں۔

”پتا نہیں، کون ہمارے پیچھے لگ گیا ہے...... جسے شاید ہماری بد بختی ہی عزیز ہے۔“

☆☆☆

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، کچھ بھی نہیں...... ان کی پریشانیاں میرے سینے کی دہکتی آگ کو ٹھنڈا نہیں کرسکتیں۔ میں نے اپنی جوان بیٹی کھوئی ہے، میں اپنی معصوم بچی پر کیچڑ اچھالنے والے کو کیسے معاف کرسکتا ہوں۔ بالکل معاف نہیں کرسکتا۔“

”سر آپ کا حکم ہو تو ہم لڑکی کو ختم کردیں۔“ سرفراز کے ملازم نے کہا۔

”نہیں، مجھے ختم نہیں کرنا ہے۔ مجھے اس لڑکی کے چہرے پر اتنی کیچڑ ملنی ہے کہ وہ اسے کتنا ہی چھٹالے مگر اس کا چہرہ کیچڑ سے لتھڑا ہی رہے۔“ سرفراز کچھ جنونی سے لہجے میں یوں ہنستے ہوئے بولے جیسے ان کے سامنے کوئی ایسا منظر چل رہا ہو جس میں نہاں کا چہرہ کیچڑ میں لتھڑا انہیں واضح نظر بھی آرہا ہو۔ ملازم سلام کر کے واپس جا چکا تھا مگر ان کے ہذیانی قہقہے کسی طور نہیں رک رہے تھے۔

☆☆☆

”میں اپنے میکے گئی تھی...... بھائیوں اور بہنوں سب سے ہی قرض کے لیے بات کی...... اپنی ناگہانی پریشانی بھی بتائی مگر وہ کہہ رہے ہیں پانچ، چھ ہزار تو ہم دے سکتے ہیں مگر اس سے زیادہ دینا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ چاروں بہن بھائیوں سے اگر میں قرض لوں تو زیادہ سے زیادہ بیس پچیس ہزار ہوجائیں گے۔“ نسرین بیگم نے شوہر کو راز داری سے بتاتے ہوئے کہا۔

”میں نے بھی یہی سوال اپنے بہن بھائیوں کے سامنے رکھا تھا تو ان کا یہ کہنا ہے کہ نہاں کون سی ہماری سگی بیٹی ہے...... جہیز دینے کی ضرورت ہی نہیں

ہے جبکہ اس کے سسرال سے جہیز کی فرمائش بھی نہیں ہوئی ہے، سادگی سے شادی کر کے اپنی جان چھڑالیں...جو بیکار کی مصیبت از خود آپ نے مول لی ہوئی ہے۔“

”آپ نے انہیں ڈانٹا نہیں...... کہ ہماری بیٹی کے بارے میں یہ سب بولنے کی ہمت بھی کیسے کی۔“ نسرین بیگم نے غصے سے کہا۔

”میں چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا...... کہاں تک لڑوں...... کہ اب تو اپنی اوقات بھی دو کوڑی کے برابر ہے...... نہ پاس پیسہ ہے نہ ہی کوئی نوکری...... مجھے تو لگ رہا ہے کہ دو وقت کا کھانا پینا بھی کہیں... دوبھر نہ ہوجائے۔“

”ایسا بالکل نہیں ہوگا...... حالات چاہے کتنے ہی ابتر ہوجائیں، میرے پاس ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کی ہرگز کمی نہیں ہوگی۔ جس سے کرایہ بھی نکلتا رہے گا اور گھر کے کھانے پینے کا خرچ بھی پورا ہوتا رہے گا۔“ نہاں نے ریاض احمد کی بات سن کر ماں سے کہا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیں کہ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس آنے والی افتاد سے کس طور نمٹیں۔

☆☆☆

”آپ کو جو بات بتائی ہے وہ بالکل سچ ہے...... ان دنوں ہم واقعی کسی ایسے آسیب کا شکار ہیں جس کے بارے میں جانتے تک نہیں ہیں۔ مالی طور پر بری طرح برباد ہوچکے ہیں...... اب ہمیں شادی کی تھوڑی سی مہلت دے دیں تاکہ ہم اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی حسبِ مرضی کرسکیں۔“ ریاض اور نسرین دونوں نے جب اپنے سمدھیانے میں جا کر کہا تو وہ لوگ ششدر سے رہ گئے۔

”ایسا کون ہے جو آپ کو پے در پے نقصان پہنچا رہا ہے؟“

”اس بارے میں ہم لاعلم ہیں مگر بچی کی شادی کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔“

”ریاض بھائی آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں، ان حالات میں تو آپ کو نہاں کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہیے...... اور آپ یقین کیجیے...... نہاں جیسی آپ کی بیٹی ہے، ویسی ہی ہماری بیٹی بن کر رہے گی۔“

”میری بیٹی میرے سر کا بوجھ ہرگز نہیں ہے...... جو میں جلد بازی میں یہ فریضہ بھگتاؤں۔“

”آپ سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ نہاں شادی کے بعد آپ کی بیٹی نہیں رہے گی...... شادی کے بعد بھی آپ جو دل چاہے اپنی بیٹی کے لیے کرسکتے ہیں مگر ہمارا مشورہ یہ ہے کہ نہاں پندرہ دن بعد دلہن بن کر ہمارے گھر آجائے۔“ لڑکے کے باپ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کی جیسی مرضی......“ ریاض احمد کو بھی ان حالات میں یہی صورت زیادہ بہتر لگی۔

☆☆☆

”ایک ماہ ہوگیا...... اس پگلو نے کیا کوئی دوسری نوکری ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا کون سا اس کے پاس قارون کا خزانہ ہے جو وہ جاب بھی نہیں ڈھونڈ رہا یا وہ ہمت ہار بیٹھا ہے۔“ سرفراز فون پر رعونت بھرے لہجے میں کسی سے بات کر رہے تھے۔

”نوکری تو واقعی وہ نہیں ڈھونڈ رہے مگر ان دنوں مصروف بہت ہیں۔“

”بیروزگار شخص کی مصروفیات کیا ہوا کرتی ہیں کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”صاحب، وہ ان دنوں اپنی بیٹی کی شادی میں مصروف ہیں...... دس دن بعد اس کی شادی ہو رہی ہے مگر بے حد سادگی سے ہو رہی ہے۔ فرنیچر میں انہوں نے ایک معمولی سا بیڈ روم سیٹ بک کروایا

ہے۔ان کے پاس پیسے ہی نہیں ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو کچھ دے سکیں اور ان کے بھائیوں نے بھی ان کو قرض دینے سے انکار کردیا ہے اور وہ......؟"

"مگر شادی کیوں ہورہی ہے؟" وہ بات کاٹ کر غصے سے چلائے۔

"سر، اس لڑکی کی شادی پہلے سے ہی طے تھی۔"

"جب میری بیٹی کی شادی اس گھرانے نے تڑوادی تو اُن کی بیٹی کی شادی کیونکر ہوسکتی ہے۔" وہ گرجدار آواز میں بولے۔

"حکم جناب! جو آپ کہیں گے، وہی ہوگا۔" فون کی دوسری جانب شخص نے عاجزی سے کہا۔

"تم لڑکے والوں کے ہاں جا کر کہہ دو...... کہ اگر اس لڑکی سے تم نے اپنے بیٹے کی شادی کی تو تم خود اپنے بیٹے کی موت کے ذمے دار ہوگے۔"

دوسری جانب فون بند ہوگیا تھا مگر سرفراز کا چیخنا چلانا بند نہیں ہوا تھا...... وہ گھر میں چیزیں توڑ رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"جب میری مینا دلہن نہیں بن سکی...... تو میں کسی کو دلہن نہیں بننے دوں گا اور وہ گھرانہ جو میرا مجرم ہے ان کے ہاں شادی کے شادیانے کسی صورت میں نہیں بجیں گے۔ ہاں، ہرگز نہیں بجیں گے۔"

☆☆☆

ریحان آفس سے گھر آرہا تھا...... گرین سگنل پر اس کی گاڑی رکی...... غیر ارادی طور پر اس کی نظر برابر کھڑی گاڑی کی جانب گئی۔ اس میں سرفراز صاحب بیٹھے اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ نظر پڑتے ہی ریحان نے انہیں سلام کیا مگر وہ اسے ایسی خونی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے اسے کھا ہی جائیں گے۔ یکبارگی ریحان نے اپنے جسم میں تھرتھری سی محسوس کی مگر اُن کی یہ کیفیات...... شاید چند ثانیوں کی ہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنس رہے تھے اور یوں ہنس رہے تھے کہ اس میں بریک ہی نہیں آرہا تھا ...... پریشان ہوکر ریحان نے اپنی نظر دوسری جانب کرلی۔ گھر پہنچ کر اس نے ماں سے پہلی بات جو کی وہ یہی کی۔

"امی ...... یہ سرفراز صاحب تو مجھے پاگل سے لگتے ہیں۔"

"پورا گھرانہ ہی شاید سائیکی ہے...... بہت سی باتیں مجھے اس کی ایک سہیلی کے توسط سے بھی معلوم ہوئیں کہ وہ میڈیسن لیتی تھی...... خلافِ توقع کوئی بھی بات ہوجانے پر کبھی کبھار اس کو دورے بھی پڑجایا کرتے تھے۔" ساجدہ بیگم نے بیٹے کو بتایا۔

"اسی وجہ سے اس نے خودکشی بھی کی ہوگی۔" ریحان نے کہا۔

"کیا پتا، کس وجہ سے خودکشی کی تھی...... مگر وہ نارمل لڑکی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کھسکے ہوئے لوگوں سے بال بال بچالیا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" ریحان نے کہا اور اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔

☆☆☆

ڈھولک کی تھاپ خاصی زوردار تھی...... نہاں کی سہیلیاں ڈھولک گیت بھی گارہی تھیں اور ڈانس کی پریکٹس بھی کررہی تھیں۔ آج عصر کے بعد نسرین بیگم اور دیگر خاندان کی عورتوں نے نہاں کو پیلا جوڑا پہنا کر مایوں بٹھادیا تھا۔ ٹھیک دو دن بعد شادی تھی اسی لیے آج قریبی عزیز ریاض احمد کے گھر میں جمع تھے۔

نسرین بیگم مہمانوں کے لیے قورمہ اور کھیر گھر میں بنارہی تھیں۔ شیرمال اور روٹیاں ریاض احمد لینے گئے ہوئے تھے کہ فون کی بیل بجی۔ فون نسرین بیگم نے ہی اٹھایا تھا۔

"ریاض بھائی سے فوری بات کرنی ہے۔" ان کی آواز گھبرائی ہوئی سی تھی۔

"وہ تو روٹیاں لینے گئے ہوئے ہیں، آج ہمارے گھر قریبی عزیز جمع ہیں بس یہ رت جگا ہے۔ ڈھولک کی آواز تو آپ کو بھی سنائی دے رہی ہوگی۔"

"جی ہاں......" نہاں کے سسر کے لہجے میں پریشانی مزین تھی۔

بھائی صاحب ...... نہاں کا بیڈ روم سیٹ انشاء اللہ کل دن میں آپ کے ہاں پہنچ جائے گا۔" نسرین بیگم اپنی بات تفصیل سے کرنے کی عادی تھیں۔ ان کی بات کا جواب دیے بغیر وہ پریشان سے لہجے میں بولے۔

"میں دس منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔"

پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ فون آیا مگر ریاض ابھی بھی گھر نہیں پہنچے تھے ان کا موبائل گھر پر ہی تھا۔

"خیریت تو ہے ناں......؟" ان کے لہجے میں غمگینی سے وہ گھبرا گئیں۔

"ہاں، بات کچھ ایسی ہی ہے اور ہم آپ کے گھر آرہے ہیں۔" وہ بولے اور نسرین بیگم متفکر سی ہوگئیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں میاں بیوی ریاض صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، کمرے کا دروازہ بند کروانے کے بعد انہوں نے کہا۔

"ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ لوگ اور آپ کی بیٹی بہت اچھی ہے مگر اس کے باوجود ہم یہ شادی نہیں کرسکتے اور نہ ہی اس کی وجہ آپ کو بتاسکتے ہیں۔" ریاض صاحب ان کی بات سن کر ہنس پڑے اور بولے۔

"میں جانتا ہوں بغیر جہیز کے لڑکی قبول کرنا آسان نہیں ہوا کرتا مگر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اپنی نہاں کو ہر وہ چیز دوں گا جو آج کے دور میں لوگ اپنی بیٹیوں کو دیا کرتے ہیں۔"

"ریاض بھائی...... چیزوں کا لالچ نہ ہمیں پہلے تھا اور نہ اب ہے...... مگر ہماری مجبوری اتنی بڑی ہے کہ آپ سے معذرت کرتے ہیں کہ اپنے بیٹے کی شادی آپ کی بیٹی سے کسی صورت نہیں کرسکتے۔"

"بھائی صاحب یقیناً آپ کے خاندان والوں نے آپ کو اکسایا ہوگا کہ ایک لے پالک لڑکی سے شادی نہیں کرنی چاہیے مگر ہم نے تو آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی...... آپ کو بتادیا تھا کہ دو دن کی بچی کو ہم ایدھی کے جھولے سے تو ضرور لائے تھے مگر اس کو پڑھانا، لکھانا اور تربیت دینا...... ہم نے ایسا ہی کیا ہے کہ جتنی اپنی اولاد کی کرتے۔ خدارا آپ لوگوں کی باتوں میں نہ آئیں میری بچی مایوں کا پیلا جوڑا پہن چکی ہے اگر اس کے خواب برباد ہوگئے تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔" نسرین بیگم تو اپنی سمدھن کے پیروں میں بیٹھ گئیں اور اپنے آنسوؤں سے ان کے پیروں کو تر کرچکی تھیں مگر وہ دونوں ہی روتے ہوئے بار بار ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہے تھے مگر ریاض صاحب اور نسرین بیگم کی کوئی بات انہیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید...... وہ سننا بھی نہیں چاہ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ریاض صاحب کو سکتہ سا ہوگیا اور نسرین بیگم چکر کھا کر گر پڑیں۔

☆☆☆

ریحان آفس سے آیا تو بے حد خوف زدہ سا تھا...... اور چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"بیٹا خیریت تو ہے ناں......؟"

"آج آفس سے نکلتے ہی مجھے لگا کہ دو بائیک والے میرا پیچھا کررہے ہیں، میں انہیں والٹ چھیننے والے سمجھ کر کچھ دیر کے لیے ایک قریبی آفس میں چلا گیا تا کہ وہ مجھے چھوڑ کر آگے نکل جائیں مگر جب

میں آدھے گھنٹے بعد باہر نکلا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں بائیک والے گھر تک ساتھ آئے ہیں۔“

”بیٹا ان دنوں شہر کے حالات ایسے ہی ہیں، لٹیرے اور چور دندناتے ہوئے گھوم رہے ہیں۔ تم کہہ رہے تھے کہ آفس والے تمہیں پندرہ بیس دن کے لیے لندن بھیجنا چاہ رہے تھے، میرا مشورہ ہے کہ تم فوری چلے جاؤ...... وہاں سے واپسی پر چھٹی لے کر ایک ماہ اپنی بڑی آپا کے پاس دبئی گزار آؤ...... اللہ کرے کہ ہمارے علاقوں میں یہ چوری چکاری کا موسم ختم ہو یا کم ہو...... گزشتہ ہفتے سے ڈرائیور بھی یہی کہہ رہا ہے کہ اس کی گاڑی کا ہر جگہ پیچھا کیا جاتا ہے مگر میں اس کا وہم سا سمجھا تھا۔

”ٹھیک ہے...... ڈیلیگیشن لندن جانے والا ہے میں اس میں سے اپنا نام اب نہیں کٹواؤں گا کہ موسم سرما میں کراچی چھوڑ کر کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا مگر اب تو جانا ہی پڑے گا۔“

”جانے میں ہفتہ دس دن تو یقیناً ہوں گے۔“ ظہیر حسن کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”جی ہاں...... اتنا وقت تو لازمی لگے گا مگر آپ یہ سب پوچھتے ہوئے متفکر کیوں ہیں؟“ ریحان نے باپ سے پوچھا۔

”بیٹا...... وہشت گردوں سے ہر شخص خوف کھایا کرتا ہے...... تم اپنے آفس کی سیکیورٹی کو خاص طور پر ہدایت دے دو...... کہ چیکنگ سخت رکھیں، غیر متعلقہ افراد پر کڑی نظر رکھیں اور خاص طور پر اگر کوئی تمہارا نام لے کر پوچھے تو اسے فوری طور پر تمہارے پاس لے کر نہیں آئیں کہ آج کے واقعے سے تو میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

☆☆☆

”اماں! رات بھی میں نے اپنی مینا کو خواب میں دیکھا......“ سرفراز اپنی ماں کے کمرے میں آ کر کسی بچے کی طرح خوش ہو کر بولے۔

”کیا کہہ رہی تھی میری شہزادی؟“

”کہہ رہی تھی مجھے ریحان نہیں ملا...... وہ بہت یاد آتا ہے۔“

”میری بچی کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔“ دادی جان نے ایک آہ بھر کر کہا۔

”کیسے نصیب میں نہیں تھا۔“ لہجے میں خفگی رچی ہوئی تھی۔

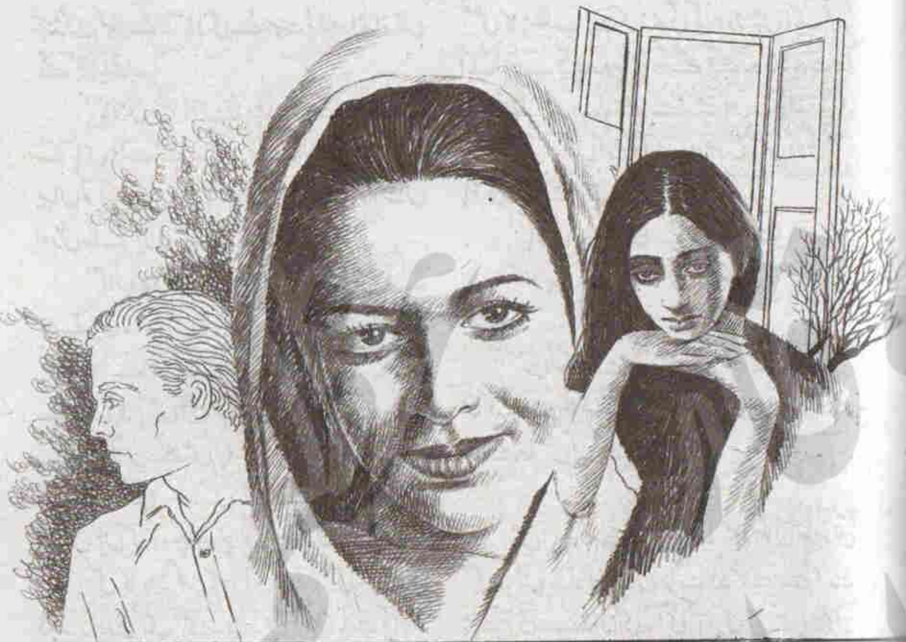
”میری مینا اسے یاد کر رہی ہے، اس کا انتظار کر رہی ہے تو اسے اس کے پاس جانا تو ہوگا، لازمی جانا پڑے گا مگر کیسے جائے گا وہ؟“ سر پر ہاتھ رکھ کر وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائے۔

”ہاں چلا جائے گا وہ...... بڑی آسانی سے سیدھا ہی جائے گا وہ۔ ہاں، میں اس کو اپنی مینا کے پاس بھیج دوں گا پہلے نہ سہی تو بعد میں ہی سہی۔“ اب سرفراز احمد زوردار قہقہے لگا رہے تھے اور ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ ”ریحان کو مینا کے پاس جانا تو ہوگا، وہ اس کو بے حد یاد کر رہی ہے۔“ اور ان کی اماں بیٹے کی باتیں سن کر یکبار کانپ سی گئیں...... اور کھوکھلی سی آواز میں انہیں سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا! ایسے نہیں کہا کرتے، ہماری مینا وہاں بے حد خوش ہے، وہ بہت معصوم سی بچی تھی...... بے حد پیاری تھی...... اور اسی لیے شاید اللہ نے اپنے پاس جلدی بلالیا۔“

”یہی تو میں بھی چاہتا ہوں جب وہ ریحان کو بھی وہاں دیکھے گی تو اور زیادہ خوش ہوگی اور میں بھی خوش ہوں گا...... بلکہ بہت زیادہ خوش ہوں گا۔“ اب وہ وحشت زدہ انداز میں قہقہے لگا رہے تھے۔

باقی آئندہ ماہ پڑھیں۔



فرنچائز

نوشین ناز اختر

”کچھ چیزوں کو، باتوں کو اور رشتوں کو وقت دینا چاہیے، یہ زندگی ہے...... کوئی اسٹار پلس کا ڈراما نہیں ہے کہ ایک شوہر سے یا بیوی سے نہیں بنی تو دوسری شادی پھر تیسری اور پھر چوتھی کر ڈالی۔ ابھی یہ بس نہیں ہوتا کہ پھر واپس پہلی یا دوسری بیوی کو دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ کبھی تم نے توجہ دی ہے ایسے ڈراموں میں جہاں اقدار نہیں ہوتیں ان کی زندگی، ان کا تاثر کبھی قائم نہیں ہوتا، وہ کبھی

لیجنڈ نہیں کہلاتے۔'' باؤ جی نے بہت پُرزور انداز میں مجھے سمجھایا تھا۔

''باؤ جی پلیز! اس تیز رفتاری کے دور میں کس کے پاس وقت ہے کہ تجربہ کرے ایک ورکر پر...... یہاں تو ایک کام والا کام چھوڑ کر جاتا ہے تو دسیوں اور مل جاتے ہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''اور وہ دسیوں بھی دسیوں جگہ چھوڑ کر آئے ہوتے ہیں۔ ان میں قابلیت تو ہوتی ہے لیکن اخلاص نہیں ہوتا ہے اور جہاں ورکر میں وفاداری نہیں ہوتی ہے وہاں کام میں بھی ترقی نہیں آتی۔'' باؤ جی نے بے حد پُریقین لہجے میں کہا۔

''باؤ جی......! مس ارم کے گھر کے اتنے مسائل ہیں کہ وہ بچوں پر پوری توجہ نہیں دے پاتی ہے کبھی کا پین گھر چھوڑ آتی ہے، کبھی بچوں کی ڈائریز پوری نہیں لکھتی۔ والدین کی شکایات کی وجہ سے میں یہ قدم اٹھا رہی ہوں کہ اسے فارغ کر رہی ہوں۔'' میں نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

''وہ تمہارے پاس کب سے ہے؟'' باؤ جی نے سوال کیا۔

''رہی کوئی دس گیارہ ماہ سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور اس کی کتنی شکایتیں ہیں اب تک اس سارے دورانیے میں؟'' باؤ جی نے مجھ سے پوچھا۔

''شکایتیں تو اب زیادہ ہوئی ہیں، پہلے کوئی سیریس مسئلے نہیں تھے۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ہمارے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ غلام کی ستر غلطیاں معاف کرو۔'' باؤ جی نے بے حد تحمل سے جواب دیا۔

''باؤ جی پلیز! یہ دور مختلف ہے، یہاں ایک غلطی کا مطلب ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ایک نمبر، ایک اسٹیپ پیچھے رہ جانا اور مجھے پیچھے رہ جانا بہت برا لگتا ہے۔'' میں نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تو تم مس ارم کو ایک اور موقع نہیں دوگی؟'' باؤ جی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''باؤ جی......'' میں نے برا سا منہ بنایا۔

''اونہہ دے دو...... بس اور ضد نہیں...... بی گڈ گرل۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے منہ بنایا۔ ان کو پتا تھا کہ میں ان کا کہا نہیں ٹالتی اور وہ اس کا فائدہ گاہے بہ گاہے حاصل کرتے رہتے تھے۔

☆☆☆

میں ایک بہت بڑا انگلش میڈیم اسکول چلا رہی تھی۔ میں نے اپنی دن رات کی محنت سے اسے بہت ترقی دے ڈالی تھی۔ اتنی کم عمری میں میرا جنون اور باؤ جی کا پیسہ مجھے بہت اوپر لے کر جا چکا تھا۔ آج ہمارا اسکول ایک کلاس سمبل تھا۔ اس کے علاوہ گزشتہ چار سال کا رزلٹ ہمیں بہت ٹاپ پر لے گیا تھا۔ اب میرا جنون تھا کہ میرے اسکول کا بہترین رزلٹ برقرار بھی رہے۔ اس کے لیے کوالٹی کانشس ہو گئی تھی خود تو میں ہر وقت تنے ہوئے رسے پر چل رہی تھی ...... اپنے سارے اسٹاف کو بھی ٹانگ رکھا تھا۔

میں نے جہاں سختی بڑھائی تھی وہاں تنخواہیں بھی بڑھا دی تھیں تاکہ ضرورت مند اپنی تنخواہ کی وجہ سے اپنا صبر اور برداشت بھی بڑھا دیں۔ میں کچھ عرصے سے اتنی کانشس ہو گئی تھی کہ جہاں مجھے اسٹاف میں کوئی کمی محسوس ہوتی تھی میں ان کو نکال دیتی تھی۔

ایسے میں باؤ جی جو میرے دادا جان تھے...... جنہوں نے مجھے ماما پاپا کی اچانک ایکسیڈنٹ میں موت کے

بعد ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا ہمیشہ ہی میرے ایسے فیصلوں میں دخل اندازی کرتے تھے۔ کبھی تو میں اُن کی بات مان جاتی تھی اور کبھی کبھی وہ بھی میرے جنون کے سامنے بے بس ہو جاتے۔

☆☆☆

''روشنی میں تمہیں کب سے رنگ کر رہا تھا۔'' ایان نے شکوہ کیا تھا۔

''ہاں...... میں ذرا مصروف تھی۔'' میں نے آنکھیں موندھ کر کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ میرے ہونٹوں پر بہت دلفریب مسکراہٹ تھی۔

میں جو اپنے ارادوں اور فیصلوں میں اس قدر سخت تھی ایان کے سامنے ہمیشہ خود کو کمزور محسوس کرتی تھی کیونکہ وہ میری کمزوری تھا۔ یہ ایان کی محبت اور محبت کی شدت ہی تو تھی جو مجھ جیسی لڑکی کو بھی قید کر چکی تھی لیکن میری طبیعت کی بے نیازی تو اسے بھی جھیلنی پڑتی تھی۔ میں اگر بورڈ کی میٹنگ میں ہوتی تھی تو ایان کو بھی اگنور کر دیتی تھی۔

''ہوں...... اوکے، اب کیا پلان ہے؟'' ایان کی یہ عادت کہ وہ میری ہر بات کے آگے سرنڈر کرتا تھا مجھے بہت پسند تھی۔ وہ اپنی فیلڈ کا آئرن مین تھا۔ وہ بھی بے حد روڈ رہتا تھا لیکن یہ سچ تھا کہ جب میری بات سامنے آتی تھی تو وہ خود کو بہت نرم پاتا تھا اس کا یہ رویہ دیکھ کر میں نے اس سے سوال کیا تھا؟

''کیوں......؟'' میں نے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''پہلی بار محبت کی ہے ناں روشنی۔ ان لیمٹ...... آخری بار محبت کی ہے۔'' وہ بے حد سچائی سے بولا تھا۔ اس کا گمبھیر لہجہ میرے اندر کی ساری برف پگھلا گیا تھا۔ جہاں اس نے اپنا آپ ہارا تھا وہاں مجھے سارا کا سارا پا لیا تھا۔

''آں...... ہاں......'' میں لب دبا کر مسکرائی۔

''مجبوری ہے۔'' وہ کہہ کر ہنستا چلا گیا۔

''میں تمہاری مجبوری ہوں؟'' میں نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔

''نہیں...... لیکن تم میری سب سے بڑی کمزوری ہو۔'' ایان نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

''اور تم میری سب سے بڑی مضبوطی ہو۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ ''ہائے رے میری انا...... یہ جو میری اونچی ناک والی انا تھی کبھی مجھے اظہار بھی تو نہیں کرنے دیتی تھی۔''

''ہیلو! آر یو دیر؟'' ایان کی آواز پر میں جو اسی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی ایک دم سے چونکی تھی۔

''آج کا کیا پلان ہے؟'' وہ دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

''جو آپ کہیں......'' میں نے ایان کے سر پر پروگرام ڈالا تھا۔

''ٹھیک ہے، امی آج صبح بھی کہہ رہی تھیں کہ تمہارا جیولر کی طرف وزٹ ہو جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، آپ پک کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''جی میری پیاری مسز۔'' ایان نے بے حد پیار سے کہا۔

''اوکے، میں دو گھنٹے بعد گھر پہ ہوں گی۔'' میں نے فون بند کرنے سے پہلے کہا تھا۔ ایان سے سال بھر پہلے میرا نکاح ہو گیا تھا اب ایک ماہ بعد ہماری رخصتی تھی۔ ایان کی خواہش تھی کہ وہ ہر چیز میری پسند کی لے اس لیے وہ میری فرصت کا انتظار کرتا تھا۔

☆☆☆

''ایان پلیز! مجھے جانا ہوگا۔'' میں نے ایان کی آفر کو اگنور کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ میرے

ساتھ کچھ ٹائم گزارنا چاہتا تھا جبکہ میں ایک سیمینار اٹینڈ کرنے جانا چاہتی تھی۔ کیرئیر کونسلنگ پر یہ سیمینار میں نے ہی آرگنائزڈ کیا تھا۔ اسپیکر بھی میرے پسندیدہ تھے جبکہ ایان ابھی تک نئی نئی شادی کے گلیمر میں تھا۔ وہ میرے ساتھ بہت سارا ٹائم گزارنا چاہتا تھا جبکہ میرے نزدیک وقت ہی دولت تھی جسے میں فضول خرچی کی طرح گزار نہیں سکتی تھی۔ میں نے برا سا منہ بنایا تو ایان نے لمبی گہری سانس بھری تھی۔

"او کے، ایز یو وش۔" وہ ایک بار پھر میری محبت میں مجبور تھا۔ ایان جو کبھی کسی کی نہیں مانتا تھا۔ اتنے بڑے بزنس ٹائیکون کا کامیاب بیٹا تھا۔ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کو اگر کوئی مجبوری تھی تو بس اپنے دل کی مجبوری تھی جو میرے اوپر فدا تھا اور یہ یقیناً میری خوش قسمتی تھی کیونکہ میں اس کا بہت زیادہ فائدہ اٹھالیتی تھی۔ اب بھی میں خوش خوش سیمینار کے لیے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

"روشانے تم نے مس ارم کو کیوں فارغ کیا؟" باؤ جی آج پھر میرے اسکول آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے شادی کے بعد بھی اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔

"چھوڑیں نا باؤ جی۔ وہ اب ہمارے کام کی نہیں رہی تھی۔ بہت زیادہ غیر حاضر دماغ رہنے لگی تھی۔" میں نے بہت سفاکی سے تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"روشانے! انسان کیا مشینوں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں جو اُن کو مہلت نہیں دی جاسکتی؟ اگر وہ تمہارے اسکول کی کلاسوں کے لیے ٹھیک نہیں تھی تو اسے کسی اور کام پر ایڈجسٹ کرلیتا تھا بہت مستحق بچی تھی وہ۔" باؤ جی کو واقعی دکھ ہوا تھا۔

"اور تم نے ضوفشاں کو بھی نکال دیا..... روشانے ..... اپنے پرانے ورکرز کو موقع دیا کرو۔ ایسے ہی نہیں اپنے مضبوط قلعے کی اینٹیں نکال دیتے۔ آج تم ان کی مجبوریوں میں کام آؤ گی تو کل کو وہ تمہاری مجبوریوں میں کام آئیں گی۔ تھوڑی تھوڑی نرمی، صلہ رحمی ایک مضبوط قافلہ بنادیتی ہے۔ تم اپنی اچھی ٹیم کے بل بوتے پر بہت آگے نکل سکتی ہو لیکن اکیلے کبھی نہیں۔" باؤ جی نے مجھے وارننگ دی تھی۔

"ایک منٹ! ایک منٹ باؤ جی...... یہ کیا بات کی آپ نے؟ مجھے کوئی مجبوری ہوگی...... مجھے ان لوگوں کی مدد کی ضرورت ہوگی؟ کیا لطیفہ ہے۔ مجھے ...... مجھے کیوں کسی کی مدد کی ضرورت ہوگی؟" غصے سے میرے ماتھے پر ڈھیروں بل موجود تھے۔

"کیوں نہیں ضرورت ہوگی ......؟ تم ایک معاشرتی انسان ہو، ویسے بائی داوے تم کو ہر ٹیچر کی ضرورت ہے، وہ تمہاری ضرورت پر ہی اس اسکول میں موجود ہیں۔" باؤ جی بھی میرے ہی دادا تھے بے حد صاف گو۔

"میں ان کی خدمات کی قیمت ان کی قابلیت سے زیادہ دیتی ہوں، ضرورت میں نہیں وہ مجھ سے پوری کرتیں ہیں۔" میں اپنے نقطۂ نظر سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

"روشانے! تم خود پسندی کے آئینوں میں گھر گئی ہو۔ تم کو دائیں بائیں، آگے پیچھے اپنے سوا کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ میری پیاری بیٹی! یہاں اس جگہ ایک دن تم اکیلی پڑ جاؤ گی۔ ان آئینوں کی جگہ بہت ظالم ہے۔ بہت تنہائی ہے، بہت نقصان ہے۔" باؤ جی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوتا باؤ جی! جن کے سروں پر بڑوں کی دعائیں ہوں ان کو کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے اور آپ ایسے ہی حساس ہورہے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کی پوتی ہوں، زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ سمجھ بوجھ تو آپ جیسی ہوگی ناں؟" میں نے باؤ جی کی بات کو غیر سنجیدگی سے لیتے ہوئے کہا تھا۔

"سمجھ بوجھ بھی تب تک کام دیتی ہے جب تک اچھا وقت ہو۔ اپنے اچھے وقت کے لیے ایک ہی بات اہم ہے۔ لوگوں کے کام آنے کی طاقت تمہیں اخلاقی، معاشی اور معاشرتی طور پر بہت مضبوط بنادے گی مگر......" انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی وہ حساب بے باق کرنے پر تلے ہوئے تھے یا پھر کوئی پرامس لینے کے موڈ میں تھے۔ جانے کیوں وہ اتنی سی بات کو اتنا سیریس لے رہے تھے۔

"باؤ جی......!" میں نے بے حد برا منہ بنایا تھا۔ "ایسا کیا ہوا ہے جو آپ اتنے سیریس ہورہے ہیں۔" مجھے اپنے پیارے باؤ جی کا اپنے لیے اتنا منفی خیالات محسوس کرنا بہت برا لگا تھا۔

"روشانے! سگی ماں ہی بچے کو آگ کے پاس جانے سے روکتی ہے، سوتیلی ماں کو بچے کے اچھے برے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مجھے اپنے عمر کا تجربہ کچھ محسوسات دے رہا ہے اور تم میرا کل اور اکلوتا اثاثہ ہو اور ایک اچھے بزنس مین کو اپنے اثاثے سے بہت پیار ہوتا ہے میرے بچے۔" وہ اٹھ کر میرے قریب آ کھڑے ہوئے تھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میرے اندر بہت سی شوریدہ سر لہریں اٹھ رہی تھی لیکن باؤ جی کے یوں سر پر ہاتھ رکھتے ہی ایسے ہوگیا جیسے منہ زور پانی کے آگے بند باندھ دیا جاتا ہے۔ کچھ بھی تھا۔ باؤ جی مجھے بے حد عزیز تھے۔ اس لیے میں نے مزید بات نہیں کی تھی۔

☆☆☆

"کم آن روشنی بہادر بنو! باؤ جی انشاءاللہ بہت جلد ٹھیک ہوکر آجائیں گے۔ تم بھی اپنے اسکول کے ایگزامز کے بعد ان کے پاس چلی جانا۔" ایان نے مجھے تسلی دی۔

باؤ جی کو ڈاکٹر نے بائی پاس کا کہا تھا اور وہ انگلینڈ اسی سلسلے میں جارہے تھے۔ وہاں میری سگی خالہ اور ان کی بھانجی رہتی تھی۔ باؤ جی ہماری فیملی کے واحد بزرگ تھے اور سب کو بے حد عزیز تھے۔ میں جانتی تھی کہ خالہ خالو باؤ جی کا بے حد خیال رکھیں گے لیکن میرا جانے کیوں دل گھبرا رہا تھا۔ مجھے ہوش سنبھالتے ہی چھتنار درخت جیسا واحد اور مکمل رشتہ صرف باؤ جی کا ملا تھا۔ میرا یوں پٹی ہونا غیر معمولی نہ تھا لیکن میرے جیسی حقیقت پسند لڑکی کا اس قدر بوکھلانا، گھبرانا اور حواس باختہ ہونا ایان سمیت سب کے لیے غیر معمولی تھا۔ جانے میرے دل کے ریڈار پر کچھ عجیب سے سگنل آرہے تھے جن کو میری تو کوئی نام تک دینے کی ہمت نہیں تھی۔

☆☆☆

آج کا دن باقی دنوں سے بہت روشن اور چمکیلا تھا۔ بہت دنوں کی شدید سردی کے بعد آج اتنا روشن دن طلوع ہوا تھا لیکن میری قسمت کا دن غروب ہوگیا تھا شاید...... میرے سسر نے اپنی سیکریٹری سے شادی چوری چھپے کررکھی تھی۔ وہ میرے سسر کی اتنی بڑی پراپرٹی کو پورے ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد اپنے نام کرواچکی تھی۔ اس کا فراڈ جانتے ہی میرے سسر کو شدید اٹیک آیا تھا جس کے باعث وہ ہم سے

ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔ میری ساس کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ شوہر کی بے وفائی پر روئیں یا اُن کی جدائی پر یا پھر اس مالی نقصان پر روئیں جس کے لیے تمام عمر انہوں نے اپنے میاں کے ساتھ ہمیشہ محنت کی تھی۔

ایان جیسے مضبوط اعصاب کے مالک مرد کے لیے بھی یہ سب کچھ برداشت سے باہر تھا۔ وہ بھی بری طرح بکھر گیا تھا۔ میں سب کو سنبھالتے سنبھالتے تھک سی رہی تھی۔ مجھے باؤ جی کی غیر موجودگی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

"باؤ جی! مجھے آپ کی ضرورت ہے۔" میں رو پڑی تھی۔

"میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی! فکر نہ کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے نقاہت بھری آواز میں کہا تھا۔

لیکن شاید اب مزید کچھ ٹھیک ہونا باقی نہ تھا۔ اسی شام کو اطلاع آئی کہ باؤ جی مجھ سے ملے بغیر مجھے چھوڑ گئے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ میں آج اب یتیم ہوئی ہوں۔ بہت سارے دن...... شاید بہت سارے مہینے...... مجھ پر زندگی ایسے گزری جیسے میں ایک فلاسک میں بند تھی جہاں آکسیجن نہیں تھی اور میں دم کے گھٹنے سے روز مر رہی تھی۔ ان موت کے دنوں میں اچانک ہی مجھے واپس آنکھیں کھولنی پڑی تھیں۔ ایان پر بہت شدید قاتلانہ حملہ ہوا تھا جو میرے ہی وائس پرنسپل نے کروایا تھا۔ وہ میرے اسکول کے ڈائریکٹرز میں بھی شامل تھا۔

بہت عرصے بعد ایان نے میرے اسکول کو دیکھا تو پتا چلا کہ سب کچھ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ ایان کا بزنس تو اب رہا نہیں تھا۔ سب کچھ دوسروں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ خود ایان ہر وقت مقدموں اور عدالتوں میں پھنس کر رہ گیا تھا لیکن سب بے سود رہا کیونکہ ایان کے فادر کی دوسری بیوی بہت ہوشیاری سے سب کچھ خود اپنے...... نام لکھوا چکی تھی۔ یہ تو میری حیثیت تھی جو اب تک ہم سڑکوں پر نہیں آئے تھے لیکن باؤ جی کی ڈیتھ کے بعد جیسے میں نے دنیا سے منہ موڑا تھا... وہ چند ماہ بھی دوسروں کو موقع دے گئے تھے۔ جن پر میں نے اعتبار کیا تھا آج وہ میرے اسکول پر قبضہ کر رہے تھے۔ ایان تو پہلے ہی اس چیز کے ڈسے ہوئے تھے، پہلے وہ اپنے اثاثوں کے لیے عدالتوں میں رُل رہے تھے اب ایک دم سے میرے اسکول کا ایشو سامنے آ گیا۔ انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑا اور خود اسکول کی دیکھ بھال کے معاملوں میں لگ گئے۔

دوسرا ڈائریکٹر جو میری غیر موجودگی میں مالک بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی نیت سارے سسٹم پر خراب کر چکا تھا۔ ایان نے سختی سے کام لیا تو ظالم نے ایان پر حملہ کروا دیا۔ ایان بری طرح زخمی تھا۔ اتنے برے حالات میں ہر روز کچھ نہ کچھ برا ہو رہا تھا۔ میں بالکل سنبھل نہیں پائی تھی۔ ایان پر حملہ تو یوں لگتا تھا کہ میری ہستی کی دیوار پر آخری جھٹکا تھا۔ ایان کو اسپتال میں یوں لیٹے دیکھ کر میں دھاڑیں مار کر رو دی تھی۔

"تمہیں بہت بہادر بننا ہے! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم حالات کا مقابلہ کرو گی، ہار نہیں مانو گی۔" ایان نے ہوش میں آتے ہی ٹوٹے پھوٹے لہجے میں پہلی بات یہی مجھ سے کہی تھی اور میں نے جانے کیوں خود کو اتنا کمزور پا کر بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

"میڈم جی...... آپ کو اتنی جلدی اسکول نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی تو سر بیمار ہیں۔" میرے اسکول کے کلرک نے مجھ سے کہا تھا۔

میں نے چپ چاپ اسے دیکھا... پھر اپنے آفس میں آ کر بیٹھ گئی۔ یہ وہ لوگ تھے جو کل تک میرے وہاں سے گزرنے کی اطلاع سن کر بھی سہم جاتے تھے اور اب...... وقت کس قدر بدل گیا تھا۔ میں بکھر گئی تھی...... بہت زیادہ دھچکا لگا تھا مجھے۔ وہ بلڈنگ جس میں میرا اسکول تھا...... وہ ابھی تک رینٹ پر تھی۔ قریشی نے وہ بلڈنگ ایک اور انویسٹر کی مدد سے خرید لی تھی۔ بے شک اسکول میرا تھا لیکن فوری طور پر میں اتنے بڑے سسٹم کے ساتھ کہاں موو کرتی۔ پھر میری سب ٹیچرز اور کوارڈی نیٹرز کو قریشی توڑ رہا تھا۔ میں واقعی بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ مجھے اور ایان کو زندگی میں پہلی بار دھوکے کا سامنا ہوا تھا۔ ہم روز ایک نئے فنانشل کرائسز سے گزر رہے تھے۔ ہم روز ایک دھچکا سہہ رہے تھے۔ میری دوست فارینہ ایان کی خبر لینے آئی تو میں بچپن کی دوست کے سامنے اپنا دکھ بولتے بولتے پھٹ پڑی تھی۔

"مجھے حیرت ہے کہ ایان بھائی اور تم دونوں کیسے گھروں میں بیٹھے رہے؟ دوسروں کو موقع دیتے رہے کہ وہ تم لوگوں کے ساتھ دھوکا کریں۔" وہ کچھ حیرت اور غصے سے بولی تھی۔

"تم نہیں جانتی کیا......؟ ایان اپنے مسئلوں میں پھرتے رہے تھے اور میں تو بس باؤ جی کے بعد......" میری آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئی تھیں۔ فارینہ بغور مجھے دیکھتی رہی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ میرے قریب آ کر نہیں بیٹھی۔ نہ مجھے گلے سے لگایا نہ ہی کوئی تسلی دی تھی۔ مجھے غصے سے دیکھتی رہی۔

"تم مسلمان ہو نا......؟" وہ یوں پوچھ رہی تھی جیسے مجھ سے متعلق اس کی معلومات کمزور ہوں۔

"یہ کیسا سوال ہے، تم نہیں جانتی کیا......؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا تھا۔

"تم اس معاملے کو چھوڑو کہ سوال کیسا ہے اور میں کیا نہیں جانتی۔ تم بس میرے سوال کا جواب دے دو۔"

"ظاہر ہے کہ میں مسلمان ہوں۔" میں نے چڑ کر کہا تھا۔

"ظاہر۔" فارینہ نے ظاہر پر بہت زور ڈال کر کہا تھا۔

"نہیں روشانے، 'ظاہر' نہیں ہو رہا ہے۔ 'ظاہر' کا مطلب تو نظر آ جانا ہوتا ہے ناں؟ کسی چیز کا صاف ظاہر ہونا ہوتا ہے ناں......؟ تو روشانے مسلمان پر اللہ رحمٰن اور آپ ﷺ نے مرے ہوئے شخص کا تین دن سے زیادہ سوگ منع فرمایا ہے ماسوائے بیوی کے جس کو عدت کے چار ماہ دس دن سوگ میں گزارنے ہوتے ہیں۔ ایک صحابیہ تھیں انہوں نے اپنے بھائی کی وفات کے تین دن بعد خوشبو لگائی نیا سا لباس پہنا اور اپنے احباب سے کہا کہ میرا دل قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ میں ایسا کروں لیکن میرے سرکارِ دو عالم ﷺ کا فرمان ہے کہ تین دن سے زیادہ سوگ نہ کرو۔ میں نے یہ سب اس لیے کیا کہ میں بتانا چاہتی تھی کہ میں نے سنت پوری کی ہے۔ روشانے اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں اسلام کی بتائی ہوئی باتیں ماننی چاہیے ناں......؟" میں نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"نہ کہ وہ باتیں جو ہمارا دل کہے۔ دل کہے تو اتنی سی بات مان لیں جتنی کہ اس کی مرضی ہے دل نہ مانے تو اپنی مرضی کرنی۔" فارینہ نے دکھ سے کہا تھا۔ "یہ کیا بات ہوئی......؟" ہم...... زندگی کی بنیادی باتیں تک تو مانتے نہیں اپنے مذہب کی تو پھر

کیسے اپنے نقصان کا ذمے دار اللہ رحمٰن کو ٹھہرا دیتے ہیں؟ جب اس نے بہت پہلے سے بتا دیا کہ یہ کرو گے تو یہ ملے گا۔ وہ کرو گے تو وہ ملے گا پھر جب پورا کوڈ آف لائف اس نے دے دیا ہے تو پھر کیوں ہم خود سے سوال کرتے ہیں کہ ایسا ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ ہم ایسا کچھ کرتے ہیں کہ ہم کو وہ چیز فیس کرنی پڑتی ہے ناں......؟" فارینہ کی چھوٹی سی بات نے میرے دل پر سے بوجھ ہٹا دیا تھا۔ اتنے عرصے سے میں ہر روز ہر پل اللہ سے شکوہ کر رہی تھی کہ کیوں......؟ کیوں اللہ نے میرے ساتھ اتنا برا کیا؟ آج فارینہ کی باتوں سے میرے اندر یہ احساس جاگ گیا تھا کہ میری ہی غلطی تھی۔

"واقعی جب تک ہم اپنی غلطی کی ذمے داری دوسری جانب رکھتے ہیں تو ہم بہت زیادہ رنجیدہ ہوتے ہیں لیکن جب ہم اپنی غلطی کی ذمے داری لے لیتے ہیں تو وہ ہمالیہ جیسا بوجھ دل سے اتر جاتا ہے۔ میں بھی کچھ اسی طرح کے احساس میں تھی۔ واقعی مجھے اللہ سے شرمندگی ہو رہی تھی کہ میں نے کوئی شکوے بھرا لمحہ نہیں چھوڑا تھا۔ گزشتہ اتنے عرصے سے یہ سوچ بنا کہ قصور تو میرا تھا۔ بے شک میں غمگین تھی لیکن مجھے صبر کرنا چاہیے تھا۔ مجھ میں اگر تین روز بعد کاروبارِ زندگی دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا تو بھی مجھے مہینوں سوگ میں گھر اور دنیا سے الگ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تو خود دوسروں کو چور بنایا تھا۔ جب ہر چیز لاوارث چھوڑ دی تھی تو اگر نقصان ہوا تو اس میں اللہ کا کیا قصور تھا؟ جوں جوں بات میرے دل کو لگی میں نہ صرف ہلکی پھلکی ہو گئی بلکہ میرے دل و دماغ سے مایوسی اور خود ترسی کی دھند چھٹ گئی تھی۔

"تھینکس فارینہ تم نے واقعی مجھے اندھیرے سے نکالا ہے۔" میں نے احسان مند ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"بس اب جو ہوا سو ہوا...... حوصلہ اور عقل استعمال کرو اور اپنے ٹوٹتے، بکھرتے کاروبار کو دوبارہ سنبھالنے کی کوشش کرو۔ تم کورٹ سے سال چھ ماہ سے کم اسٹے نہ لینا۔ تم کو اتنی جلدی وہاں قریب اچھی بلڈنگ نہیں ملے گی اور اگر تم دور جا کر اپنا سسٹم شروع کرو گی تو تمہارے ایڈمیشن اور مارکیٹ دونوں خراب ہوں گے۔ تم فوراً عمارت خالی کرنے کے بجائے اسٹے لو۔ پرانے مالک پر بھی کیس کرو کیونکہ اس نے نوٹس دیے بنا یہ سب کام کیا ہے اور یہ جو ہوا اڑی ہے کہ عمارت بک گئی، اسکول بک گیا فوراً روکو اس کو۔ سختی سے اور حکمتِ عملی سے کام لو۔" فارینہ کی باتیں میرے اندر روشنی اور انرجی کا کام کر رہی تھیں۔

میں بہت زیادہ شرمندہ تھی میں نے ہمیشہ اسے مولانا کہہ کر چھیڑا تھا۔ اس کے قرآن پاک اور تفسیر کو پڑھنے کو ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ میں اکثر کہتی تھی کہ بجائے وہ کوئی کمپیوٹر وغیرہ کا کورس کرتی اس نے قرآن پاک کی تفسیر پر کیوں اپنا ٹائم لگایا؟ آج بے شک وہ مجھ سے بہتر زندگی گزار رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ پُرسکون اور آزاد زندگی گزار رہی تھی۔ فارینہ کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ جو لوگ اسلام کو اپنی زندگی پر اپلائی کرتے ہیں وہ دقیانوسی نہیں ہوتے بلکہ بہت زیادہ آزاد ہوتے ہیں۔

☆☆☆

"گڈ مارننگ میم!" بچوں کا ایک ٹولہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے کورس میں بولا تھا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

"بیٹا ذرا رکو!" میں نے ان کو پیچھے سے آواز لگائی تھی۔ بچے کچھ سہم کر رک گئے تھے۔

"یس میم۔" بچوں نے مجھے ڈری ڈری نظروں سے دیکھا تھا جیسے میں اُن کو ان کی کسی بات پر روکنے ٹوکنے والی تھی...... میں ان کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔ جس پر جواباً وہ مسکرائے تھے۔ ان کی ہمت بندھ گئی تھی کہ میں یقیناً ان کو ڈانٹنے والی نہیں ہوں۔

"بیٹا پہلے السلام علیکم کہتے ہیں پھر ساتھ وِش کرتے ہیں۔" میں بدل گئی تھی۔ کیا واقعی یہ میں کہہ رہی تھی؟ میرے اندر خود کوئی حیران ہوئے جا رہا تھا۔

"اوکے میم۔"

"السلام علیکم میم!" بچے کہہ کر آگے بڑھ گئے تھے بچے تو کورے کاغذ ہوتے ہیں جو مرضی لکھ لو۔

"وعلیکم السلام!" میں نے لرزتے ہونٹوں سے جواب دیا...... اور ان کو جاتے ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ہاں بہت زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں نے پہلا کام جو کیا تھا وہ بچوں کی ورک بکس میں ڈیلی میزز کے جملے بدل دیے تھے۔ گڈ مارننگ سے پہلے السلام علیکم کا استعمال لازمی کیا تھا۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی قرآنی آیات اور دعائیں شامل کی تھیں۔ میرے سلیبس میں پہلے صرف انگلش پر زور تھا اور اس طرح کی کوئی بات شامل نہیں تھی۔ اس سے پہلے کنڈر گارڈن انگلینڈ سے منگوایا کورس پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسلامک اسٹڈیز کی ٹیچر کو بلوایا کہ وہ آسان سا لیکن بہت بنیادی سلیبس چھوٹے بچوں کے لیے ہمیں بنا کر دیں تا کہ ہم بچوں کو صرف انگریز نہ بنائیں بلکہ اچھا مسلمان بھی بنائیں تا کہ وہ آئندہ زندگی میں کچھ ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بن سکیں۔ یہ میرا پہلا قدم تھا بے شک میرے مسائل سے ریلیٹڈ

نہ تھا لیکن میں جانتی نہ تھی کہ وہ رب کریم ہے وہ تو نیتوں کا بھی اجر دیتا ہے۔ وہ تو چھوٹی نیکی کی برکت اتنی دیتا ہے جو ہماری کسی بڑی انویسٹمنٹ کا بدلا ہی ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

بہت پہلے باؤجی کی کہی بات آج میرے ارد گرد گونج رہی تھی۔ "روشانے...... تمہاری خدمت کرنے کی طاقت تمہیں اخلاقی، معاشی اور معاشرتی طور پر بہت مضبوط بنا دے گی۔ روشانے اپنے پرانے ورکرز کو موقع دیا کرو۔ ایسے ہی نہیں اپنے مضبوط قلعے کی اینٹیں، نکال دیتے۔ آج تم ان کی مجبوریوں میں کام آؤ گی تو کل کو وہ تمہاری مجبوریوں میں کام آئیں گی۔" باؤجی نے مجھ سے کہا تھا اور کتنا درست کہا تھا۔ تب میں نے کتنا غصہ کیا تھا...... کہ مجھے بھلا کیسے کسی کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟ کتنا خود پر غرور تھا اپنی سوجھ بوجھ پر کتنا ناز تھا تب باؤجی نے کتنی سچی بات کہی تھی۔ "سمجھ بوجھ بھی تب کام دیتی ہے جب تک اچھا وقت ہو اور اپنے اچھے وقت کے لیے ایک ہی اہم بات ہے کہ ہم دینے والا ہاتھ بنیں۔" میں نے زندگی کی اس روشنی کو "آگ" جانا تھا لیکن اب مجھے اپنے حصے کی روشنی اکٹھی کرنی تھی کہ آئندہ زندگی اندھیروں میں نہ گزار سکوں۔ میں نے ایک لسٹ بنائی تھی...... یہ ان لوگوں کے ناموں

کی لسٹ تھی جن سے مجھے اپنی غلطی کی معافی مانگنی تھی۔

جیسے جیسے میں نام لکھ رہی تھی میرا دل ڈوب رہا تھا کیونکہ وہ بہت لمبی لسٹ تھی۔ آج میں، خود کو خود کی عدالت میں کھڑا کر رہی تھی تو میری جان نکل گئی تھی اور اگر یہ سب لوگ اللہ کی عدالت میں میرے خلاف جا کھڑے ہوتے تو میرا کیا بنتا؟ آنسو تھے کہ میرا دامن بھگوئے جا رہے تھے۔ جن ٹیچرز سے میں معافی مانگ سکتی تھی اپنا بھرم رکھتے ہوئے میں نے ان کو کرٹسی کال کیں اور ان سے خاص طور پر کہا کہ اگر ان کو آئندہ کبھی کوئی مسئلہ ہو تو وہ مجھے یاد رکھیں، میں انشاءاللہ ان کی ضرور مدد کروں گی اور جن ٹیچرز کو نوکری کی ضرورت تھی میں نے ان کو دوبارہ اپنے اسکول میں جگہ دی تھی۔ کچھ کو میں نے اپنے اسکول کی ایوننگ کلاس کے لیے ہائر کیا جب میں ان کو فون کر رہی تھی تو میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے تقریباً سب کو اپنے پاس ایڈجسٹ کرنا پڑے گا کیونکہ بہت سی لڑکیاں جاب لیس تھیں۔ میری مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ لیکن میں نے سب کو ویلکم کہا تھا وہ اتنی ساری تھیں اور میری ضرورت تھوڑی تھی لیکن میں اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتی تھی میں نے سب کو بلا لیا تھا۔ ان ٹیچرز کو جاب پر لگانے کے لیے میں نے فل ڈے اسکول کا پروگرام بنایا جو کہ میر لیے سپورٹنگ پلر کا کام دینے لگا تھا۔

حیران کُن طور پر اس پروجیکٹ کو لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ والدین نے بہت خوشی سے اپنے بچوں کو شام میں بھی بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح والدین کی شام کی اکیڈمیز سے جان چھٹ گئی تھی اور میرے نئے پروجیکٹ کو بہت کامیابی ملی ۔ مجھے معاشی طور پر جو مسلسل جھٹکا لگ رہا تھا وہ جھٹکا لگنا بند ہوا میرے، بہت سارے معاملے سلجھنے لگے تھے۔

☆☆☆

آج کا دن اتنا روشن نہ تھا۔ مسلسل سردی کی وجہ سے دھندسی تھی۔ سورج بھی بادلوں میں چھپا بیٹھا تھا لیکن میری قسمت کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی کچھ غلطیاں سدھاری تھیں اور رب سوہنے نے مجھے میری اوقات سے زیادہ انعام دیا تھا۔

ایان پورے تین ماہ بعد گھر آ رہا تھا۔ وہ اسٹک کے ساتھ اب تھوڑا تھوڑا چلنے لگا تھا ایان کو خود اپنے قدموں سے چلتے دیکھ کر میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے تھے۔ جہاں اب ایان کے چلنے کی آس تک ختم ہونے لگی تھی وہاں.... اللہ نے ایان کی مردہ ٹانگوں میں دوبارہ زندگی ڈال دی تھی۔

''مبارک ہو!'' میں نے آنسو ضبط کرتے ایان کو مبارک باد دی تھی۔

''پتا ہے روشنی ان تین ماہ بیڈ پر بے بسی کی زندگی جیتے میں نے کیا سوچا تھا؟'' ایان نے کرسی پر بیٹھ کر سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟'' میں بھی ایان کے پاس بیٹھ گئی۔

''اگر اللہ نہ چاہے تو ایک پتا تک نہیں ہل سکتا۔ کتنی بار میں دن میں اپنی ٹانگوں کو زور دیتا تھا، حکم دیتا تھا لیکن وہ میرا کہا سنتی ہی نہیں تھیں۔ ایسے جیسے وہ میرے اعضا کے ساتھ جڑ کر بھی میرے وجود کا حصہ نہیں تھیں تب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ جو میں ساری عمر بھاگتا دوڑتا رہا وہ میں اپنی مرضی سے نہ تھا بلکہ اللہ کی رحمت تھی اللہ کی مرضی تھی۔ روشنی تب پہلی بار میں نے اللہ کی مرضی مانگی تھی کہ وہ میری صحت یابی کی رضا دے دے۔'' ایان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میری بھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہم ٹھوکر کھا کر سنبھلے تھے۔

میں اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ہم ٹھوکر ضرور کھائے تھے لیکن سنبھل گئے تھے اور ہمیں اللہ نے سنبھالا نہ دیا ہوتا تو ہماری تو ساری کشتی سوراخوں سے بھری ہوئی تھی جس کا ڈوبنا کنفرم تھا۔

''بیگم صاحبہ باہر کوئی مس ارم اور ان کے شوہر آئے ہیں۔'' میری ملازمہ نے آ کر اطلاع دی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں عام ملازموں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتی گھر میں لیکن اب اس گھر میں کوئی اور روشانے رہتی تھی۔

''تم ان کو اِدھر ہی لے آؤ۔'' میں ایان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی۔

مس ارم اور اس کے میاں دونوں بہت مسکراہٹ لیے داخل ہوئے تھے۔ جواباً میں نے بھی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ان لوگوں کا استقبال کیا تھا۔ مس ارم کو میں دوبارہ اسکول لے کر آئی تھی۔ وہ کچھ عرصے سے مسلسل جاب لیس تھی ۔ میرے ہاں نوکری کرنا اس کی بے شک اشد ضرورت تھی لیکن اس بار ارم کو میں اپنی ضرورت کے تحت لائی تھی۔ مجھے معافی کی ضرورت تھی۔

''میڈم جی، ارم آپ کی ہمیشہ بڑی تعریف کرتی ہے، مس ارم کے میاں نے مسکرا کر کہا۔

''آپ نے جی ہمارے مشکل حالات میں بہت مدد کی۔ میری نوکری ختم تھی' پراپرٹی ڈیلر کا کام شروع کیا تھا وہ بھی ٹھپ تھا جی۔ آپ نے اسے گھر بیٹھے کام پر بلا لیا۔ ہماری مشکل آسان کی اللہ آپ کو خوش رکھے جی۔'' وہ مسلسل احسان مندی سے بولے جا رہا تھا اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ مس ارم کو ایک بار میں بغیر کسی بڑی وجہ کے نوکری سے نکال بھی تو چکی تھی لیکن ان اللہ کے بندوں نے میری وہ کوتاہی بالکل بھلا دی تھی۔

”مس ارم بہت اچھی ٹیچر ہے۔ ارم کے اسکول سے چلے جانے کے بعد مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے ارم کو واپس بلوا کر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ اپنی غلطی کا مداوا کیا ہے۔ میں تو پہلے بھی مس ارم سے معذرت کر چکی ہوں اب بھی کرتی ہوں۔“ میں نے بے حد دل سے معافی مانگی تھی۔

”میڈم جی، آپ اس طرح بار بار شرمندہ تو نہ کریں جی۔“ مس ارم واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

”وہ میڈم جی آپ کے اتنے احسان ہیں ہم پر جب ارم نے آپ کی بلڈنگ کے مسئلے کے متعلق مجھے بتایا تو میں نے ایک پارٹی سے بات کی تو اللہ کے کرم سے وہ مان گئی ہے۔ ان کو ایڈوانس ذرا زیادہ چاہیے۔ ہاں کرایہ وہی ہوگا جو پہلے آپ دے رہی ہیں۔۔۔اور پانچ سال سے پہلے وہ خالی بھی نہیں کروائے گا کیونکہ وہ خود باہر جا رہا ہے۔“

”یہ بلڈنگ ہے کہاں۔ آپ کو شاید پتا ہو کہ ہمارا اس جگہ سے دور جانا ہمارے ڈھیروں ایڈمیشنز کا نقصان ہے۔ ہم اپنی جگہ نہیں بدل سکتے نا......“ میں نے پریشانی سے کہا کیونکہ تین ماہ بعد ہمارا اسٹے ختم ہو رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ اس سے پہلے کرنا ہی تھا۔

”میڈم جی مجھے ارم نے بتا دیا تھا۔ میں جانتا ہوں جی اس مسئلے کو تبھی تو جی میں نے بالکل مین بلڈنگ تلاش کی ہے جی...... یہ تو جی اللہ نے جیسے جھولی میں ڈال دی۔ آپ کے اسکول کے بالکل سامنے مین روڈ پر ہے جی یہ بلڈنگ احمد نرسری کے ساتھ۔“

”کیا......؟“ میں حیرت اور خوشی سے بولی تھی۔ ہماری موجودہ بلڈنگ کچھ آڑ میں تھی۔ اس لیے اس کی مارکیٹ کم تھی لیکن جو جگہ وہ بتا رہا تھا اس روڈ پر بلڈنگ حاصل کرنے کا خواب تو سالوں سے تھا قریب بس اسٹاپ تھا۔ پارکنگ بہت اچھی تھی سب سے بڑی بات بلڈنگ مین روڈ تھی۔

”بس میڈم جی میں نے تو اپنی طرف سے ان کو ہاں بول دی ہے۔ اب آپ بھی ہاں بول دو تا کہ شام میں، میں پارٹی لے آؤں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، میری طرف سے بھی ہاں ہے تم ان لوگوں کو لے آنا شام میں۔“ میں نے حامی بھرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی چائے پی کر جا چکے تھے، ایان کو میں آرام کے لیے بیڈ روم میں چھوڑ آئی تھی اور خود لان میں نکل آئی تھی۔ کچھ ہلکی سی دھوپ نکل آنے سے دھوپ اور روشنی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ میری نگاہ لیموں کے پودے کے پاس موتیے کے پھولوں کی جھاڑ پر گئی تھی۔ لاسٹ ائیر یہ بالکل سوکھ گئی تھی اس پر اب نئے پتے آ گئے تھے اور ایک شاخ پر بند کلی بھی نکل آئی تھی۔

”ارے، یہ تو پودا بالکل ختم ہو گیا تھا۔“ میں نے مالی سے کہا۔

”جی بی بی جی! میں سمجھا تھا کہ پودا مر گیا ہے لیکن اس اللہ سوہنے کی شان ہے ناں جی، بنجر کو ہریالی دے دے، سوکھے کو تر کر دے اور بے برکتے پودے کو برکت دے دے۔“ مالی کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا اور میں وہیں لان چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

”واقعی اللہ بہت رحیم ہے جس نے میری زندگی کے بے برکتے پودے میں خیر ڈال دی تھی۔ وہ خیر جس کے لیے میں کتنا تڑپی تھی۔ سوچتی ہوں کہ مجھے اگر موقع نہ ملتا تو......؟ اگر اپنی غلطی سدھارنے کی مہلت نہ ملتی تو؟“ میرے سارے بدن میں

جھرجھری آ گئی تھی۔

”واقعی اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ آج مس ارم پر کیے چھوٹے سے احسان کے بدلے اللہ جی نے مجھے اس طوفان سے نکال دیا... جو میری زندگی کی نیا ڈبوئے جا رہا تھا۔“ مجھے بہت عرصے پہلے باؤ جی کی کہی بات یاد آ گئی تھی۔

”دوسروں کو ان کی تکالیف میں اکیلے مرنے کے لیے نہ چھوڑ دو۔ ان کی... مددگار بنو، یہ تم کو دلی، معاشی، سماجی اور معاشرتی طور پر پاورفل کر دے گا اور آج میں...... روشانے ایان خود کو بہت پاورفل محسوس کر رہی ہوں کیونکہ میری پاور کا نام اللہ کا ساتھ تھا۔ کیوں نہ کروں میں خود کو ایسا محسوس...... میں نے خود کو سب سے بڑی پاور اور اس کی پسند سے جوڑ لیا ہے... اور میں اپنے ساتھ جڑنے والوں کو اپنے اسٹاف کو صرف اپنے کام کے لیے نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگیوں سے بھی جڑی رہتی ہوں۔ میرا اسٹاف کہتا ہے۔ میڈم کی ٹیم میڈم سے جڑے وہ لوگ ہیں جن کے دکھ سکھ بھی سانجھے ہیں اور کام سے محبت بھی...... وہ لوگوں کو ان کے برے دنوں اور برے وقتوں میں نہ نوکری سے نکالتی ہیں نہ مصیبت میں اکیلا چھوڑتی ہیں۔ ایسے میں کوئی ان کو چھوڑ کر جائے کہاں؟“

ایان اب کافی وقت دیتے ہیں میرے ساتھ ہی ان کا آفس ہے۔ وہ سارا دن اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہروں میں میرے اسکول کی ”فرنچائز“ دیئے ان کی ضرورتیں پوری کرنے، رہنمائی دینے، نئے ٹیچرز کی تربیت کرنے، کورس کی کتابیں اور امدادی کتابیں تیار کروانے میں لگے رہتے ہیں۔

ایک اسکول...... ایک ادارہ...... اتنا بابرکت ہو سکتا ہے۔ اس میں اتنی بھی خیر پڑ سکتی ہے۔ جب لوگ پوچھتے ہیں یہ کیسے ہوا...... تو ایان مسکرا دیتے ہیں۔ میں ان کا جواب جانتی ہوں مگر وہ سب کے سامنے نہیں کہتے ہاں لیکن مجھ سے کہتے ہیں۔

”جب سے تم نے اللہ کے رشتے کے ساتھ ”فرنچائز“ کی ہے تب سے یہ برکت ہے۔ میری زندگی کی برکتے۔“ انہوں نے مائی برکتے تمہیں کہا تھا۔ وہ کبھی ہمارے پرانے اسکول میں آیا ہوا کرتی تھی اور اگر وہ مجھے مائی برکتے بھی کہہ دیتے تو میں نے کون سا برا ماننا تھا...... کہ اب میں سب کی عزت کرتی ہوں کہ لوگوں کی بے عزتی کر کے نہ کبھی فائدہ ہوتا ہے اور نہ سکون ملا کرتا ہے۔



دعا

دعا پر اعتماد ہی نیکی ہے۔ جب ہم تنہائی و خاموشی میں دعا مانگتے ہیں تو ہم اس یقین کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا اللہ تنہائی میں ہمارے پاس ہے۔ خاموشی کی زبان بھی سنتا ہے۔ دعا میں خلوص آنکھوں کو پُرنم کر دیتا ہے اور یہی آنسو دعا کی صورت منظوری کی دلیل ہیں۔ دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔ دعا گردشِ روزگار کو روک دیتی ہے۔ آنے والی بلاؤں کو ٹال دیتی ہے۔ دعا میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ جب تک سینے میں ایمان ہے دعا پر یقین رہتا ہے۔ جس کا دعا پر ایمان نہیں اس کے سینے میں ایمان نہیں۔

مرسلہ، سیدہ رفیعہ ابدالی، کراچی

ناولٹ

مُحبت کا پھیلاؤ

لُبنیٰ عروج

سانولا رنگ ہونے کے باوجود وہ بے انتہا خوب صورت تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی وحشت کا رنگ، دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے آپ میں گم۔ دنیا جہاں سے بے نیاز، بے خبر، پتا نہیں کیوں میں اس کی طرف کھنچنے لگی۔ سب سے پہلے آپ کو بتادوں کہ مجھے وہ ملی کیسے؟ میری کزن کے ہسبینڈ کی اسلام آباد میں پوسٹنگ ہوگئی تھی انہیں کرائے پر گھر درکار تھا۔ میں نے اخبار میں ایڈ پڑھا اور دیے گئے ایڈریس پر پہنچ گئی۔ ایک سفید بالوں سفید ساڑھی والی گریس فل سی خاتون نے استقبال کیا۔

”جوانی میں بہت خوب صورت رہی ہوں گی۔“ میں نے دل ہی دل میں حسبِ عادت تبصرہ کیا۔

ان کا اوپر کا پورشن غالباً نیا بنا تھا اگر یہ مکان مل جاتا تو شاید میری کزن اس گھر کی پہلی کرائے دار ہوتی۔ مجھے گھر بے حد پسند آیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے موبائل پر اپنی کزن سے رابطہ کیا اور اسے بتادیا کہ گھر بے حد اچھی لوکیشن پر ہے۔ بس... تم جلدی سے آجاؤ تاکہ ایگریمنٹ طے ہوسکے۔ میری کزن کے تین بچے ہیں تینوں ہی کالج گوئنگ ہیں۔ میاں کسی ٹیلی کام کمپنی کے انجینئر تھے۔ لینڈ لیڈی نے فیملی کے متعلق پوری معلومات حاصل کرلیں، اچھی طرح اطمینان کرلینے کے بعد وہ راضی ہوگئیں پھر مجھے نیچے اپنے گھر میں لے آئیں۔

”بیٹھو میں چائے بناتی ہوں۔“ وہ مجھے لاؤنج میں بٹھا کر خود کچن میں چلی گئیں۔ بہت کشادہ صاف ستھرا بھرا ہوا گھر تھا مگر خاموشی بہت تھی۔ وہیں وہ دیوار پر گاؤ تکیے کا سہارا لیے کسی انجانی دنیا میں گم تھی۔

”ہیلو......!“ میں نے اسے مخاطب کیا اس نے جواب نہیں دیا۔ کسی ایک سمت میں مسلسل دیکھتے ہوئے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اس کی اس بے نیازی پر میں کچھ خفیف سی ہوگئی۔ تبھی وہ خاتون جنہیں میں مسز انصاری کہہ کر ہی مخاطب کروں گی وہ چائے لے آئیں، ٹرالی میں چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی تھے۔

”آپ نے اتنا تکلف کیوں کرلیا؟“ میں سچ مچ شرمندہ ہوگئی۔

”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں، چائے لیجیے ٹھنڈی ہوجائے گی۔“

”یہ آپ کی بیٹی ہیں یا بہو؟“ وہ خاتون چپ رہیں۔

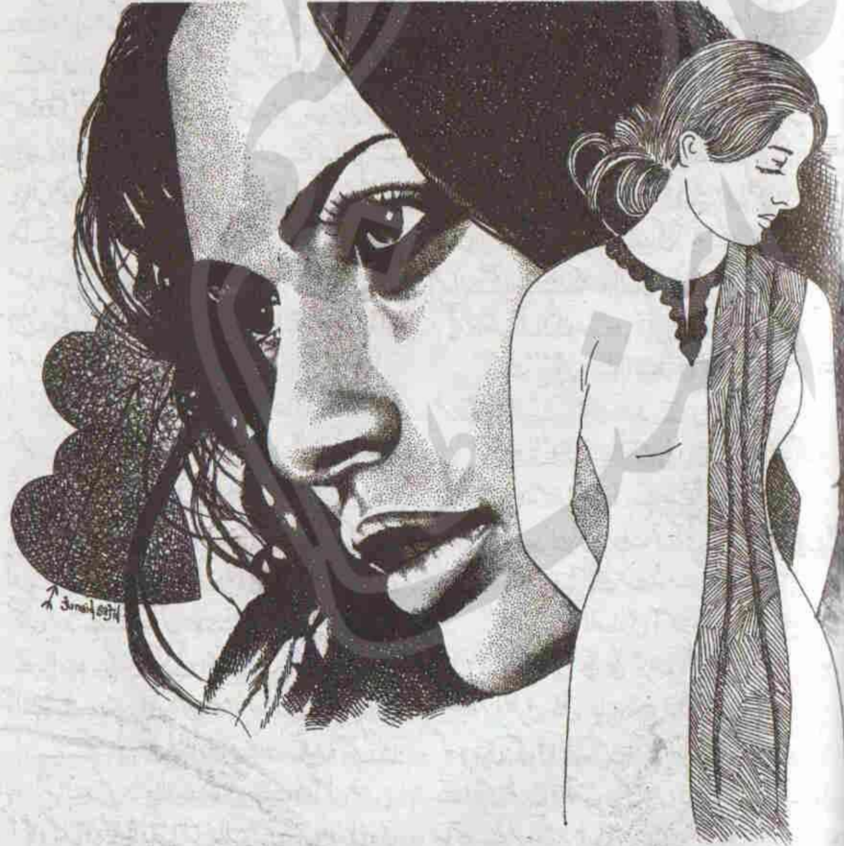
”آؤ عفی چائے پی لو۔“ انہوں نے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔ لڑکی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جانے وہ کن گہری سوچوں میں گم تھی۔ مسز انصاری نے اسے دوبارہ مخاطب نہیں کیا، اپنی اور میری چائے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

”ٹھیک ہے مسز انصاری کل تک میری کزن اس کے میاں اور بچے آجائیں گے، سامان کا ٹرک دو دن میں پہنچ جائے گا۔“

”دیکھیے دیر مت کیجیے گا کیونکہ بہت سے فون آرہے ہیں، لوگ آرہے ہیں مکان دیکھنے لیکن مجھے اچھے لوگوں کی ضرورت ہے۔“

”جی آپ بالکل فکر نہ کریں ہم بہت اچھے اور شریف لوگ ثابت ہوں گے۔“ میں ہنس پڑی وہ بھی ہنس دیں۔ ہنستے ہوئے وہ اور بھی خوب صورت لگنے لگیں۔ میں گھر واپس آگئی مگر مسز انصاری کے لاؤنج میں بیٹھی وہ لڑکی مجھے کئی بار یاد آئی۔ وہ مسز انصاری کی کون تھی؟ میں الجھنے لگتی۔

اگلے کچھ دن بہت مصروفیت رہی۔ ثمن اپنے بچوں سمیت میرے گھر آگئی، ان لوگوں نے مکان دیکھا انہیں بے حد پسند آیا۔ سارے قانونی تقاضے پورے کیے گئے اس اثنا میں سامان کا ٹرک بھی پہنچ گیا، میں ثمن کے ساتھ بہت مصروف ہوگئی تھی، گھر صاف ستھرا تھا مگر ایک بار میرے ملازمین نے جا کر اسے خوب دھویا چمکایا۔ پورا گھر جب سیٹ ہوگیا تو ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ اب میرا ثمن کی طرف اتنا زیادہ آنا جانا نہیں رہا وہ بھی مصروف ہوگئی تھی اور میں



بھی گھر کے بکھیڑوں میں الجھ گئی تھی۔ ایک دن اچانک مسز انصاری کی کال میرے موبائل پر آگئی۔ میں نیا نمبر دیکھ کر حیران تھی مگر مسز انصاری کا لب و لہجہ میں فوراً پہچان گئی۔

''کل رات ڈنر آپ لوگ ہمارے ساتھ کریں، سمن فیملی بھی انوائیٹڈ ہے میں نے آپ کا نمبر انہی سے لیا ہے۔'' میں نے بہت سے ایسے جملے بولے جو ایسے موقعوں پر کہے جاتے ہیں لیکن ساری باتوں کا ایک ہی جواب تھا کہ آپ مجھے اچھی لگی ہیں آپ ضرور آئیے گا مجھے خوشی ہوگی۔'' تب میں نے وعدہ کرلیا۔ اگلے دن میں اپنے تینوں بچوں اور میاں کے ساتھ ان کے یہاں پہنچ گئی۔ سمن وہاں پہلے سے موجود تھی' خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ میرے میاں اور جنید بھائی جانے میں سخت گریزاں تھے کہ ان کے یہاں مرد کوئی نہیں ہے ہمارا جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اب دونوں نے اپنی الگ محفل جمالی تھی۔ سمن مسز انصاری کے ساتھ کچن میں مصروف تھی میں بھی وہیں چلی گئی۔ مسز انصاری نے کافی اہتمام کر رکھا تھا ہم سب نے مل جل کر کھانا لگایا۔

''تم بھی آجاؤ عفی۔'' مسز انصاری نے ایک کمرے کا دروازہ بجایا۔ نہ جواب آیا نہ عفی آئی۔ کھانا شروع ہوگیا کھانا بلاشبہ بہت مزے کا تھا۔ حضرات نے کھانا کھاتے ہی مسز انصاری کا شکریہ ادا کیا اور اوپر تشریف لے گئے کیونکہ دونوں ہی کچھ اچھا فیل نہیں کررہے تھے۔ بس ہمارے اصرار پر آ ضرور گئے تھے۔ اب بچے بیٹھ کر ٹی وی پر فٹ بال کا میچ دیکھ رہے تھے۔ میں اور سمن مسز انصاری سے باتیں کرنے لگے۔ وہ ملکی حالات پر سخت رنجیدہ تھیں' کئی بار اشکبار ہوئیں۔ حالاتِ حاضرہ سے وہ مکمل طور پر آگاہ تھیں وہ یقیناً روزانہ اخبار پڑھتی تھیں اور ٹی وی کے پولیٹیکل ٹاک شوز بھی پابندی سے واچ کرتی تھیں۔ ان کی گفتگو بتا رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی جمشید اور جنید بھائی اگر مسز انصاری سے بات چیت کرتے تو یقیناً بور نہ ہوتے۔ بہرحال ہم گھر لوٹ آئے بہت سی اچھی یادوں کے ساتھ مگر عفی مسز انصاری کی کون تھی یہ راز ابھی بھی سربستہ تھا۔

☆☆☆

ایک دن سمن کا فون آگیا اس نے ہمیں اور مسز انصاری کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ مسز انصاری سے ملاقات کا ایک اور بہانہ ملنے پر میں جانے کیوں خوش تھی۔ عفی بھی آئے گی شاید۔ میں خوامخواہ اس بچی کے بارے میں متجسس تھی۔ سمن سے بھی کئی بار پوچھا مگر اس کا یہی جواب تھا کہ اس نے ایک دو بار مسز انصاری سے عفی کا حدود اربعہ جاننے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہیں یا ٹال گئیں۔ اسی لیے میرا بھی حوصلہ نہیں پڑتا تھا مگر میرے اندر کی جستجو مجھے ہمیشہ بے قرار رکھتی۔ سمن کے یہاں ڈنر پر خلاف توقع عفی کو دیکھ کر میں کھل اٹھی۔

''ہیلو!'' میں نے اسے کسی چھوٹے بچے کی طرح چپکارا۔

''ہیلو۔'' وہی بے تاثر چہرہ وہی وحشت کا رنگ لیے آنکھیں۔ مسز انصاری بے حد خوش ہوکر ملیں۔

''آپ سمن کی طرف تو آتی جاتی رہتی ہیں نیچے بھی آیا کریں۔'' مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔

''سوری مسز انصاری آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔'' میں سچ مچ شرمندہ تھی' سمن کی طرف اکثر افراتفری میں جانا ہوتا تھا' کبھی شاپنگ کبھی گروسری کبھی ڈاکٹر۔ سمن ابھی شہر کے مختلف علاقوں سے اچھی طرح واقف نہ تھی اس لیے اکثر مجھے اسے ساتھ لے کر جانا پڑتا۔

آج میں نے جمشید اور جنید بھائی کو بھاگنے نہیں دیا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے مسز انصاری کے ساتھ ملکی سیاست کا ذکر چھیڑ دیا۔ کچھ دیر تک تو دونوں حضرات چپ ہوکے سنتے رہے پھر رہ نہیں سکے آہستہ آہستہ شروع ہوگئے خوب محفل جمی۔ اب ذرا سی بوریت کا شائبہ تک نہ تھا اجنبیت بھی ختم ہوگئی تھی۔ مسز انصاری کسی کالج سے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرڈ تھیں۔ ان کا اندازِ گفتگو بہت دھیما بہت دلنشین تھا' وہ بہت پڑھی لکھی بہت باشعور خاتون تھیں۔ ڈنر سے واپسی پر جمشید' انصاری آنٹی کے فین ہوچکے تھے۔

''مگر میں تو انہیں مسز انصاری ہی کہتی ہوں۔'' میں نے انصاری آنٹی سن کر جمشید سے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''مسز انصاری کہنے میں بڑی اجنبیت ہے، وہ اتنی مشفق خاتون ہیں بالکل ماں جیسی۔'' جمشید کے خیالات ان کے بارے میں بے حد اچھے تھے۔ مجھے انجانی خوشی ملی حالانکہ اسلام آباد کے لوگ اتنے گھلنے ملنے والے اتنے ملنسار خوش اخلاق نہیں ہوتے عام طور پر مگر مسز انصاری کے پیار اور خلوص نے میرے اس خیال کی کسی حد تک نفی کردی تھی۔

اب اگلا ڈنر میرے گھر پر تھا اور میں نے انصاری آنٹی سے عفی کو ساتھ لانے کی بے حد تاکید کی۔ وہ آئیں تو عفی ساتھ تھی۔ میں نے بے اختیار عفی کو گلے لگالیا۔

''کیا حال ہے عفی؟''

''ٹھیک ہوں۔'' آج عفی کی آنکھوں میں وہ اجنبیت کا رنگ کم تھا۔ سچ کہوں مجھے بے حد خوشی ہوئی، آج اس کے بال شیمپو کیے ہوئے تھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مسز انصاری مطالعے کی بے حد شوقین تھیں، بار بار وہ میرے دو تین بک شیلف کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ آخر اٹھ کر ادھر چلی ہی گئیں۔ میں کچن میں تھی مجھے سمن کی آواز آئی وہ کہہ رہی تھی۔

''حیرت ہے اتنی ملاقاتوں کے بعد بھی آپ کو پتا نہیں چلا کہ جویریہ ایک معروف رائٹر ہے۔'' جواب میں مسز انصاری کی آواز سنائی دی وہ خوشگوار حیرت سے کہہ رہی تھیں۔

''کمال ہے جویریہ کی اتنی بڑی خوبی سے میں اتنی دیر سے آگاہ ہورہی ہوں'' میرا قلمی نام جاننے کے بعد وہ کہہ رہی تھیں ''جویریہ کو میں نے اکثر پڑھا ہے بہت اچھا لکھتی ہے۔'' اسی طرح باتیں کرتی وہ دونوں کچن میں آگئیں۔

''تو گویا آج میں ایک رائٹر سے بالمشافہ مل رہی ہوں۔'' ان کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی اور آج تو وہ مسکرائے چلی جارہی تھیں۔ کھانا بہت پُر لطف رہا۔ وداع ہوتے وقت مسز انصاری نے بہت محبت سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''کسی دن فرصت سے چکر لگاؤ۔''

''جی ضرور......'' میں تو خود چاہتی تھی کہ فرصت ملے تو ان سے پوچھوں عفی سے آپ کا کیا رشتہ ہے، آپ اسے کانچ کے برتن کی طرح کیوں سنبھالے پھرتی ہیں۔ اسی اثنا میں وہ عفی کا ہاتھ پکڑے پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں میں پلٹ آئی۔

☆☆☆

اس دن موسم بہت سہانا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا، تیز ہوائیں شور مچا رہی تھیں، بادلوں کی زیادتی نے ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا دیا تھا یہاں تک کہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کرنی پڑ رہی تھیں۔ میرے بچوں نے شور مچا دیا۔

''سمن خالہ کی طرف چلیں نا۔'' اور میں ان کے اصرار پر نکل تو آئی لیکن راستے میں میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے موبائل پر سمن کو اطلاع کر دی کہ بچے اس کے پاس آ رہے ہیں، میں پیچھے مسز انصاری کے پاس بیٹھوں گی۔ سمن نے حسبِ توقع احتجاج کیا پھر مان گئی۔

مسز انصاری مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں لیکن مجھے وہ کچھ پریشان سی بھی لگ رہی تھیں۔

''عفی نظر نہیں آ رہی۔''

''وہ ایسے موسم میں بہت اپ سیٹ ہو جاتی ہے۔'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ میں نے مستفسرانہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی خوب صورت آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میں چپ رہی۔ بہت دیر تک وہ روتی رہیں میں ان کے لیے پانی لے آئی۔ پانی پی کر وہ کچھ سنبھلیں۔

''خیریت ہے آپ اس طرح کیوں روئیں؟'' میں خود دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ چپ رہیں پھر اپنے بیڈروم سے ایک فوٹو فریم اٹھا لائیں۔

''یہ میرا بیٹا ہے زعیم انصاری۔'' وہ کہتے کہتے پھر سسک سسک کر رو دیں۔ میں نے انہیں تھام لیا، میرے کندھے سے لگی وہ رو رو کر بے حال ہونے لگیں۔

''حوصلہ کریں پلیز! بتائیں تو سہی کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس خوش شکل، خوش لباس نوجوان کی تصویر ان کے ہاتھ سے لے کر بغور دیکھی۔

''کیا کرتا ہے آپ کا بیٹا، کہاں ہے، آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟''

''زعیم اب اس دنیا میں نہیں۔''

''اوہ......'' میں نے جو آنسو بہت دیر سے ضبط کر رکھے تھے بے اختیار بہنے لگے۔

''وہ بھی ایسا ہی موسم تھا۔ وہ ایسے موسموں کا دیوانہ تھا، تیز بارش دیکھ کر اس پر عجیب سی سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ گاڑی لے کر نکل گیا دو گھنٹے بعد اس کے دوست اس کا بے جان جسم ایمبولینس میں ڈال کر گھر لے آئے۔ میری عمر بھر کی کمائی لٹ گئی، میں تہی دست بیٹھی اس کا خوب صورت چہرہ دیکھ کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ گھر رشتے داروں اور احباب سے بھر گیا۔ وہ لوگ اسے لے گئے، میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی۔ پورا ایک سال میں کالج سے رخصت پر رہی۔ کبھی گھر کبھی اسپتال، بہت عرصے کے بعد نارمل زندگی کی طرف لوٹ سکی۔ کالج سے ریٹائرمنٹ لینا چاہی تو احباب نے مشورہ دیا کہ کالج دوبارہ جوائن کر لو مصروف رہو گی تو یہ غم بھول جاؤ گی۔ میں نے خیر خواہوں کا مشورہ مان لیا۔ میں دن بھر مصروف رہتی مگر شام ڈھلے زعیم کی یادوں کے حصار میں جکڑی جاتی۔ مجھے قدرت کی یہ مصلحت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ زعیم کے فادر کے گزر جانے کے بعد میں نے زعیم کے وجود میں پناہ ڈھونڈ لی، وہ بہت زندہ دل ہنس مکھ اور دوسروں کی مدد کے لیے ہر لمحہ تیار رہنے والا بیٹا تھا۔ یونیورسٹی میں آیا تو وہاں بھی وہ بے حد مقبول ہو گیا۔ مجھے دن بھر کی روئیداد ضرور سناتا تھا۔ وہ گھر آ جاتا تو جیسے یہ گھر زندہ ہو جاتا۔ اس کے بے شمار دوست تھے مگر ایک لڑکی کا ذکر وہ بطور خاص کرتا تھا۔

''زندگی میں اگر کبھی شادی کا ارادہ بنا مام تو شی وِل بی مائی فرسٹ چوائس۔ آپ اسے دیکھیں گی اسے ملیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ وہ بالکل آپ کی ٹائپ کی ہے وہ بھی آپ کی طرح ٹیک وارم ہے۔'' سارا دن وہ اس لڑکی کی باتیں کرتا۔ آخری سمسٹر کے دن وہ بہت خوش تھا۔

''وہ بڑی عجیب ہے مام، وہ ہمارے گھر نہیں آئے گی، آپ کو جانا پڑے گا اسے دیکھنے کے لیے۔''

''او کے مائی سن مگر کب؟''

''اس کی کچھ پرابلمز ہیں، وہ خود ہی بتائے گی ہم کب اس کی طرف جائیں گے، تب تک مجھے بھی جاب مل جائے گی پھر ہم اسے اپنے گھر لے آئیں گے، سب مل کر مزے سے رہیں گے......'' وہ پل بھر میں سارا پروگرام بنا ڈالتا۔

''انشاء اللہ۔'' میں کہتی۔

وقت، موت اور زندگی نے اسے مہلت نہیں دی کہ ہم اس لڑکی کے گھر جا سکتے۔ اس کی ناگہانی وفات پر جیسے پوری یونیورسٹی اسٹوڈنٹس، پروفیسرز سب ہی آئے۔ مجھے ہوش نہیں وہ آئی تھی یا نہیں۔ پورے ایک سال تک میں ہوش و خرد سے بے گانہ رہی۔ ہوش آیا تو کالج دوبارہ جوائن کر لیا۔ میری زندگی گھر سے کالج تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ زعیم کی پہلی برسی پر اس کے سارے دوست اور پروفیسرز، لڑکے لڑکیاں سب آئے۔ تب کچھ لڑکیوں کو دیکھ کر جیسے میرے کانوں میں زعیم کے الفاظ گونجنے لگے۔

آپ کو ایک لڑکی سے ملوانا ہے مام......!''

''کون تھی، کہاں گئی؟'' میں بری طرح چونکی۔ قرآن پاک ختم ہوا لیکن زعیم کے دوست کھانا کھائے بغیر چلے گئے۔ مجھے بہت قلق ہوا صرف زعیم کا قریب ترین دوست سعد مجید رہ گیا تھا اس نے سارے انتظامات سنبھالے ہوئے تھے لیکن کھانا کھانے سے انکاری تھا۔

''کیوں بیٹا؟'' میں پریشان ہو گئی۔

''حوصلہ ہی نہیں پڑتا آنٹی جی، کھانا تو ہم روز کھا رہے ہیں، جی رہے ہیں لیکن زعیم کی برسی کا کھانا......نہیں آنٹی حلق سے نیچے نہیں اترتا۔'' وہ زار و قطار رونے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد سعد مجید پھر آ گیا۔ میرے ہاتھ تھام کر پھر رو دیا۔

''وہ اسے دماغی امراض کے اسپتال چھوڑ آئے ہیں۔''

''کسے سعد، کسے؟'' میں پریشان ہو گئی۔

''عفیفہ کو۔''

''کون عفیفہ؟''

''زعیم کی بیسٹ فرینڈ، زعیم اس سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔ آنٹی شاید اس نے آپ سے ذکر کیا ہو؟''

''ہاں ہاں وہ کہتا تو تھا کہ اگر کبھی شادی کی تو اسی سے کرے گا۔'' میں بری طرح چونکی۔

''جس دن زعیم دنیا سے گیا عفیفہ اس خبر کو برداشت نہیں کر سکی بے ہوش ہو گئی۔ اس کے گھر والے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے کسی گہرے صدمے کا اثر بتایا۔ وہ ہوش میں تو آ گئی مگر زعیم کو پکارنے لگتی تھی، بیٹھے بیٹھے چیخنے لگتی تھی۔ اس کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے، وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گھر میں تین بھابیاں تھیں، اس کے منہ سے زعیم کا نام سن کر بھابیاں چونکیں اور بھائیوں سے شکایت کر دی۔ اس کا ایک بھائی بہت غصیلا اور جوشیلا ہے اس نے عفیفہ کو روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ وہ اس کی ذہنی حالت سے بے خبر تھے اس کو اتنا زیادہ پیٹا گیا کہ وہ پھر سے بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو اسے گہری چپ لگ گئی، وہ چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی۔ بھابیاں اس کی ذمے داری لینے سے گھبراتی تھیں الٹا شکایتیں کر کر کے اس کو

پٹواتی تھیں۔ عفیفہ ہوش وخرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ ہمارا سارا گروپ بے حد پریشان تھا صرف ثمینہ واجد جو اس کی گہری سہیلی تھی وہی اس کے گھر جاتی تھی اور اس کی بھابیاں عفیفہ کا سارا حال شکایتی انداز میں اس سے بیان کر دیتی تھیں۔

ہم سب جب بھی اکٹھے ہوتے عفیفہ کے دکھ سن کر دکھی ہو جاتے مگر ہم کچھ کرنے پر قادر نہیں تھے۔ ہم تو جان ہی نہ سکے کہ وہ زعیم سے اتنی شدید اتنی گہری محبت کرتی ہے، ہم بس ثمینہ سے اس کی خیر خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ اب کل پتا چلا ہے وہ لوگ اسے کسی ایسے سینٹر میں چھوڑ آئے ہیں جہاں دماغی امراض میں مبتلا لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا آنٹی جی، پلیز اس سے ملنے چلیں، اسے یہاں لے آئیں۔ وہ بہت ذہین ہے لائق ہے ان لوگوں نے اسے ذہنی مریض بنا ڈالا ہے۔'' سعد مجید چپ ہوا تو میرے دل میں عفیفہ کے لیے مامتا کی تڑپ جاگ اٹھی۔

''مجھے اس کے پاس لے چلو سعد۔'' میں فوراً کھڑی ہو گئی۔ ہم دونوں کا دکھ مشترک تھا ہم دونوں زعیم کی محبت میں مبتلا تھے۔ میں ماں ہو کر سنبھل گئی تھی مگر وہ سنبھل نہیں سکی سہہ نہیں سکی۔ کیسی دیوانگی تھی یہ، یہ کیسا جنون تھا میں ششدر تھی حیران تھی۔ وہ زعیم کی محبت میں سرتاپا غرق تھی۔ میں جان ہی نہ سکی سمجھ ہی نہ سکی، نہ کبھی زعیم نے اس کا ذکر کرتے وقت ایسے والہانہ پن کا اظہار کیا تھا۔ ایسی وارفتگی میں نے کبھی اس کے انداز میں نہیں دیکھی یا پھر میں وہ چشم بینا ہی نہ رکھتی تھی۔ ہم ماں باپ اکثر اپنی اولاد کی کسی کے لیے پسندیدگی یا پھر محبت کو بے وقوفی گردانتے ہیں، وقتی ابال کا نام دیتے ہیں۔ کبھی گہرائی میں جا کے سوچتے ہی نہیں، سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، میں کبھی زعیم کی باتوں کو سیریس نہیں لیتی تھی۔ اسے ایک بچہ سمجھتی تھی لیکن وہ بہت گہرا تھا اسے عفیفہ سے سچی محبت تھی۔

عفیفہ زندہ تھی مگر مردوں سے بھی بدتر تھی۔ میں سعد کے ساتھ اس سے ملنے گئی وہ چپ چاپ خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ سعد کو دیکھ کر بھی اسے کچھ یاد نہیں آیا وہ ایک سمت میں دیکھتی رہی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا مجھے لگا جیسے وہ زعیم کی واحد نشانی ہو۔ میں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ پاس کھڑی ایک اٹینڈنٹ نے اسے مجھ سے جدا کر دیا۔

''مریضوں کو چھونے کی اجازت نہیں ہے، یہ کبھی کبھار بڑے خطرناک ہو جاتے ہیں۔''

''یہ محبت کی ماری گلاب کے پھول جیسی نازک سی لڑکی خطرناک کہاں ہو سکتی ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ میں گھر واپس آ گئی مگر اکثر وہاں جانے لگی عفیفہ کی آنکھوں کی وحشت مجھے بار بار بلاتی تھی۔ میں بہت بے چین ہو جاتی تو اسی سینٹر میں جا پہنچتی جہاں وہ داخل تھی۔ اس کے خوب صورت بال الجھے ہوئے، کپڑے ملگجے، ناخن بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے، ملیح چہرہ کبھی اتنا گہرا سانولا نہیں رہا ہو گا مگر اب بہت زیادہ سنولا گیا تھا۔

اکثر میرا دل چاہتا میں عفیفہ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں لیکن کس ناتے سے کس رشتے سے وہ میری کیا لگتی تھی۔ ایسے جذباتی تعلق کو بھلا کون مانتا کون جانتا؟ پھر اس کے ایک نہیں تین تین بھائی بھابیاں تھے، وہ بھلا مجھے کیسے دے دیتے یہ لڑکی جو میرے زعیم کے غم میں دیوانی ہو گئی تھی۔

ایک دن میں سعد مجید کے سامنے اپنے دل کی تمنا بیان کر بیٹھی۔ وہ بے حد چونکا پھر جیسے خوش ہو

اٹھا۔

''اگر وہ وہاں سے ذہنی امراض کے سینٹر سے نکل آئے تو اس سے بڑی بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ آپ کسی وکیل سے بات کریں کوئی صورت نکل آئے گی۔'' بات بڑی عجیب سی تھی، میرا عفیفہ سے کوئی رشتہ نہیں تھا میں فقط زعیم کی ماں تھی اس زعیم کی ماں جس کا نام پکارنے کے جرم کے پاداش میں اس کے گھر والوں نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ میں کس حیثیت میں کس رشتے سے اسے مانگتی۔ میرا ایک پرانا اسٹوڈنٹ اس وقت کافی جانا مانا ایڈووکیٹ تھا۔ میں نے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ کافی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''قانون میں ایسی کوئی شق موجود نہیں کہ آپ محض اس دلیل کی بنا پر بچی کی کسٹڈی لے سکیں کہ وہ بھی آپ کے بیٹے سے محبت کرتی تھی۔''

''پھر......؟'' میری مایوسی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

''ایک ہی صورت ہے کہ عفیفہ کے بھائیوں سے مل کر ساری صورتِ حال ڈسکس کر لی جائے اگر وہ لوگ راضی ہو جائیں تو شاید کوئی صورت نکل آئے۔''

تب ایک شام میں عفیفہ کے بھائیوں کے گھر جا پہنچی۔ میرا اسٹوڈنٹ بلال ایڈووکیٹ میرے ساتھ تھا۔ میں نے عفیفہ کی بھابیوں کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ میرا مطالبہ میرا موقف سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ ان کے چہرے کے زاویے تبدیل ہو گئے، آنکھوں سے شک کی شبہے کی چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔

''آپ کو پتا ہے زعیم کا نام اس کی زبان سے نکلنے کا اس کے بھائیوں کو پتا چلا تھا تو طوفان آ گیا تھا، آج پورے دو سال بعد آپ آ کر پھر وہی نام لے رہی ہیں، کیا آپ چاہتی ہیں ہمارے گھر میں بھونچال آ جائے پھر سے۔'' ان کی بڑی بھابی کچھ سمجھدار دکھتی تھیں لیکن وہ سخت حواس باختہ لگ رہی تھیں۔

''آپ نے بہت عجیب بات کی ہے مسز انصاری، عفیفہ ہم پر بوجھ نہیں تھی ہم تو اس کی شادی کے پلان بنا رہے تھے کہ اس حادثے نے اسے ہوش و خرد سے بے گانہ کر دیا۔''

''وہ جیسی بھی ہے میں چاہتی ہوں اسے اپنے گھر لے جاؤں، کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے اس کا علاج کراؤں، اسے زندگی کی طرف واپس لاؤں......'' میں نے پھر التجا کی۔

''علاج وہاں بھی ہو رہا ہے۔ عفیفہ کوئی لاوارث لڑکی نہیں ہے، خیر سے تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔''

''پلیز آپ غلط مت سمجھیں، میں عفیفہ کی ذمے داری قبول کرنا چاہتی ہوں اسے نارمل زندگی کی طرف لانا چاہتی ہوں، ایسا اسی وقت ہی ممکن ہے جب وہ دن رات میرے پاس رہے۔ آپ مجھ سے جیسی چاہیں گارنٹی لے لیں، میں اپنی جان سے زیادہ اپنی بساط سے بڑھ کر اس کا خیال رکھوں گی۔'' میں نے پھر التجا کی۔

مجھے وقتاً فوقتاً جا کر عفیفہ کی بھابیوں سے مذاکرات کرنے پڑے۔ رفتہ رفتہ وہ میرے ساتھ مانوس ہونے لگیں اب میرے جانے پر اجنبیت کا اظہار نہیں کرتی تھیں، کبھی کبھار چائے بنا کر لے آتی تھیں۔ دو بھائیوں کی بیویاں قدرے راضی نظر آتی تھیں۔ تیسری کا موقف تھا کہ عفی کے بھائی فیصلے کے مجاز ہیں جو وہ کہیں گے وہی ہوگا۔ آہستہ آہستہ بات گھر کے مردوں تک پہنچی، ان کی بیویوں کے

ذریعے پھر میری ملاقات کا اہتمام کروایا گیا۔ مجھے عفیفہ کے بھائیوں کے بہت سے چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا تھا۔ کئی بار انہوں نے زعیم کا نام لے کر کچھ بہت سخت باتیں کہیں، میرا صبر وضبط جواب دے گیا' میرے پاس سوائے آنسوؤں کے کچھ باقی نہیں بچا۔

''ہمارے پاس کیا گارنٹی ہوگی کہ ہماری بہن آپ کے پاس محفوظ ہوگی۔''

''آپ وقتاً فوقتاً آکر چیک کرسکتے ہیں۔'' رفتہ رفتہ بڑے دونوں بھائی آمادہ نظر آنے لگے تھے مگر تیسرا اور چھوٹا بھائی قانونی تقاضے پورے کروانا چاہتا تھا۔

''ہمیں آپ سے گارنٹی کے طور پر کچھ رقم بھی درکار ہوگی۔'' چھوٹے بھائی کی اس بات پر دونوں بڑے بھائیوں نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں نے چیک بک نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ مجھے بلال ان کے ایسے کسی مطالبے کے بارے میں پہلے ہی ہوشیار کرچکا تھا۔

''رہنے دیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' بڑے بھائی نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔ لیکن چھوٹے نے پانچ لاکھ کی رقم کا چیک لکھ کر سائن کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ عفیفہ کے بڑے بھائی نے درمیان سے ہی وہ چیک پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

''ہم عفیفہ کو بیچ نہیں رہے آپ کے حوالے کررہے ہیں اس کی بہتری کے لیے، وہ ہمیں بہت عزیز ہے لیکن ہمارے گھر میں ہمارے دلوں میں اتنی گنجائش نہیں کہ اسے برداشت کرسکیں تبھی تو ہم گھبرا کے اسے ذہنی امراض کے سینٹر میں چھوڑ آئے۔'' عفیفہ کے بڑے بھائی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ ''آپ اسے لے جائیں شاید وہ نارمل ہوجائے شاید وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔''

وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگا پھر بہت سے مرحلوں سے گزر کر بلال کے قانونی مشوروں کی روشنی میں ہم اسے گھر لے آئے۔ وہ نئی جگہ پر نئے چہرے کو دیکھ کر کچھ اپ سیٹ سی ہوگئی تھی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں نے اس کے بڑھے ہوئے ناخن تراشے، اس کے بالوں کی کٹنگ کروائی، اسے نہانے پر مجبور کیا۔ اس کے نئے ریڈی میڈ کپڑے اور جوتے خریدے۔ زعیم کی ڈریسنگ ٹیبل پر اس کا پسندیدہ پرفیوم آج بھی ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ ایک دن مجھے جانے کیا سوجھی میں نے وہ پرفیوم اٹھا کر عفیفہ پر ہلکا سا اسپرے کردیا۔ کچھ دیر وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی پھر اچانک شاید صدیوں بعد اس کے منہ سے نکلا۔

''زعیم۔'' میں خوشی سے پاگل ہوگئی' میری محنت رنگ لانے لگی تھی لیکن میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ زعیم کہنے کے بعد وہ پھر سے کھوگئی تھی۔ ایسے جیسے کبھی بولی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے گلے سے لگالیا۔

زعیم میرے دل میں بستا تھا پر عفیفہ کے دل میں یہی تو قدر مشترک تھی جو مجھے عفیفہ کے قریب تر کردیتی تھی۔ میں نے ایک اعلیٰ درجے کے سائیکاٹرسٹ سے عفیفہ کا علاج شروع کروایا۔ وہ بہت حد تک ٹھیک ہوگئی مگر کم سے کم بولنا، خلاؤں میں گھورنا نہ گیا۔ میں اس کی اس حالت پر بھی خوش ہوں مطمئن ہوں، وہ خود سے کچھ نہیں کرتی اسے بتانا پڑتا ہے کہ اب منہ ہاتھ دھولو، نہالو، بالوں میں برش کرلو۔ دانتوں میں برش کرلو۔ سارا دن ایک چھوٹے بچے کی طرح اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اس کا علاج فقط محبت اور توجہ سے ممکن ہو پایا ہے۔ اس کے بھائی بھابیاں شروع میں تو کچھ عرصہ باقاعدگی سے آئے پھر آہستہ آہستہ آنا بند ہوگیا۔ اس کا بڑا بھائی کبھی کبھار فون پر عفیفہ کی خیریت معلوم کرلیتا ہے اور بس...... ''مسز انصاری چپ ہوئیں تو میرے برستے آنسو دیکھ کر جیسے چونک گئیں۔

''عفیفہ کی کہانی نے تمہیں بھی رُلا دیا نا جویریہ۔''

''یہ کہانی شاید آنسوؤں سے لکھی گئی ہے۔ مسز انصاری جو بھی سنے گا بے اختیار رو دے گا۔'' میں خود پر بہ مشکل قابو پارہی تھی۔

واپسی پر بظاہر میں گاڑی ڈرائیو کررہی تھی لیکن میرا ذہن ادھوری محبت کی اس کہانی میں الجھا ہوا تھا۔ اللہ پاک نے یہ دنیا محبت کے نام پر بسائی تھی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اور دنیا کے شاید ہر انسان کو محبت کی دولت سے نواز دیا۔ محبت کیا ہے، درد ہے، جدائی ہے، نارسائی ہے۔ محبت کیا ہے، آنکھ سے ٹپکا آنسو ہے، محبت سوز ہے گداز ہے، ساری کائنات شاید اسی ایک لفظ محبت کے گرد گھوم رہی ہے۔ میرا دل تو ویسے ہی محبت کرنے والوں کی دکھ بھری بات سن کر بھی بھر آتا ہے اور عفیفہ کی کہانی تو ہے ہی آنسوؤں سے گندھی۔ میرا دل بہت دکھی تھا میں گھر آ کے روزمرہ کے کاموں میں الجھ کر بھی مسز انصاری کی بیان کردہ کہانی کے پیچ وخم میں الجھی ہوئی تھی۔ بار بار ایک ٹھنڈی آہ میرے اندر سے میرے دل کو چھو کر نکل جاتی تھی۔ چند دن بعد میں پھر وہیں تھی' میں نے جاتے ہی عفیفہ کو گلے سے لگالیا وہ اسی طرح بے حس و انجان تھی۔ نہ شناسائی نہ گرم جوشی۔

''آؤ جویریہ آؤ کب آئیں؟'' مسز انصاری کچن سے نکل کر لاؤنج میں چلی آئیں۔

''کسی پل چین نہیں ہے مسز انصاری' میں ایک منٹ کے لیے بھی عفیفہ کی کہانی کے سحر سے باہر نہیں آسکی۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر میرے پاس ہی بیٹھ گئیں پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔

☆☆☆

اب میں اکثر ہی مسز انصاری کی طرف جانے لگی تھی۔ عفیفہ سے باتیں کرنے لگی تھی۔ ایسی باتیں جس کا کوئی رسپانس نہیں ملتا تھا کوئی ردِعمل نہیں ہوتا تھا۔ میرے بار بار جانے سے اتنا ہوا تھا کہ عفیفہ کی نظروں کی اجنبیت تھوڑی ختم ہوگئی تھی اب وہ کچھ مانوس ہوگئی تھی۔ میں مسز انصاری کی اجازت سے اسے اپنے ساتھ بازار لے جاتی تھی۔ وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھی رہتی۔ نہ کوئی سوال نہ جواب نہ کوئی فرمائش۔

''آئسکریم کھاؤ گی؟'' کبھی وہ اثبات میں جواب دے دیتی کبھی صاف انکار کردیتی۔ ایک دن مجھے چھوٹے بیٹے کے کسی کام کے سلسلے میں اس کی یونیورسٹی جانا تھا۔ عفیفہ ساتھ تھی۔ یونیورسٹی میں داخل ہوتے وقت وہ ویسی ہی تھی خاموش بے نیاز لیکن اندر پہنچ کر لمبی سی کوریڈور میں وہ بے حد چونک گئی پھر اس نے ہوا میں یوں ہاتھ لہرائے جیسے کہہ رہی ہو۔

''نہیں وہ یہاں کہاں؟'' میں اس کی ساری حرکات وسکنات کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے کچھ یاد آتا ہے پھر ذہن کے دریچوں سے ہوا کے مانند نکل جاتا ہے جیسے وہ یادوں کو باتوں کو مجتمع نہیں کرپاتی۔ میں اکثر اسے یونیورسٹی لے جانے لگی۔ ایک دن ہم دونوں تھک کر لان میں پڑے بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ کچھ بے چین سی ہوگئی۔ چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی۔ پھر ایک دم بے چین ہو کر بولی۔

''زعیم کہاں ہے۔'' میرے لیے اس کا یہ سوال انتہائی غیر متوقع تھا، میں سخت گھبرا گئی۔ میں

نے اس سے کہا۔
''وہ کام سے گیا ہے ابھی آجائے گا۔'' وہ چپ چاپ خلاؤں میں گھورنے لگی تھی، میں اسے لے کر واپس بھاگی۔ آکر مسز انصاری کو بتایا، ان کے بے اختیار آنسو تھمتے نہیں تھے۔ میں ہونق بنی بیٹھی تھی۔ آج کل میرا ایک کزن امریکا سے آیا ہوا تھا۔ ہمارے ہی گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ کبھی وہ بہت شوخ بہت ہنسوڑ ہوتا تھا اب بہت سنجیدہ ہوگیا تھا۔ ایک دن مجھ پر کھل گیا، کہنے لگا۔

''میں بہت کچھ لٹا کر واپس آیا ہوں۔ امریکا کی ہواؤں میں فضاؤں میں بڑی بے یقینی بڑی بے وفائی ہے وہاں مطلب کے بغیر کوئی بات بھی نہیں کرتا حتیٰ کہ پاکستانی بھی امریکیوں کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔'' وہ بڑا دکھی تھا۔ ایک شادی ایک امریکن لڑکی سے کر کے بھگتا چکا تھا دوسری شادی ایک انڈین مسلمان سے کر کے طلاق کا زخم اٹھا چکا تھا۔ اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چلا آیا تھا اور اسلام آباد میں سیٹل ہونا چاہتا تھا۔ 35 سال کا وہ مرد اب خلوص اور محبت کی تلاش میں پاکستان چلا آیا تھا۔ ماں بہنوں نے بہت سی حسین کم عمر لڑکیاں اسے دکھائی تھیں مگر کوئی اس کے دل کو لگی نہیں۔ اب میں اور جمشید اس کے لیے گھر، کاروبار اور لڑکی سب کچھ تلاش کررہے تھے۔

اس دن بڑی سردی تھی اور مجھے گروسری کے لیے جانا تھا۔
''چلیے میں لے چلتا ہوں۔'' وہ گاڑی کی چابی لے کر کھڑا ہوگیا۔
''ہاں چلو ایسا کرتے ہیں سمن کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔'' میں جھٹ راضی ہوگئی۔ سمن کے گھر گئے تو وہ بزی تھی اس نے کہا آدھے گھنٹے تک نکلتے ہیں۔

میں احتشام کو ساتھ لے کر مسز انصاری کے یہاں چلی آئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت خوش ہوئیں، احتشام سے بھی بہت اچھی طرح ملیں پھر باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا جو کہ یقیناً دراز ہوجاتا لیکن سمن آگئی تو ہمیں اٹھنا پڑا۔ اب اکثر ہی ایسا ہوتا ہم سمن کی طرف جاتے تو احتشام بھی ساتھ ہوتا اور میں مسز انصاری سے ملنے ضرور جاتی۔ میں نوٹ کررہی تھی کہ احتشام ہمیشہ دانستہ میرے ساتھ چل دیتا۔ وہ عفیفہ میں بے حد انٹرسٹڈ لگ رہا تھا۔ مسز انصاری احتشام میں انٹرسٹڈ لگ رہی تھیں، وہ خوب صورت تھا اسمارٹ تھا، ویل سیٹلڈ تھا۔ دو بیویوں کو بھگتانے کے باوجود وہ بہت کم عمر اور انوسینٹ لگتا تھا۔ اس کا بزنس شروع ہوگیا تھا۔ اس نے اپارٹمنٹ خرید لیا تھا، گاڑی لے لی تھی۔ وہ یہاں پاکستان میں امریکن اسٹائل میں کام کرنا چاہتا تھا لیکن اسے سخت مایوسی ہورہی تھی۔ اس کے آفس کے لوگ اس طرح سے کام نہیں کرپاتے تھے جس طرح وہ چاہ رہا تھا لہٰذا اکثر وہ غصے میں جھنجلا ہوا بہت ٹینس لگتا۔ کئی بار موبائل پر چیخ رہا ہوتا تھا میں رفتہ رفتہ نوٹ کررہی تھی وہ بہت غصیلا تھا۔ ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کرتا تھا اور معاف کرنا تو شاید جانتا ہی نہ تھا۔

''میں انہیں ایک ہینڈسم پے دیتا ہوں آپا، ان کا فرض ہے کہ وہ دل لگا کر کام کریں۔'' وہ میرے سمجھانے پر اکثر ہی وضاحتیں پیش کرتا۔ جمشید بھی اسے سمجھاتے۔
''یہ پاکستان ہے احتشام یہاں کا ورکنگ اسٹائل ایسا ہی ہے۔ ایک طرف ہم بے روزگاری کا رونا روتے ہیں دوسری طرف جاب لگ جائے تو انتہائی نااہلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کے ادارے تو سب سے سوا ہیں، پرائیوٹ سیکٹر میں تو ہم بھی لوگ خصوصاً نوجوان طبقہ محنت کرتا ہے۔'' احتشام کو ہم لوگ سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کردیتے۔

☆☆☆

وقت دھیمے سُروں میں بہہ رہا تھا۔ خالہ امی اکثر فون کرتیں۔ شام کے لیے لڑکی ڈھونڈو۔'' کئی بار ذہن میں عفیفہ کا نام آیا لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ ہاں مسز انصاری احتشام پر خاص طور پر مہربان ہورہی تھیں، وہ اسے خصوصی پروٹوکول دیتیں۔ احتشام کو میں نے عفیفہ کی کہانی سنادی تھی۔ وہ عفیفہ کو مسز انصاری کی ایک کم گو شرمیلی بیٹی سمجھ رہا تھا۔ ساری کہانی سن کر وہ بے حد متاثر ہوا۔

''عورت کو ایسی ہی وفادار ہونا چاہیے۔'' بہت دیر تک وہ سگریٹ پھونکتا رہا پھر میرے پیچھے کچن میں چلا آیا۔
''میں عفی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر میں بری طرح چونکی۔
''سوچ لو شام وہ ایک ذہنی مریضہ رہ چکی ہے، زعیم کی محبت جو اس کے رگ و پے میں سرائیت کرچکی ہے وہ اس سے شاید باہر نہ آسکے، بیوی کے فرائض شاید اچھی طرح سے پورے نہ کرسکے۔''
''کچھ بھی ہو میں اسے بہت پیار دوں گا وہ سب کچھ بھول جائے گی حتیٰ کہ زعیم کو بھی۔'' میں اس کے آخری جملے پر چونکی۔
''وہ زعیم کو نہیں بھول سکتی احتشام۔'' جس نے بھی اسے قبول کیا اسے اس کے ساتھ ہی قبول کرنا ہوگا۔''
''لیکن یہ تو چیٹنگ ہے نا آپا، رہے کسی اور کے ساتھ اور دل میں زعیم رہے۔'' میں سمجھ گئی تھی وہ ایک پوزیسو نیچر کا مرد تھا۔ وہ وقتی جذبوں کے سہارے عفی سے بیاہ تو کرلیتا مگر شاید بعد میں زعیم کے طعنے دے دے کر اس کا بچا کھچا جگر زخمی کردیتا۔ عفی اب ایسے مرحلے سے گزر رہی تھی کہ ذرا سی سختی اسے توڑ کے رکھ دیتی اور دوبارہ شاید وہ کبھی سنبھل نہ پاتی۔ ادھر پھر کبھی زندگی کی طرف لوٹ کے نہ آتی۔ عفی کے بھائیوں کی سختی اور مار پیٹ نے اسے اس حال کو پہنچا دیا تھا اب تو شاید وہ کسی کا اونچا بولنا بھی برداشت نہیں کرپائے گی۔ مسز انصاری کو شاید احتشام بے حد پسند آیا تھا ان کی باتوں سے اکثر اظہار ہوجاتا تھا لیکن میں اس رشتے کو مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ آخر ایک دن مسز انصاری نے مجھ سے دل کی بات کہہ ہی دی۔ میں سوچ میں پڑگئی۔ وہ احتشام کو ڈرائنگ روم کی حد تک جانتی تھیں جب سب اپنا بیسٹ پیش کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ میں شام کو قریب سے جانتی تھی وہ غصیلا اور بدمزاج تھا۔ خلاف مزاج کوئی بات برداشت نہ کرتا تھا۔ جھٹ بھڑک اٹھتا تھا، ساتھ ہی وہ ہر کام میں پرفیکشن چاہتا تھا۔ میرے خیال میں عفی اتنی پرفیکٹ اتنی ہوش و حواس والی نہیں تھی بہت جلدی ڈر جاتی تھی۔ کبھی کبھی بولتی تھی عام طور پر چپ رہتی تھی ورنہ وہی بے نیازی اس کا احاطہ کرلیتی تھی جسے دیکھ کر دوسرے خواہ مخواہ متوجہ ہوجاتے تھے۔

مسز انصاری نے میری رائے مانگی تھی وہ عفیفہ کو کسی اچھے خاندان میں بیاہنا چاہتی تھیں۔ انہیں احتشام اچھا لگا تھا یہ کوئی ناجائز نامناسب بات ہرگز نہیں تھی مگر میں کس منہ سے اپنے خالہ زاد کے سارے ویک پوائنٹس انہیں بتاتی۔ دو شادیاں وہ پہلے ہی کرچکا تھا اب تیسری بھی یقیناً ناکام ہی ہوتی کیونکہ عفیفہ اس کی ڈیمانڈز اس کے مزاج کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ تو نازک سا گلاب کا پھول تھی جسے گرم ہوا بھی چھو جاتی تو وہ مرجھا جاتا۔ میں دیکھ رہی تھی مسز انصاری اب اس فرض اس ذمے داری

سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ ان کے خیال میں عفیفہ اب اس حد تک سنبھل چکی تھی کہ ایک گھر کی ذمّے داری اور شوہر کی دلداری سنبھال سکتی تھی مگر میں احتشام کی طرف سے ہرگز مطمئن نہیں تھی۔ مسز انصاری میرے مشورے بلکہ میری رضامندی کی منتظر تھیں۔ میں سخت تذبذب میں تھی۔ میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں مسز انصاری کو احتشام کے بارے میں بتانا چاہا مگر وہ جیسے ذہنی طور پر احتشام کو اتنا پسند کر چکی تھیں کہ میں انہیں قائل ہی نہیں کر سکی۔

”اگر تم لوگ اس رشتے میں میرا ساتھ دو تو میں عفی کے بھائیوں سے بھی بات کروں، خدا کرے میری عفیفہ ایک اچھی اور خوب صورت زندگی گزارے۔ میں اب خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگی ہوں، اس ذمّے داری کا بوجھ خوش اسلوبی سے کندھوں سے اتر جائے تو اپنے رب کا شکر ادا کروں۔“ وہ ایک حقیقی ماں کی طرح عفی کے لیے پریشان تھیں۔ یہ سب بجا لیکن وہ بار بار یہ کیوں بھول جاتی تھیں کہ عفی کو اس فیز سے نکلے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔

وہ واقعی کانچ کا نازک سا برتن تھی جسے ایک ہلکی سی ٹھوکر بھی چکنا چور کر سکتی تھی۔ ایک شوہر ایک مکمل گھر سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، وہ اب اتنی تو ہوش مند ہو چکی تھی جان چکی تھی کہ وہ زعیم کی ماں کے پاس تھی جو اسے اس لیے بہت زیادہ چاہتی تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کی محبت تھی، اس کی چاہت تھی اس کی پسند تھی۔ وہ زعیم کی تصویر اپنے کمرے میں رکھتی تھی۔ مسز انصاری نے بتایا تھا راتوں کو اٹھ کر وہ زعیم کی تصویر سے چپکے چپکے باتیں کرتی تھی مگر آواز اتنی مدھم ہوتی تھی کہ وہ نہ سن پاتی تھیں نہ سمجھ پاتی تھیں، ایسے میں وہ کسی دوسرے مرد کا قرب کہاں برداشت کر سکتی تھی مگر مسز انصاری شاید یہ سب سمجھنے کو تیار نہیں تھیں۔

☆☆☆

اس شام جب احتشام آیا تو بڑا ایکسائٹڈ لگ رہا تھا۔ ”خیریت احتشام آج بڑے خوش لگ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ بلاوجہ ہنس دیا۔

”میں نے امی سے عفی کے سلسلے میں بات کر لی ہے۔“ اس نے بم پھوڑا۔

”ابھی امی کا فون میرے موبائل پر آئے گا آپ سے بات کریں گی۔“ میں اس کی اس جلد بازی پر ہونق بنی اس کا منہ دیکھتی رہی تھی تبھی اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔

”امی سے بات کریں۔“ اس نے جھٹ موبائل مجھے تھما دیا۔

”لڑکی کیسی ہے جویریہ؟“

”بہت خوب صورت......“

”اچھا میں نے کل کی فلائٹ سے سیٹ بک کروالی ہے، شام مجھے ائرپورٹ سے لے لے گا تم مسز انصاری سے بات کر لینا۔“ ایک دم فون بند ہو گیا۔ میں نے شام کی طرف دیکھا وہ اپنی کامیابی پر بیٹھا بڑی خوب صورتی سے مسکرا رہا تھا۔ میں جز بز ہو کر رہ گئی۔

وہ چلا گیا تو میں مسز انصاری کے پاس آئی۔ انہیں ساری بات بتائی تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں اور میرے ساتھ خالہ امی کے ڈنر کا مینو ڈسکس کرنے لگیں۔ احتشام راضی تھا مسز انصاری خوش تھیں، خالہ امی لاہور سے اٹھ کر لڑکی دیکھنے اسلام آباد آ رہی تھیں میں ایسے میں کس سے کیا کہتی سوائے خاموشی کے۔ میں نے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ مسز انصاری پورچ تک چھوڑنے ساتھ آئیں۔

”تم اپنی خالہ امی سے عفیفہ کی ساری حقیقت

کہہ دینا انہیں اندھیرے میں رکھنا ٹھیک نہیں پھر جو بھی ان کا فیصلہ ہو ویسے میرا خیال ہے شام نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“

”جی اچھا۔“ میں بہت الجھی ہوئی سی گھر چلی آئی۔

”اللہ کرے شام نے خالہ امی کو سب کچھ بتا دیا ہو۔“ میں نے پتا نہیں کیوں دعا مانگی۔ خالہ امی آ گئیں، مسز انصاری کے یہاں پُرتکلف ڈنر ہوا، خالہ امی کو لڑکی پسند آئی۔ بظاہر یوں لگا جیسے بہت سے مراحل طے ہو گئے ہوں۔ گھر آ کر خالہ امی سیدھی میری طرف آئیں۔ لاؤنج میں محفل جمی۔ احتشام ماں کے خیالات جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ کی رنگ تیزی سے انگلیوں میں گھما رہا تھا۔

”امی کچھ بتائیں نا؟“ آخر وہ بول ہی پڑا۔

”جویریہ تم مسز انصاری کو کب سے جانتی ہو؟“

”یہی کوئی پچھلے دو سال سے۔“

”مسز انصاری کی بس ایک ہی بیٹی ہے۔“ خالہ امی نے کریدا اب میری چونکنے کی باری تھی۔

”شام نے آپ کو سب کچھ بتایا تو ہوگا؟“ میں نے احتشام کی طرف بغور دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں بتایا آپ بتائیں۔“ وہ کسی کھلنڈرے ٹین ایجر کی طرح بی ہیو کر رہا تھا۔ میں سخت سٹپٹائی۔ جب میں نے ساری کہانی خالہ امی کے گوش گزار کی تو وہ سخت پریشان ہوئیں۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔

”کیا مطلب؟“ احتشام کے ماتھے پر سلوٹیں نمایاں ہوئیں۔

”مجھے اس عجیب و غریب کہانی کی سمجھ نہیں آئی۔“ خالہ امی کے تیور بگڑنے لگے۔

”اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات

پردہ

اپنی غرض سے اُس نے اپنا بنا لیا
مطلب نکل گیا تو مجھ کو بھلا دیا
چہرے پہ اس نے رکھی کیسی حسیں نقاب
ہوا نے اس کے چہرے سے پردہ اٹھا دیا

از......تانی چوہدری، آکسفورڈ یوکے

ہے؟“ احتشام کا رنگ بھی سرخ ہوا۔

”وہ ایک ذہنی مریض دوسرے لفظوں میں پاگل لڑکی ہے، کوئی بے وقوف ہی اس سے شادی کرے گا۔“ ”پاگل“ کا لفظ عفیفہ کے لیے مجھے بھی دکھی کر گیا لیکن خالہ امی نہ تو اس سے مانوس تھیں نہ اس کی درد آشنا۔ وہ اتنی بے رحمی سے یہ لفظ بول سکتی تھیں لیکن مجھے انتہائی تکلیف پہنچی۔ احتشام کو بھی ماں کی بات ناگوار گزری تھی۔ وہ اپ سیٹ نظر آ رہا تھا۔

”ایک لڑکی جو مسز انصاری کے بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی، مسز انصاری تو اس سے محبت کریں سو بار کریں لیکن تم کس حساب میں پاگل ہو رہے ہو۔“ انہوں نے شام کو سرزنش کی۔

”خالہ امی پلیز، عفیفہ کے لیے بار بار پاگل کا لفظ استعمال مت کریں۔“ میں رہ نہ سکی کہہ بیٹھی۔

”تم خود سوچو جویریہ میں کسی ایسی لڑکی کو کیسے بہو بنا لوں جو میرے بیٹے کا گھر سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہو جو کسی اور کی یاد میں گم سارے جہاں سے بے گانہ ہو۔“

”میں نے احتشام اور مسز انصاری دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن دونوں کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں۔“ بالآخر میں نے کہہ ہی دیا۔

"میں نے کہا نا میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کو تیار ہوں۔" احتشام کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔

"ہرگز نہیں اور ابھی تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس کے بھائی بھی مانیں گے یا نہیں۔" خالہ امی نے ایک اور اعتراض ڈھونڈ نکالا۔

"مان جائیں گے وہ بھی۔" احتشام کسی ضدی بچے کی طرح بول رہا تھا۔ خالہ امی صاف انکاری تھیں۔

"زندگی میں نے گزارنی ہے، جیون ساتھی میری پسند کا ہونا چاہیے۔"

"پہلے دو جیون ساتھی بھی تو تمہاری پسند تمہارے جذباتی فیصلوں کی نذر ہوگئے۔ اب پھر تم ویسے ہی جذباتی دور سے گزر رہے ہو، تم نے جتنی من مانی کرنی تھی کر چکے اب تمہارے لیے میں اور تمہاری بہنیں لڑکی ڈھونڈیں گے اور بس۔"

"میں عفیفہ سے شادی کروں گا یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" احتشام عفیفہ کے لیے واقعی سیریس تھا یا ضد میں آکر ماں کے ساتھ الجھ رہا تھا میں سوچ میں پڑگئی۔ میرا وجدان کہتا تھا یہ شادی نہیں ہونی چاہیے۔ میں احتشام کی طرف سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ بہت جذباتی اور تیز مزاج تھا اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مسز انصاری نے ایک بار بتایا تھا پہلے پہل اپنے بھائیوں کے آنے پر عفی کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کرتی تھی مگر اب ان کے آنے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی اور وہاں سے اٹھ کر چلی جاتی، وہ شرمندہ سے ہوجاتے۔

مسز انصاری نے عفیفہ کی دوا، غذا اور لباس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ وہ کافی بہتر ہوچکی تھی مگر ابھی اس کی حالت اتنی تسلی بخش ہرگز نہیں تھی کہ اسے کسی ایسے مرد کے حوالے کردیا جائے جو خوب صورت ویل سیٹلڈ ہو مگر پل میں تولہ پل میں ماشہ والا مزاج رکھتا ہو۔ ماں کے انکار پر یوں لگتا تھا جیسے اس نے ضد پکڑ لی ہو اور مجھے اس کی اس ضد سے ڈر لگنے لگا تھا۔ ماں بیٹے کی لڑائی میں عفیفہ کا کوئی قصور نہیں تھا وہ تو دونوں ہی کو جانتی تک نہ تھی، نہ اسے مسز انصاری کے ارادوں کی کوئی خبر تھی۔ شاید وہ مسز انصاری کے گھر سے نکل کر ان کی توجہ ان کی محبتوں سے دور ہو کر جی ہی نہ سکتی لیکن مسز انصاری کے دل و دماغ میں ایک ہی بات سمائی تھی وہ عفیفہ کے ہاتھ پیلے کر کے اس کی خوشیوں کو دوام بخشنا چاہتی تھیں۔ احتشام کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود خالہ امی عفیفہ کا رشتہ مانگنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہیں اس رشتے پر سو اعتراض تھے۔ خالہ امی واپس لاہور چلی گئیں، ماں بیٹے کے تعلقات میں سخت کشیدگی آچکی تھی۔ مسز انصاری کی مایوسی قابلِ دید تھی۔ عفیفہ اسی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ میں عفیفہ کے لیے آج بھی پریشان۔

اس ساری کہانی کا انجام یہ ہوا کہ احتشام نے خالہ امی کی بات مان کر ایک MBA لڑکی سے بیاہ رچالیا جو اس کے گھر کے ساتھ ساتھ اس کے آفس کو بھی سنبھالتی ہے۔ مسز انصاری سخت مایوس ہوئی ہیں۔ اب وہ کسی نئے رشتے کے انتظار میں ہیں، میں حسبِ معمول ان کے گھر جاتی ہوں۔ عفیفہ اب پہلے سے زیادہ بہتر ہوتی جارہی ہے۔ مجھے پہچانتی ہے، میرے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی ہے جن میں اکثر زعیم کا ذکر ہوتا ہے۔ میں اس کی ساری باتیں سن کر اتنا ہی کہتی ہوں۔

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔ اور سچی محبت کرنے والوں کو منزل مل ہی جاتی ہے۔ دیر سے ہی سہی مگر ملتی ضرور ہے۔



حکمتِ عملی

شمع سید



پارو گرم چادر کی بکل مارے خود سے باتیں کرتی گاؤں سے ڈیرے کی طرف جاتی پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کی خود کلامی بھی جاری تھی۔ "یہ باؤ افضل بھی عجیب ہے، رب جانے اتنی کیا ضروری بات ہے کہ ڈیرے سے آگے نہر پار بلایا ہے، وہ بھی اتنے سویرے...... میں تو دن چڑھے اکیلے اس طرف کا رخ نہ کروں۔ چاروں طرف ہو کا عالم، نہ بندہ نہ بندے کی ذات......" یہ محبت بھی بڑی

انوکھی شے ہے دل میں ڈر بھرتی ہے تو نڈر بھی بے حساب کرتی ہے۔

دور سے چاچا شفیع دودھ کے کین لاوے اپنی سائیکل گھسیٹتا ہوا آرہا تھا۔

''سلام چاچا......''

''وعلیکم السلام دھیے...... اتنی صبح کہاں جارہی ہے میری کرموں والی دھی؟''

''ڈیرے تک جارہی ہوں چاچا، آج اماں کا دل ساگ پکانے کا تھا تو میں نے سوچا لے آؤں۔ دھوپ نکل آئے تو جلدی کملا جاتا ہے۔''

''جا پتر...... پردھیان سے جانا ڈیرے پر کتے بھی کھلے ہوتے ہیں اس وقت۔''

''جی چاچا میں کوئی پہلی واری تھوڑی جارہی ہوں ڈیرے پر۔''

''اچھا پتر رب راکھا۔'' پارو نے جلدی جلدی قدم بڑھانے شروع کیے کہ مبادہ کوئی اور نہ مل جائے اور یونہی پوچھ گچھ اور حال احوال میں دن سر پر چڑھ آئے۔

سرسوں کے کھیت کنارے بیٹھا باؤ افضل دور سے ہی پارو کو آتے ہوئے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''سلام باؤ افضل۔''

''وعلیکم السلام۔''

''بتا باؤ افضل تو نے اتنی دور کیوں بلایا ہے مجھے، وہ بھی یہاں اتنی کیا ضروری بات ہے؟''

''بیٹھ تو جا پھر کرتے ہیں باتیں۔''

''کون سی باتیں......؟ تم نے مجھے ایک ہی بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ مجھے جلدی گھر جانا ہے ساگ کے بہانے نکلی ہوں اتنی صبح گھر سے۔ سرسوں ساری پھول گئی ہے گندلیں اکٹھی کرنے میں بھی وقت لگے گا۔''

''دور اس لیے بلایا ہے کہ تجھے جی بھر کے دیکھنا بھی تھا۔ شام کو چھت پر تو لاڈو تیرا پلو پکڑے گھومتی رہتی ہے۔ ویسے چاچے دلاور نے اپنی بیٹیوں کے نام چن کر رکھے ہیں۔ پارو، لاڈو......''

''پارو کا مطلب پیاری اور لاڈو کا مطلب لاڈلی ہے باؤ افضل۔ اچھا اب بول تو سہی کیا بات ہے؟''

''بات یہ کرنی ہے بلکہ تیری رائے بھی لینی ہے کہ رات اماں، آپا ثریا سے لاڈو اور اکمل کے رشتے کی بات کررہی تھی۔''

''تو اس میں مجھ سے رائے لینے والی کیا بات ہوئی بھلا......''

''میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی پاگلے......''

''اچھا بول۔''

''اماں آپا سے کہہ رہی تھیں کہ اکمل کے لیے لاڈو کا رشتہ مانگ لے پھر ہمارے ویاہ پر ہی منگنی کردیتے ہیں۔ ابا بھی اماں کا ہم خیال ہے۔''

''تو ٹھیک ہے ناں باؤ افضل، یہ بڑوں کے فیصلے ہیں بڑوں کو کرنے دے۔ مجھ سے کیا پوچھنا...... اکمل اور لاڈو کا جوڑ بھی بنتا ہے۔ ابا مان جائے گا اور پھر دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں رہیں گی ہمیشہ۔'' پارو کے جواب پر افضل کچھ خاموش سا ہوگیا۔ چہرے پر ناگواری کا تاثر بھی جھلکنے لگا جسے بھولی بھالی پارو دیکھ اور سمجھ نہ سکی۔

''ٹھیک ہے جب تو خوش ہے، سب خوش ہیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''یہ کی ہے تو نے سیانوں والی بات باؤ افضل...... اچھا اب جلدی جلدی میرے ساتھ ساگ تڑوادے پھر ساتھ ہی چلتے ہیں...... تو ڈیرے پر رک جانا، میں گھر کی طرف ہوجاؤں گی۔''

☆☆☆......☆☆☆

''اماں میں سوچ رہا ہوں ابھی لاڈو اور اکمل کے رشتے کی بات رہنے دے۔ پہلے ہماری شادی ہوجائے پھر کوئی فیصلہ کرنا۔ جان پرکھ کر جب رشتے بدلتے ہیں تو لوگوں کے ساتھ اُن کی نیت بھی بدل جاتی ہے۔''

''کیسی باتیں کررہا ہے تو افضل پتر...... وہ لوگ نہیں تیرا سگا چاچا ہے۔ برسوں کا ساتھ ہے۔ ایک دوجے کو اچھی طرح جانتے ہیں سب...... ایک عمر تک سانجھے ویڑے رہے ہیں، اب تو بچوں کے جوان ہونے پر درمیان میں چھوٹی سی دیوار آگئی ہے۔''

''یہی بات تو میں تجھے سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں میری بھولی ماں...... بچوں کی وجہ سے ہی تو دیواریں اٹھتی ہیں، دلوں میں بھی اور آنگن میں بھی۔''

''ایسی باتیں کرکے میرا دل کھٹا نہ کر افضل۔ ہم نے ایک عمر گزاری ہے۔ رشتوں کی باریکیوں کو بھی سمجھتے ہیں اور باہمی محبت کو بھی۔''

''پھر بھی اماں کہیں لوگ یہ کہیں کہ ہم یہ سب جائداد کے لالچ میں کررہے ہیں۔ چاچے دلاور کا پتر تو کوئی ہے نہیں اور پھر چاچی سکینہ کو جہیز میں ملی ہوئی زمینوں کی وجہ سے بھی ان کا پلڑا بھاری ہے۔''

''لوگ کہتے اور سوچتے رہیں۔ تیرے چاچا، چاچی بھلے لوگ ہیں بہت سچے اور کھرے...... اور پھر دونوں بچیاں ہمارے سامنے ہی جوان ہوئی ہیں۔ دیکھی بھالی ہیں۔ باحیا، باسلیقہ اور رج کے سوہنی بھی...... تو زیادہ سوچ سوچ کر اپنا خون نہ جلا۔ رب خیر کرے گا۔''

☆☆☆......☆☆☆

چند اشعار

ابھی ہجر کا موسم طاری ہے اور پل پل مجھ پہ بھاری ہے
کچھ دل بھی اپنا نازک ہے کچھ وار ترا بھی کاری ہے

ہم اپنی وضع کے بندے ہیں ہم اپنی طرز کے انساں ہیں
جو زیست سراسر مایہ تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے

ہم ہار کے بھی کب ہارے ہیں تو جیت کے بھی کب جیتا ہے
کچھ مان ترا بھی رکھنا تھا یوں جیت کے بازی ہاری ہے

کلام: یمنیٰ احمد

آج پارو کی شادی تھی کچھ دیر میں برات آنے والی تھی، سہیلیاں سکھیاں چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں۔

''بڑا سوہنا انتظام کیا ہے پارو تیرے ابا نے برات کے استقبال کا، بڑی بخت آور ہے تو۔'' ہر چیز نئی انوکھی اور...... دلکش تھی پھر وہ تائی، تایا اور باؤ افضل کا ہزار بار کا دیکھا ہوا چہرہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہر شے دیدنی تھی۔

آج باؤ افضل کے آنگن میں ایک نیا دن اترا تھا...... ایک نور، ایک خوشبو لے کر...... پارو کی مہندی کی خوشبو، اس کی سیج کے پھولوں کی خوشبو، اس کی روح سے پھوٹتی سرشاری اس کے تن میں کھلتے ہزاروں پھولوں کی خوشبو...... خود باؤ افضل بھی حالتِ خمار میں تھا۔

''اماں شادی تو اللہ کے کرم سے خیر خیریت سے نپٹ گئی۔ اب آج شام ہی ولیمے کے بعد منگنی کی رسم پوری کردیتے ہیں۔ چرچا تو ہے سب میں۔''

''تو نے میرے دل کی بات کہہ دی پتر...... آج ہی رسم کردیتے ہیں۔''

''کون سی رسم اماں......؟'' افضل، اماں اور آپا

کی آخری بات ہی سن پایا تھا۔
''اکمل اور لاڈو کی منگنی کی رسم پتر۔''
''ایک تو آپ کو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی پڑی ہے۔'' افضل نے کچھ ناگواری اور جھنجلاہٹ سے کہا۔
''میں پوچھتی ہوں آخر تجھے کیا اعتراض ہے اس رشتے پر...... جب بات کرو یونہی اکھڑ جاتے ہو؟''
''مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا اماں، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ دن صبر کریں دونوں کہیں بھاگے تھوڑی جا رہے ہیں۔''
''تو بڑوں کے فیصلے میں دخل نہ دیا کر، ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا کب کرنا ہے۔''
''ٹھیک ہے اماں کرلیں اپنے ارمان پورے۔ اللہ مبارک کرے یہ رشتہ، آمین۔''
''یہ کی ہے ناں تو نے بڑے بھائیوں والی بات۔''

☆☆☆......☆☆☆

''ایک تو میں تمہاری جلدی جلدی کی رٹ سے پریشان ہو جاتی ہوں باؤ افضل۔''
''میں جلدی کا شور اس لیے مچا رہا ہوں کہ آپا نے ہمیں دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔''
''تو کیا شام ہوتے ہی وہ ہمیں گھر سے نکال دیں گی۔''
''نہیں پگلی...... میں آپا کی طرف رات رکنا نہیں چاہتا...... اور تجھے پتا ہے ان کا گاؤں یہاں سے کتنے کوس دور ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر لوٹنا ہے۔ نہر کے ساتھ ساتھ رستہ بھی سنسان ہے۔''
''تو تجھے کیا پڑی تھی اپنے دوست سے موٹر سائیکل مانگنے کی۔ آرام سے بس پر چلے جاتے۔ میری ٹانگیں تو لکڑ ہو جائیں گی موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے۔''
''واہ پارو تو تو بڑی سوہنی ہو گئی ہے۔ نظر نہیں ٹکتی تیرے روپ پر۔''
''تو نہ ٹکا نہ نظر آپا میری گھر والی پر...... نظر لگ جائے گی تیری۔''
''نہ افضل، بہنوں کی نظر نہیں لگا کرتی، تجھے کیا پتا کتنی دعائیں نکلتی ہیں دل سے تم دونوں کے سکھ سکون کی۔''
''پارو تیرا روپ کہتا ہے کوئی خوشی کی خبر ہے؟''
''ہاں آپا، اماں بھی یہی کہتی ہے۔ میرا جی تھوڑا سا متلا رہا تھا تو اماں نے کہا آ کر اماں ہاجراں کو نبض دکھلاؤں گی تو پتا چل جائے گا۔ باؤ افضل بھی کہہ رہا تھا آپا کے گھر سے ہو آئیں پھر اماں کے ساتھ چلی جانا۔''
''رب سوہنا پہلے ہی برس گود ہری کر دے تو یہ بھی ایک عورت کے لیے بڑے نصیب کی بات ہوتی ہے۔''
''تیری باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں پارو...... اب دیکھ شام ہو گئی ہے۔ مغرب کی اذانیں تو رستے میں ہوں گی۔''
''رب خیر کرے گا باؤ افضل تو موٹر سائیکل ذرا آہستہ چلا۔ ہر چیز تیز تیز بھاگتے دیکھ کر مجھے تو چکر آنے لگے ہیں۔ دل دہل رہا ہے میرا......'' موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے بل کھا کر گری...... افضل اور پارو دونوں اچھل کر دور جا گرے۔ تھوڑا ہوش ٹھکانے آیا تو سامنے تین بندے منہ سر لپیٹے بندوقیں لیے کھڑے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر افضل کے سینے پر بندوق تانی...... دوسرے نے پارو کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کیا۔ تیسرا کچھ فاصلے پر کھڑا پہرا دیتا رہا۔
''تم لوگ کیا چاہتے ہو......؟'' افضل نے گھگیا کر پوچھا۔ پارو کی تو خوف اور دہشت سے آواز ہی بند ہو گئی تھی۔
''بتاتے ہیں...... بتاتے ہیں، ذرا رستے سے نیچے تو آؤ......'' وہ دونوں کو گھسیٹتے ہوئے نیچے کچے راستے پر لے آئے۔
''دیکھو اگر تم لوگوں کو نقدی، زیور چاہیے تو ہمارے پاس جو کچھ ہے سب لے لو مگر ہمیں جانے دو۔''
''اچھا...... کیا کیا ہے تمہارے پاس نکالو...... سب۔'' افضل نے اپنی جیبیں الٹ دیں۔ گھڑی اور انگوٹھی بھی نکال کر دے دی۔ دوسرے نے پارو کی چادر کھینچی اور زیور نوچنا شروع کر دیا۔ کانوں سے بندے کھینچتے ہوئے درد کا شدید احساس سسکاری اور آنسوؤں کی صورت میں پارو کے ہونٹوں اور آنکھوں سے بہنے لگا۔ زیور نوچنے والے کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ پارو کا دل کسی انہونی کے احساس سے لرزنے لگا۔
''اس کے مجازی خدا کو باندھ کر پھینک دو اور اس نئی نویلی دلہن کو جھاڑیوں کے پیچھے لے چلو۔''
پارو نے ڈر کر باؤ افضل کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہر احساس سے عاری اور زبان گنگ ہو گئی تھی۔ مر تو وہ بھی گئی تھی۔ افضل کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سڑک کے دوسری طرف لڑھکا دیا اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے جھاڑیوں کے پیچھے لے گئے۔ پارو نے ایک الوداعی نگاہ باؤ افضل پر ڈالی، وہ جانتی تھی کہ اگر بچ بھی گئی تو دوبارہ باؤ افضل کا سامنا نہیں کر پائے گی۔ دل میں اپنی بقا اور آبرو سے زیادہ افضل کی زندگی کی دعا تھی۔ کچھ دیر تو جھاڑیوں کی اوٹ سے مزاحمتی آوازیں بلند ہوتی رہیں پھر چیخیں اور سسکیاں رہ گئیں۔ تیسرے شخص کے جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہونے کے ساتھ ہی فضا میں گولی کی آواز اور ایک آخری سسکی گڈ مڈ ہوئی پھر گہرا سکوت چھا گیا...... موت کے بعد کا ہولناک سکوت......
دنیا افضل کی لٹی تھی تھک وہ لوگ گئے تھے۔
افضل ان کے انتظار میں چکر پھیریاں کھا رہا تھا۔
''اتنی دیر لگا دی تم لوگوں نے...... مجھے گاؤں اطلاع بھی کرنی ہے۔ آخر لاش بھی تو لے جانی ہے کسی طرح۔'' افضل کچھ برہم ہوا۔
''اپنے پیسے تم پہلے ہی وصول کر چکے ہو، اب اپنی شکلیں گم کرو اور دوبارہ کبھی نظر نہ آنا۔''
''ٹھیک ہے، جاتے ہیں...... زیادہ غصہ نہ دکھا۔ ہم نے اپنے اردگرد بہت بے غیرت اور غلیظ لوگ دیکھے ہیں پر تجھ جیسا آج تک نہیں دیکھا۔'' تینوں نے حقارت بھری نظر افضل کی طرف اچھالی، تھوکا اور جھاڑیوں کے ساتھ پگڈنڈی کی طرف بڑھ گئے۔
''ایک تو فضول میں ان لوگوں نے اتنی دیر لگا دی۔ اب جانے کب تک رک کر کسی سواری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ رونا دھونا اور مظلومیت کا ڈراما الگ...... اس غلاظت کی پوٹ کو بھی ساتھ لے جانا پڑے گا دیکھوں تو سہی کس حال میں پڑی ہے۔ اماں سے کہا بھی تھا کہ جلدی نہ مچا لاڈو اور اکمل کا رشتہ کرنے میں...... آخر آ تو جانا تھا اسے ہمارے گھر بہن کا اجڑا گھر بسانے اور پھر چاچے کو بھی تو اپنی زمینیں سنبھالنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہے بوڑھا ہو گیا ہے بے چارہ...... اکمل ٹھہرا نا سمجھ، نا تجربے کار بچہ......'' جھاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے افضل کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

قسط 11

ایک تھی نیناں

راحت وفا

کچھ کھٹی سی، کچھ میٹھی سی... کبھی شعلہ سی... کبھی شبنم سی... تھوڑی بھولی سی... تھوڑی نادان سی... محبت، نفرت اور اعتبار کے تکون میں سرگرداں... رشتوں کے ٹکراؤ اور الجھاؤ کی داستان... جس میں بھول اور نادانی کی کسک اور گناہِ بے لذت کی حقیقت کا اسرار ہر قدم پر کچوکے لگاتا ہے۔

ایک نابغہ روزگار، پرتجسس، نفسیاتی اور رومانوی ناول جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

خان جی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر مہ جبیں کو لاکھ خواہش اور فرمائش کے باوجود نہ ملازمت کی اجازت ملی اور نہ ذاتی کلینک اور اسپتال بنانے کی اجازت ملی۔ راجا صاحب متوسط طبقے کے بیروزگار نوجوان تھے۔ خان صاحب نے جانے کیا سوچ کر اکلوتی بیٹی ان سے بیاہ دی تجوریوں کے منہ کھول کے جہیز اور بنگلا، گاڑی، خدمت کے لیے مہ جبیں کی ہم عمر ملازمہ سکھاں بھی ساتھ میں رخصت کردی۔ ڈاکٹر مہ جبیں کو راجا صاحب نے میٹھی زبان سے رام کیا ان کی خواہش پر بنگلے کے وسیع کشادہ لان میں چھوٹا سا اسپتال نما کلینک بنا دیا یوں مہ جبیں کی خواہش کو راجا صاحب نے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنا دیا۔ بیٹا ریحان اختر بھی اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ وسیمہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کی حادثے کا شکار ہوئی اپنا بیٹا لاوارث چھوڑا۔ پولیس نے بچہ راجا صاحب تک پہنچایا۔ جس کا نام طلال رکھا گیا۔ مہ جبیں کے والدین اور سکھاں کے والدین اپنے آبائی علاقے میں خان جی کے سوتیلے بھائی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ راجا صاحب اور ڈاکٹر مہ جبیں کے انتقال کے بعد ریحان اختر نے بھانجے کی بہت لاڈ پیار سے پرورش کی مگر ستم رہ گیے۔ طلال ایک ضدی، ہٹ دھرم نوجوان تھا۔ ریحان اختر نے امیر کبیر گھرانے کی رابعہ سے محبت کی شادی کی، اس سے بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نیناں رکھا گیا۔ نیناں میں ریحان اختر کی جان تھی۔ اچانک رابعہ کو کچھ ایسا ثبوت دیکھنے کو ملا کہ وہ ریحان اختر سے نفرت کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان فصیل قائم ہوگئی۔ طلال کی نیناں پر نظر تھی جبکہ رابعہ کی بڑی بہن عارفہ کا اکلوتا بیٹا رمان احمر جو کہ ملٹی نیشنل کمپنی میں ریجنل منیجر ہے وہ اور نیناں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر رمان کی پھپھو کی بیٹی دعا فاطمہ، رمان سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہے لیکن وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے۔ دعا بار بار رمان سے کھلم کھلا نیناں کی وجہ سے دوبدو ہوتی ہے مگر رمان کے دل میں صرف نیناں ہے۔ عارفہ، رابعہ ان کی دادی زیتون بیگم بارہا اس موضوع پر بات کر چکی ہیں۔ عارفہ کو نیناں پیاری ہے تو دعا بھی عزیز ہے مگر رمان نہیں مانتا۔ نیناں کی سہیلی مدیحہ جو کہ اس کی کالج فیلو ہے اس کا تعلق غریب گھرانے سے اس کے گھر میں بڑا بھائی زلفی، اماں اکبری اور پھپھو موجود ہیں پھپھو کو وہ آپا کہتے ہیں آپا کی زندگی سنگین حادثے کا شکار ہے اس لیے مدیحہ اور زلفی ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپا مدیحہ کو امیر سہیلی سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں، سبحان رابعہ کے بہترین دوست ہیں مگر ان سے انہوں نے محبت نہیں کی جبکہ سبحان نے اپنی پیاری دوست کے بعد نہ شادی کی نہ اپنے تایا ابا کی بات مانی۔ بیرون ملک ملازمت کرلی اب وہ واپس آئے ہیں یہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کر کے باہر ہی مستقل سیٹ ہونے کے لیے...... جس پر تایا ابا راضی نہیں ان کے خیال میں سبحان کو سعدیہ سے شادی کرلینی چاہیے۔ جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ کہانی میں نیا موڑ آیا ہے کہ رابعہ کی ملاقات میڈیکل اسٹور پر سیلز مین ذوالفقار سے ہوئی ہے۔ رابعہ نے اس ہمدرد کی بات مان لی۔ رابعہ میں آنے والی خوش آئند تبدیلی سے نیناں بوا بہت خوش ہیں۔ ریحان اور طلال متحیر ہیں۔ طلال کی اور نیناں کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ طلال، نیناں پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے جس پر رابعہ بہت غصہ ہوتی ہیں اور ایمان اختر کو بتاتی ہیں لیکن ایمان اختر کوئی رسپانس نہیں دیتے۔ رابعہ کی ذوالفقار سے اچھی دوستی ہو جاتی ہے جس پر ریحان اختر جیلس ہوتے ہیں۔ رمان، رابعہ کے کہنے پر نیناں کو مدیحہ کے گھر لے کر جاتا ہے بائیک پر جو دعا کو اچھا نہیں لگتا۔ ریحان اختر، رمان کو آفس ملنے کے لیے بلاتے ہیں تو وہ آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ ایک ایگزی بیشن میں رابعہ کی ملاقات سبحان سے ہوتی ہے تو سبحان رابعہ کو پہلے والے انداز میں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ رشتے کرانے والی کے مشورے پر اکبری بیگم، ذوالفقار سے گھر تبدیل کرنے کو کہتی ہیں۔ طلال اور ریحان اختر چاہتے ہیں کہ نیناں آفس جوائن کرے لیکن وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ نیناں رمان کو فون کرتی ہے لیکن دعا اس سے بات نہیں کراتی۔ ریحان اختر، رمان کو اپنے ساتھ بزنس میں شامل کرنا چاہتے ہیں لیکن رمان راضی نہیں ہوتا۔ ذوالفقار اپنے گھر تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کر رہا ہے، سبحان اپنا گھر بیچ کر بڑے ابا کو بھی اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ ریحان اختر کلینک توڑ دیتے ہیں، جو بوا کو اچھا نہیں لگتا۔ زیتون بیگم کا انتقال ہو جاتا ہے۔ رابعہ ذوالفقار کو چیک دیتی ہے لیکن وہ کیش نہیں ہوتا۔ نیناں کا نام ریحان اختر نے اپنی پہلی بیوی اور محبت کے نام پر رکھا ہے یہ بات رابعہ کو معلوم ہوتی ہے تو وہ بوا پر بہت غصہ کرتی ہیں۔ رابعہ، ذوالفقار سے ملتی ہیں لیکن مدد کرنے سے معذوری ظاہر کر دیتی ہیں دعا کے لیے رشتہ آتا ہے اور وہ لوگ دعا کو پسند کر لیتے ہیں لیکن دعا رمان کو بھلا نہیں پا رہی۔ رابعہ، سبحان اور ان کے تایا ابا کو باہر جانے سے روک دیتی ہیں۔ ——— (اب آگے پڑھیں)

ریحان اختر کو گئے ہفتہ ہو گیا تھا۔ رابعہ دن گن رہی تھیں، ریحان اختر کا انتظار تھا...... مگر ان کی کس کو خبر تھی؟ ایک عجب سی پُراسراریت تھی ماحول میں، سب چپ چپ اور الگ الگ سے تھے...... نیناں کی دنیا یونیورسٹی اور گھر کے کمرے تک محدود ہوگئی تھی، رابعہ گھر میں یا پھر دادی کی طرف چکر لگا آتیں، گلو سے ڈھیروں باتیں کر کے اس دل گرفتہ کو تسلیاں دے آتیں، چاہا کہ اسے کہہ دیں۔

''گلو! اب رابی بی بی یہیں آ کر رہیں گی۔'' مگر اپنا کمرا دیکھ کر آ جاتیں بوا سے جانے کیوں بات کرنے سے گریزاں ہوگئی تھیں، وہ بات کرتیں بھی تو سنی ان سنی کر دیتیں، بوا کا اندازہ درست تھا کہ وہ ریحان کے بارے میں جان کر انہی کو قصوروار سمجھ رہی تھیں۔ نیناں ماں کے اس رویّے پر حیران تھی مگر وجہ نہیں پوچھ سکتی تھی کیونکہ وہ پھر سے خاصی چڑ چڑی سی ہوگئی تھیں۔ اس وقت بھی بوا نے مہمان کی آمد کا ذکر کیا تو وہ تڑخ کر بولیں۔

''تو میں کیا کروں؟'' وہ سہم سی گئیں۔

''وہ لڑکا تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''مجھے کسی لڑکے سے نہیں ملنا۔'' انہوں نے سختی سے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئیں...... نیناں پیچھے ہی چلی آئی۔

''مما! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''کیوں......؟''

''بوا کو کس قدر برے طریقے سے جھڑکا ہے آپ نے۔''

''بوا، بوا، بوا، بس کرو، جا کر دیکھو کون ہے؟''

''میں......؟'' اس نے پوچھا تو وہ چند لمحے سوچ میں پڑ گئیں اور پھر خود ہی باہر نکل آئیں۔

''چلا گیا ہے۔'' بوا نے انہیں باہر سے آ کر اطلاع دی تو وہ وہیں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔

''کون تھا......؟'' دھیرے سے پوچھا۔

''ذوالفقار۔''

''کیا کہہ رہا تھا......؟''

''کہہ رہا تھا کہ پھر آؤں گا۔'' بوا یہ کہہ کر جانے لگیں تو وہ بولیں۔

''آپ کو تو پتا ہی ہوگا ریحان کب آئیں گے؟'' انہوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے انہیں ممتا بھرے انداز میں دیکھا اور آگے بڑھ گئیں...... رابعہ کو کچھ تاسف ہوا مگر نیناں نے موبائل فون لا کر تھمایا تو نارمل ہو کر فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!''

''ہیلو! رابعہ جی!'' ذوالفقار کی آواز آئی تو انہیں نیناں پر غصہ آیا کہ بلاوجہ فون لا کر دے دیا۔

''جی۔''

''مجھے معلوم تھا کہ آپ گھر میں ہی ہیں، صرف ایوائڈ کر رہی ہیں۔''

"یہ بات نہیں ہے، دراصل میں کچھ ڈسٹرب ہوں۔"
"میں آپ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔"
"پلیز! ذوالفقار! میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی اور ویسے بھی آپ سے معذرت میں کر چکی ہوں......" انہوں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔
"کون سی معذرت...... کس کس معذرت کا پوچھوں......؟" انتہائی طنز میں ڈوبا ذومعنی جملہ تھا۔
"کیا کہنا چاہتے ہو؟" انہیں کچھ غصہ سا آ گیا۔
"معذرت نہیں چاہیے۔"
"دیکھو! میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے، میں معذرت کر سکتی ہوں۔"
"تو راجا ریحان اختر سے مانگ لیں۔" بڑی بے باکی سے کہا گیا تو انہیں چار سو چالیس کا جھٹکا لگا۔
"کیا......"
"ہاں! اُن کی طرف کافی سود نکلتا ہے۔"
"کیا مطلب ہے؟"
"چلیں مطلب پھر کبھی سمجھاؤں گا...... بلکہ وصول کر کے بتاؤں گا، بائے۔" بڑے اطمینان سے اطلاع کے طور پر کہہ کر فون بند کر دیا۔ رابعہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ حیران پریشان سی اپنے آپ کو ہی ملامت کرنے لگیں۔
"بلاوجہ کسی پر اتنا بھروسا کیا ایک غیر سے دانستہ راہ و رسم کی کیا ضرورت تھی؟ ایک نئی مشکل۔" یہ سوچ کر ہی سر درد سے پھٹنے لگا...... ایسے میں نیناں نے پیشانی پر محبت بھرا ہاتھ رکھا تو کچھ حوصلہ سا ملا۔
"بابا کی وجہ سے پریشان ہیں......؟" نیناں نے پوچھا۔
"نہیں، تمہاری وجہ سے فکر مند ہوں میری جان!" انہوں نے پیار سے اس کا پیشانی پر رکھا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔
"مما! آپ بابا سے رمان کی بات کریں۔" اس نے دل کی بات کہی۔
"رمان میری بیٹی کا مقدر ہے، اللہ پر بھروسا ہے مجھے۔" پورے یقین کے ساتھ انہوں نے اسے امید دلائی۔

☆☆☆......☆☆☆

گھر میں گھستے ہی اس نے آپا کے کمرے کا رخ کیا...... اور چند منٹوں میں ان کے پرانے صندوق اور اٹیچی کیس کی ایک، ایک چیز نکال کر باہر پھینک ڈالی۔ آپا کے شادی کے پرانے سوٹ، چوڑیاں، ننھے منے کرتے، پاجامے، نیکر شرٹس فرش پر پھیلا دیں...... آپا نے کمرے میں داخل ہو کر حیرت اور افسوس کے ساتھ بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا اور بپھرے ہوئے زلفی کو گھورا۔
"آپا! آپا! وہ فوٹو کہاں ہے، جس میں وہ ملازمہ بھی ہے......" وہ بوکھلا کر بولا۔
"کون سی فوٹو اور کون سی ملازمہ؟" وہ کچھ تحمل سے بولیں۔
"آپا وہی فوٹو جس میں آپ، آپ کی سہیلی اور اس کی ملازمہ اکٹھے ہنس رہی ہیں۔"

"تم کیوں مانگ رہے ہو؟" ان کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہو گیا۔
"آپا! وہ فوٹو دکھائیں، میں جس بوڑھی عورت سے مل کر آ رہا ہوں، وہ وہی ہے، آپ فوٹو تلاش کریں۔"
"وہ میں نے پھاڑ کر پھینک دی تھی۔"
"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"ویسے بھی وہ ملازمہ میرا مسئلہ نہیں۔"
"آپ بلاوجہ مایوس ہو رہی ہیں، یہ کپڑے جس کے ہیں اس کے بارے میں ہمیں پتا چلے گا۔" وہ اتنے وثوق سے فرش پر پھیلے کپڑے اٹھاتے ہوئے بولا کہ ممتا بھرے جذبات آنکھوں سے چھلک پڑے۔
"آپا! راجا صاحب کی طرف ہمارا حساب نکلتا ہے۔"
"نہ منور دنیا میں ہے اور نہ وسیمہ پھر کیا فائدہ......؟" وہ سسکاری بھر کر بولیں۔
"آپا! میرا دل کہتا ہے کہ ان خاتون کو سب معلوم ہوگا۔"
"وہ دونوں یہاں سے بھاگ گئے تھے، راجا صاحب نے بہت تلاش کیا تھا۔"
"کچھ تو، کچھ تو وصول ہوگا، آپ کی برباد زندگی کا کچھ تو حاصل ہوگا۔" وہ الجھا الجھا سا یہ کہہ کر چارپائی پر بیٹھ گیا...... تب وہ آگے بڑھیں اور صندوق کی تہ سے لگا کاغذ پلٹ کر ایک بوسیدہ سا لفافہ نکال کر اس کے پاس آ بیٹھیں پھر ایک، ایک کر کے آٹھ دس تصویریں اسے لفافے سے نکال کر پکڑا دیں۔
"میری مجرم ایک ہی تھی......" وہ بولیں۔
"لیکن اس جرم میں جنھوں نے اُن کی مدد کی انہیں حساب دینا ہوگا۔"
"راجا صاحب کا بھی بہت قصور نہیں تھا بس منور ہی ہرجائی ہو گیا تھا۔" آپا کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔
"آپا! آپ کے سارے دکھوں کا نہیں کچھ نہ کچھ کا حساب کتاب ضرور کراؤں گا۔" وہ یہ کہہ کر سب تصویریں لیے باہر چلا گیا...... آپا کے حلق سے سسکیوں نے احتجاج کا راستہ اختیار کیا...... وہ ماضی کی کربناک یادوں سے لپٹ کر باقاعدہ رونے لگیں، مدیحہ پریشان ہو کر کمرے میں آئی اور غیر معمولی صورت حال دیکھ کر ان سے لپٹ گئی۔
"آپا! آپا!"
"ہونہہ۔" بہ مشکل ان کی آواز نکلی۔
"کیا ہوا......؟" وہ بولی۔
"میرا بچہ، میرے جگر کا ٹکڑا۔" روتے روتے وہ صرف اتنا ہی بولیں...... مدیحہ سمجھ گئی کہ انہیں اپنا منا یاد آ رہا ہے۔
"آپا! آپ نے تو صبر کر لیا تھا...... آج......؟" وہ کہتے کہتے رکی۔
"صبر جدائی پر کیا تھا، انتظار کے لیے نہیں۔" وہ اس کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں...... مدیحہ کو تسلی دینے کے لیے الفاظ جمع کرنے مشکل ہو گئے۔

☆☆☆......☆☆☆

گاڑی کا ہارن سن کر رابعہ کو اندازہ ہوگیا کہ ریحان اختر آ گئے ہیں۔ بند سوٹ کیس اٹھا کر دیوار سے لگا دیے اور بیڈ پر رکھے کھلے بیگ کی زپ بند کر کے اسے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ غیر ضروری مصروفیت دکھانے کے لیے وارڈ روب کھول کر دائیں بائیں ہاتھ مارنے لگیں۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ریحان اختر اپنے پرسنل ڈرائیور کے سہارے اندر داخل ہوئے، چہرے پر چھوٹے بڑے زخم جن پر کوئی میڈیسن لگی ہوئی تھی، دونوں ہاتھوں پر کلائیوں تک پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ کمزور اور نڈھال سے بستر پر بہ مشکل لیٹ سکے۔ رابعہ ورطۂ حیرت سے اس وقت باہر نکلیں جب انہوں نے ڈرائیور کو جانے کی اجازت دی اور ہلکے سے انہیں پکارا...... وہ کچھ تیزی سے چل کر اُن کے قریب آ گئیں یہ موقع ہی عجیب تھا۔

''رابعہ! بوا کو میرے پاس بھیج دو۔'' انہوں نے کراہتے ہوئے کہا مگر بوا خود مضطرب سی حالت میں وہیں آ گئیں۔ رابعہ نے باہر جانے کے خیال سے قدم اٹھائے تو انہوں نے روکنے کی سی ملتمس نگاہوں سے دیکھا...... وہ رک گئیں۔

''یہ سب کیا ہے؟'' بوا نے اُن سے پوچھا۔

''کہانی کا آخری سین......'' وہ رنجیدہ سے ہو گئے۔

''تمہیں کیا ہوا ہے یہ زخم، یہ پٹیاں......؟'' بوا بے قرار سی تھیں۔

''بوا! وہ مرتے مرگئی مگر مجھے جیتنے نہ دیا۔'' ایک دم شدتِ جذبات سے اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی، دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

''نیناں مرگئی......؟'' بوا چلا اٹھیں۔

''خدا نہ کرے، میری نیناں تو یہیں ہے، وہ کسی اور کی نیناں تھی؟'' وہ جذباتی ہو گئے۔

''پھر کیوں اسے جبر کی قید میں رکھا؟'' بوا کی زبان پر شکوہ مچل گیا۔ رابعہ کے لیے یہ سب باتیں پریشان کُن تھیں طبیعت بوجھل ہو گئی تھی۔ دل چاہا یہاں سے چلی جائیں مگر ریحان کی نظریں شاید تاڑ لیتی تھیں۔

''بوا! اس ضدی نے خود کو آگ لگا لی، میری لاکھ کوششوں کے باوجود وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی...... میں ہار گیا...... میں ہار گیا......'' بے اختیار ہی وہ رونے لگے اور ہاتھ بیڈ کی پٹی پر مارنے لگے۔

''کیا کر رہے ہیں ریحان؟'' رابعہ یکدم انہیں مخاطب کر کے چلائیں...... ''زخمی ہاتھوں کو سزا دینے سے کیا حاصل ہے؟''

''یہ ہاتھ بھی گناہ گار ہیں رابعہ!''

''اللہ سے معافی مانگیں، جو ہو چکا اس پر توبہ کر لیں۔'' رابعہ یہ کہہ کر وہاں سے باہر نکل آئیں...... مزید وہاں ٹھہرنے کا ان میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ انہیں تو سخت ذہنی صدمہ پہنچا تھا کہ ایک عورت نے جل کر جان دے دی، قید میں رہ کر موت کو گلے لگا لیا مگر ریحان اختر کی مرضی پوری نہ ہونے دی۔

''ریحان! تم نے اچھا نہیں کیا، محبت پیسے سے نہیں خریدی جاتی، حالات نے جس طرح بھی اسے آپ تک پہنچایا تھا، آپ کو خیانت نہیں کرنی چاہیے تھی، وہ جل کے مرگئی، کیا ملا آپ کو؟'' دکھی دل اور سلگتے ذہن کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی وہ سوچ رہی تھیں کہ بوا نے آ کر پشت سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ

چونکیں۔

''جی......؟'' انہوں نے پوچھا مگر انداز اجنبی تھا۔

''ریحان لوٹ آیا ہے۔''

''نہیں، نیناں لوٹ گئی ہے، ریحان کے بت کو کرچی کرچی کر کے۔ بہت بہادر تھی مگر مجھے اس کے جانے کا افسوس ہے۔'' رابعہ بولیں۔

''ارے کیوں؟ خوشی مناؤ ریحان تمہارا ہو گیا......'' بوا نے بہت خوشی کا اظہار کیا تو رابعہ کو اچھا نہیں لگا۔

''بوا وہ انسان تھی، ریحان کی ضد اور خواہش نے اسے مار ڈالا، آپ کو اس سے ہمدردی نہیں۔''

''اپنی بی بی سے وفاداری کا تقاضا یہی ہے۔''

''یہ خود غرضی ہے۔'' انہوں نے احتجاج کیا۔

''کچھ بھی کہو، مجھے وہ پسند ہے جو ریحان کو پسند ہے۔''

''مطلب......؟''

''ریحان کئی روز اسپتال میں رہ کر آیا ہے، میں اس کے لیے یخنی بناتی ہوں۔'' وہ یکسر رابعہ کی بات نظر انداز کر کے کچن میں چلی گئیں تو وہ جھنجلا کر اُن کے پیچھے ہی آ گئیں۔

''بوا! آپ کو ایسا کیوں لگا کہ مجھے اس کی چھوڑی ہوئی جگہ پر رہنا ہے، میرا سامان بندھ چکا ہے۔''

''دیکھو رابعہ بیٹی! وہ مر چکی ہے، اپنا گھر اب کیوں چھوڑنا......؟'' وہ فریج سے چکن نکالتے ہوئے بولیں۔

''ہونہہ! اس کے مرنے کے بعد جگہ خالی ہے کا بورڈ لگائیں ریحان اختر، مجھے ایسے دوغلے آدمی کے ساتھ نہیں رہنا۔'' وہ دوٹوک لہجے میں کہہ کر کچن سے باہر نکلیں۔

''اس حال میں ریحان کو چھوڑ کر جا سکتی ہو؟'' انہوں نے پکارا، وہ پلٹیں۔

''اتنا حق نہیں رکھتے ریحان، میں نیناں کو لے کر ابھی چلی جاؤں گی، ویسے بھی کل دادی کا چہلم ہے۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ بوا افسردہ سی ہو گئیں۔ رابعہ کی بات بھی حق پر مبنی تھی۔ ریحان نے جس طرح اذیت دی تھی اس کے بدلے میں اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

☆☆☆......☆☆☆

نیناں کو انہوں نے کچھ نہیں بتایا...... یونیورسٹی سے آتے ہی اسے چینج کرنے کو کہا اور ایک سوٹ کیس جس میں نیناں کے اور ان کے کپڑے تھے فیضو سے گاڑی میں رکھوایا۔ باقی ریحان کے کمرے میں موجودگی کے باعث کچھ سوچ کر فی الحال چھوڑ دیے۔ نیناں کو کچھ بھی نہ بوا سے پوچھنے کا موقع ملا تھا اور نہ بابا سے۔ پورچ میں دھول مٹی سے اٹی گاڑی دیکھ کر وہ جان چکی تھی کہ بابا آ چکے ہیں مگر مما کا رویہ بڑا سپاٹ اور تند تھا اس لیے اس نے پوچھنے کی جسارت نہیں کی۔

انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ریورس کی تو عین اسی وقت طلال کی گاڑی گیٹ کے سامنے آ گئی...... نیناں کو ذہنی جھٹکا لگا، مدیحہ اس کے برابر میں بیٹھی تھی اسے دیکھ کر نظریں چرا گئی۔ طلال نے ان کے لیے راستہ چھوڑا

اور مسکرانے لگا۔

''مما! پلیز ایک منٹ......'' اس نے تلملا کر گاڑی رکوائی اور غصے سے دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ طلال نے بیک ویو مرر سے اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا اس لیے دروازہ کھول کر بڑی ادا سے کھڑا ہو گیا۔

''مدیحہ! اسٹوپڈ، پاگل ہو گئی ہو تم۔'' نیناں نے طلال کے بجائے کھڑکی پر جھک کر مدیحہ کو مخاطب کیا۔

''اے چڑیا! مدیحہ اس وقت میری مہمان ہیں، تمیز سے بات کرو۔'' طلال اس کی طرف گھوم کے آ گیا۔

''طلال بھائی! اس معصوم کے حال پر رحم کھائیں، میرا انتقام میری سہیلی سے نہ لیں۔'' اس نے کچھ سوچ کر نرمی اختیار کی۔

''ارے واہ! بھئی تو کون، میں خوامخواہ والی بات ہے، میں مدیحہ کو پسند کرتا ہوں، تم کہاں سے درمیان میں آ گئیں......؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولا تو وہ شرمندہ ہو کر آخری بار مدیحہ سے بولی۔

''پلیز! مدیحہ سمجھنے کی کوشش کرو، گاڑی سے باہر آؤ، میرے ساتھ چلو۔''

''آپ چلتی پھرتی نظر آئیں بی چڑیا، ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے۔'' طلال نے..... اس کی بات کا جواب دیا۔

''مدیحہ! اپنی اماں کا آپا کا ہی خیال کر لو، وہ سن کر کتنی دکھی ہوں گی۔'' نیناں نے آخری کوشش کی تو مدیحہ نے لب ہلائے۔

''نیناں! آپا کو طلال کے بارے میں پتا ہے، تم میری اچھی سہیلی ہو پلیز......''

''نو، نیور، خبردار جو تم نے مجھے سہیلی کہا۔'' نیناں نے اس کا جملہ اچک کر غصے سے کہا اور تیز قدموں کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔

''یہ مدیحہ ہے نا......؟'' رابعہ نے اس کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مما! طلال بھائی اچھا نہیں کر رہے، وہ مجھے جلانے کے لیے مدیحہ کے ساتھ فلرٹ کر رہے ہیں۔''

''سو واٹ!'' رابعہ مطمئن رہیں۔

''مما! مدیحہ کے گھر والے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

''جو ہو رہا ہے ہونے دو، طلال سے ہماری جان تو چھوٹتی ہے۔'' وہ بولیں۔ نیناں کو ایسا لگا کہ مما کو کسی سے کوئی غرض نہیں رہی انہیں حالات نے اس قدر بے حس بنا دیا ہے شاید کہ وہ اس طرح سوچنے لگی ہیں، ایسے موقع پر بحث کا فائدہ نہیں تھا...... کچھ راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔

''مما! بابا کب آئے؟'' ایک دم ہی اس نے پوچھا۔

''یاد نہیں......''

''کیا مطلب......؟''

''میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔''

''میں مل کر نہیں آئی، وہ ناراض ہوں گے۔''

''نہیں، اب وہ ناراض نہیں ہوں گے۔''

''بابا ٹھیک تو ہیں۔''

''کچھ زخمی ہیں، بہت بڑے حادثے سے گزر کر آئے ہیں۔'' عجیب ذو معنی جملہ تھا وہ یکلخت کچھ پریشان سی ہوئی مگر گاڑی گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔

☆☆☆......☆☆☆

جونہی اس نے گھر میں قدم رکھا اکبری بیگم نے دو ہتڑوں سے اس کا استقبال کیا۔ منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیے۔ بال نوچ ڈالے، ایسا جنون ان پر طاری تھا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالتیں، جتنی دیر میں آپا سلام پھیر کر باہر آئیں اتنی دیر میں تو انہوں نے مدیحہ کو ادھ موا کر دیا۔ گھنٹوں کا انتظار شدید اشتعال میں بدل گیا تھا۔

''بس کرو، جان سے ماروگی کیا؟'' آپا نے کھینچ کر انہیں پرے کیا۔ مدیحہ کی بری حالت ہو چکی تھی۔

''اسے مار ڈالنا بہتر ہے، یہ رسوائی کرائے گی، زلفی کو پتا چل گیا تو وہ اسے دفن کر دے گا۔'' اکبری بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

''مدیحہ! کیوں گئیں تم گھر سے...... میرے منع کرنے کے باوجود......؟'' آپا نے اس کے بے ترتیب بالوں کو سنوارتے ہوئے پوچھا۔

''وہ، وہ......''

''یہ کیا بتائے گی؟ اس کا دماغ چل گیا ہے، رہنا جھونپڑے میں خواب محلوں کے۔'' اماں نے جھلا کر کہا۔

''تم بنا بتائے گھر سے نکل گئیں اتنا بھروسا ہے اس پر؟'' آپا نے حیرت و تاسف کے ساتھ اسے دیکھا۔

''اپنی کزن کو چھوڑ کر وہ اسے بدھو بنا رہا ہے، آج زلفی آجائے میں اسے لے کر جاتی ہوں، منہ توڑ کے آؤں گی اس کا۔'' اماں یہ اعلان کر کے کمرے میں چلی گئیں۔

''آپا، اس میں برائی کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''وہ دھوکا ہے، تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔''

''نہیں......''

''ٹھیک ہے پھر اس سے پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟'' آپا نے اماں کی بات کی تائید کی تو وہ پریشان ہو گئی۔

''نہیں، ابھی نہیں، نیناں مجھ سے خفا ہو گئی ہے۔''

''اور پھر بھی...... پھر بھی وہ ٹھیک ہے۔'' آپا نے تعجب سے کہا۔

''نیناں کو طلال سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔''

''پھر غلط کہا، وہ اس کو تم سے بہتر جانتی ہے۔'' آپا نے خاصے غصے سے کہا۔

''وہ میں جانتی ہوں کہ وہ کیوں ایسا کرتی ہے؟'' وہ کچھ نرم لہجے میں بولی۔

''اب ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنا۔'' وہ سختی سے کہہ کر وہاں سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

''نہ اس گھر کے حالات بدلیں گے نہ کچھ بہتری آئے گی، اسی لیے تو بڑے گھروں اور چھوٹے گھروں کے درمیان فاصلے رہتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ ہی باورچی خانے میں آ گئی۔

''یہ فاصلے قدرتی ہیں اور اچھے ہیں، بڑے جانور چھوٹے جانوروں کو نگل جاتے ہیں۔'' انہوں نے چائے کا پانی چولھے پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ ہم چھوٹے گھروں میں رہنے والے بڑے گھروں پر الزام لگاتے ہیں۔'' وہ بولی تو آپا نے اسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

''الزام نہیں لگاتے، حقیقت سے گزرتے ہیں، میں گزری ہوں تلخ حقیقت سے۔''

''بس، بس آپا رہنے دیں، آپ پھوپا جی کی بے وفائی کی سزا سب کو دیں۔'' وہ یہ کہہ کر پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی مگر آپا کی آنکھیں حیرت و افسوس سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کس قدر گستاخ اور بے ادب ہوگئی ہے، یہ تو ایسی تبدیلی تھی کہ جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں ... آج تک مدیحہ نے آپا کی پرستش کی تھی، یہ کیسا موڑ آیا تھا زندگی میں کہ وہ اس طرح دوبدو ہوگئی۔

''طلال نے اس پر کون سا سحر پھونک دیا ہے۔'' وہ صرف بڑبڑا کر رہ گئیں، دل اچاٹ ہوگیا بنا چائے بنائے چولھا بند کر کے کمرے میں آگئیں۔

☆☆☆......☆☆☆

رابعہ کی زبانی ریحان کی کہانی سن کر عارفہ متحیر رہ گئیں...... گم صم کچھ دیر انہیں دیکھتی رہیں رابعہ کو ہلکی سی ہنسی آگئی۔

''آپ کو یقین کرنے میں دشواری ہو رہی ہے نا؟''

''رابی! ریحان اب قابلِ رحم ہے، اس کے سچ پر ہی معاف کر دینا چاہیے۔'' وہ تحمل سے بولیں۔

''ہونہہ، کون سا سچ......؟ مجھ سے محبت کی قسمیں کھائی تھیں، مجھ سے دھوکا دہی کی، شدید ذہنی، جسمانی اذیتیں دیں، وہ سچ ہے یا یہ......؟''

''سب کو چھوڑ کر صرف اس بات کا یقین کرو کہ وہ اب صرف تمہارا ہے۔''

''یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔'' رابعہ نے بہت آہستگی سے کہا تا کہ نیناں نہ سن سکے مگر اس نے شاید سن لیا تھا، دھیرے سے قریب آ کر ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی۔

''مما! میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی تو میں اپنے مما، بابا کے ساتھ خوشی کے لمس کو محسوس کروں، سب کی طرح دونوں کے درمیان رہوں۔'' دل میں دبی خواہش نے لفظوں کا روپ دھارا۔

''بیٹا یہ خواہش آپ کو کرنی ہی نہیں چاہیے۔'' رابعہ نے محبت سے کہا۔

''مما! جو کچھ آپ نے عارفہ خالہ کو بتایا ہے، وہ سچ بھی ہے تو پلیز میری خاطر......'' نیناں کے اندر سہم تھا' وہ رو دی۔

''اب تک آپ کی خاطر ہی کیا ہے۔''

''تو اس کا پھل بھی اللہ نے دیا ہے، ریحان لوٹ آئے ہیں......'' عارفہ نے کہا۔

''کسی کی موت کے بعد...... یہ پھل میرے ضمیر کے لیے بوجھ ہے۔''

''اس میں تمہارا تو ذرا سا بھی قصور نہیں۔''

''سزا تو میں نے اور میری نیناں نے پائی ہے۔''

''رابی! اس احساس کو یوں محسوس کرو کہ ریحان اب صرف تم دونوں کے ہیں۔'' عارفہ آپی نے پیار سے کہا۔

''چھوڑیں! فی الحال ریحان کے بارے میں خود کو کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔'' وہ بولیں۔

''اس وقت ہی تو پہلے سوچنے کی ضرورت ہے میری جان!'' عارفہ بولیں۔

''عارفہ بی بی، رمان پوچھ رہے ہیں کہ فرشی چادریں کتنی منگوانی ہیں۔'' گلو نے آ کر پوچھا تو اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا...... عارفہ اٹھ کر چلی گئیں تب نیناں نے ترحم بھری نگاہوں سے رابعہ کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا حزن تھا، افسردگی تھی، وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

''مما! ہم یہیں رہیں گے، بابا کے پاس نہیں جانا۔''

''نیناں! وہ یہ اجازت کہاں دیں گے؟''

''میں ان سے ملنا بھی نہیں چاہتی، میں آپ کی بیٹی ہوں۔'' یکدم اس قدر مضبوط فیصلہ سنا کر وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھی رابعہ کے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا کہہ رہی تھی نیناں......؟'' عارفہ نے واپس آ کر پوچھا۔

''باپ سے متنفر ہوگئی ہے، وہاں جانا نہیں چاہتی۔'' رابعہ نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

''اچھی طرح سے سوچ لو۔'' عارفہ فکرمندی سے بولیں۔

''یہ تو طے ہے کہ ریحان کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔'' رابعہ بیزار سی ہوگئیں...... ان کا انداز تو دیکھ کر عارفہ نے اس وقت خاموش رہنے میں بہتری جانی...... انہیں پیار سے تھپکی دے کر ڈھیر سارا حوصلہ دیا اور ایک بار پھر وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں تو رابعہ نے تھکے ذہن کو سکون دینے کے لیے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆......☆☆☆

''آہا! اُف توبہ، میرے اللہ!'' آنکھ اِک دلخراش آہ کے ساتھ کھلی تو زبان سے یہ جملہ نکلا...... بوا نے جھٹ محبت سے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''نیناں نے اچھا نہیں کیا، مجھ سے پوچھا بھی نہیں، میرے لیے جل کر مرنے کا اہتمام کیا، بوا اس نے اچھا نہیں کیا۔'' بوا کو محسوس ہوگیا کہ وہ ہر لحاظ سے کمزور ہو گئے ہیں۔ لب کچلتے ہوئے جو یاسیت اور دکھ اُن کے چہرے پر تھا وہ آج سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔

''اسی لیے آگ سے دور رہنے کو ہم نے کہا تھا، اس لڑکی نے ہمارے سامنے تم پر تھوک پھینکا تھا مگر جانے پھر بھی تمہیں نہ غصہ آیا نہ دکھ ہوا۔'' بوا نے ماضی میں جھانک کر انہیں بھی احساس دلایا۔

''عشق جو ہو گیا تھا، سچ پوچھیں تو اس کے غصے اور نفرت سے ہی عشق بڑھتا گیا مگر......'' بولتے بولتے وہ چپ ہو گئے۔

”تم نے خالی کمرے میں رابعہ کی کمی محسوس نہیں کی، نیناں کو یاد نہیں کیا؟“ بوا نے ان کا دھیان بانٹا تو وہ کربناک سے انداز میں مسکرا دیے۔

”رابعہ رات بھر کمرے میں نہیں آئی، اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔“ اُن کے لہجے میں موجود نارسائی کا دکھ بڑا یقینی سا تھا۔ گویا وہ جان کر تسلیم کر چکے تھے کہ رابعہ اپنے گھر جا چکی ہیں۔

”رابعہ کا یہی گھر ہے، اسے تم نے یاد دلانا ہے۔“

”وہ بھی ضدی ہے، نیناں کی طرح......“ وہ شکست خوردہ سے ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔

”نیناں کو بھول جاؤ اس کا ذکر بھی رابعہ کے سامنے نہیں کرنا، اپنی بیٹی نیناں کو ماں سے دور نہ کرو۔“ بوا نے سختی سے تنبیہہ اور تاکید کی۔

”مگر رابعہ کبھی فیصلہ نہیں بدلے گی۔“

”وہ تم سے محبت کرتی ہے تم نے بڑی زیادتی کی پھر بھی اسے تم منا سکتے ہو، لا سکتے ہو۔“ بوا حوصلہ ہی دے سکتی تھیں وہ اداس نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تبھی انہوں نے یاد دلایا۔

”آج رابعہ کی دادی کا چہلم ہے، ہمت پکڑ و جاؤ، اس کا بھی بہت اثر ہوگا۔“

”اچھا، پہلے ڈاکٹر سے ملنا ہے۔“ انہوں نے رضامندی ظاہر کی۔ بوا خوش ہو گئیں۔

”میں ناشتا بنواتی ہوں اٹھو شاباش۔“ بوا نے اٹھتے ہوئے کہا، عین اسی لمحے فیضو نے دو خواتین کے آنے کی اطلاع دی۔

”کون ہیں......؟“ بوا نے فیضو کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں بس کہہ رہی ہیں کہ بوا کو یا پھر بڑے صاحب کو بلا دو۔“ فیضو نے کہا اور کچن میں گھس گیا۔ بوا نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا لیکن پھر وہ فیضو کے پاس آئیں چائے لانے کو کہا...... ان کا اندازہ تھا کہ رابعہ سے ملنے آئی ہوں گی۔

ڈرائنگ روم کا بھاری سا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئیں تو دو خواتین کو صوفے پر سمٹے بیٹھا دیکھ کر اجنبی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

”وعلیکم السلام......“

”جی آپ کو شاید رابعہ سے ملنا ہے؟“ بوا نے متانت سے پوچھا۔

”نہیں، صرف آپ سے ملنا ہے، راجا ریحان اختر سے ملنا ہے۔“ سفید چادر میں لپٹی آپا نے سنجیدگی سے کہا۔

”ریحان کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ کو کوئی مدد چاہیے تو......“ بوا نے اُن کے ظاہری سادہ سے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم کوئی چندہ مانگنے نہیں آئے، آپ نے غور سے دیکھا نہیں، مجھ سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔“ آپا نے چبھتے ہوئے الفاظ جمع کیے تو بوا ٹھٹکیں۔

”بیٹا آپ کی اور میری بینائی میں بہت فرق ہے، آپ بتا دیں۔“

”بوا! راجا صاحب کی ایک بیٹی تھی وسیمہ، اس کی سہیلی عزیز سہیلی زینت تو آپ کو یاد ہوگی؟“

”ہا، ہا، ہاں، مگر......“ حیرت و بدحواسی میں وہ کچھ اور نہ بول سکیں۔

”اس گھر کی طرف میرا کچھ حساب نکلتا ہے یہ تو جانتی ہیں آپ......؟“ آپا نے تحمل سے جملہ مکمل کیا۔

”کیسا حساب؟ وہ تو دنیا میں ہی نہ رہے۔“

”جانتی ہوں، ایمانداری سے بتاؤ یہ طلال کون ہے؟“

”زینت! یہ وسیمہ کا بیٹا ہے۔“ وہ دھیرے سے کہہ گئیں۔

”تو پھر میرا بچہ کہاں ہے؟“ آپا کا گلا رندھ گیا۔

”وہ مجھے نہیں معلوم......“ وہ مکر گئیں۔

”تو بلائیں راجا ریحان اختر کو...... انہیں تو معلوم ہوگا۔“ زینت چلائیں۔

”جب شوہر بچہ لے کر بھاگا تھا تب کیوں لے جانے دیا تھا۔“ ایک دم ہی ریحان اختر نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے سختی سے کہا۔

”اسے تو میری عزیز سہیلی نے دامِ الفت میں پھانس لیا تھا، سہیلی کا شوہر چھین لیا، بچہ چھین لیا......“ آپا کو غصہ آ گیا۔

”بہت زمانے ہو گئے اس بات کو۔“ بوا نے مداخلت کی۔

”مگر اس گھر سے زخم ملنے کا سلسلہ جاری ہے۔“ آپا بولیں۔

”کیا مطلب......؟“

”طلال آپ کا بھانجا میری بھتیجی مدیحہ کے پیچھے پڑا ہے، مدیحہ، نیناں کی سہیلی ہے۔“

”کیا......؟“ ریحان اختر کو حیرت نے چھوا۔

”ہم طلال کو سمجھا دیں گے۔“ بوا نے جواب دیا۔

”اور میرا بیٹا......“ آپا چلائیں۔

”اس ممتا کی ماری پر رحم کرو، ساری زندگی بیوہ بن کر گزاری ہے، بیٹے کے لیے تڑپ رہی ہے۔“ اکبری بیگم نے جذباتی ہو کر کہا تو ریحان اختر مزید وہاں نہیں ٹھہر سکے۔ شدید غصے میں وہاں سے چلے گئے۔

”بہت افسوس ہے، وسیمہ نے اچھا نہیں کیا تھا۔ ہماری بی بی کو بھی اس بات کا رنج تھا۔“

”مجھے صرف اپنے بیٹے کا انتظار ہے، اس کے بارے میں آپ دونوں ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔“

”ریحان کو حقیقت معلوم نہیں ہے۔“ بوا فقط اتنا بولیں۔

”تو آپ کو تو معلوم ہے، آپ تو ہر راز سے واقف ہیں۔ کیا، کیا نہ ستم کرایا وسیمہ نے مجھ پر اپنی دولت سے خریدا بھی تو غریب سہیلی کے سہاگ کو۔“ آپا باقاعدہ رونے لگیں۔

”وسیمہ کے ساتھ تمہارا شوہر بھی قصوروار تھا، دولت کی چمک نے اس کو اندھا کر دیا تھا۔“ بوا بولیں۔

”مگر کیا سہیلی اس کو کہتے ہیں؟ میرے اعتبار کو چکنا چور کر دیا اور میرا معصوم بچہ...... یہ طلال واقعی وسیمہ کا بیٹا ہے۔“

''ہاں، وہ میں ریحان سے کہہ کر اس کے کان کھنچواتی ہوں آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔'' بوا نے جلدی جلدی کپڑے کے تھان کے مانند ساری بات لپیٹی اسی اثنا میں فیضو چائے لے آیا مگران دونوں نے معذرت کی اور بنا چائے پیے چلی گئیں۔ بوا اضطرابی کیفیت میں ریحان اختر کے کمرے کی طرف چل دیں لیکن وہ فون پر غم و غصے کے ساتھ بات کر رہے تھے۔

☆☆☆......☆☆☆

تین آدمی اور تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش...... اکبری بیگم آپا کے غم پر چپ چاپ سبزی کاٹ رہی تھیں...... آپا تخت پر لیٹی برآمدے کی چھت گھور رہی تھیں، کھویا ہوا احساس درد کے ساتھ ان کے سارے وجود پر طاری تھا۔ اب تک جس پردے میں صدمے چھپا رکھے تھے وہ بھی تار تار ہوگیا تھا...... بیٹا ملنے کی سب امیدیں دم توڑ گئیں۔ پہلے بھی وہ یہ حقیقت قبول کر چکی تھیں کہ وہ دونوں مر چکے ہیں ساتھ میں بچہ بھی مر گیا ہوگا...... مگر جب سے طلال کا ذکر سنا تھا تب سے یہ خواہش اندر ہی اندر بے کل کر رہی تھی کہ یہ کس کا بیٹا ہے؟ لیکن بوا کے صاف انکار سے تو یہ واضح ہوگیا تھا کہ ان کا بیٹا نہ جانے کہاں گیا؟ حادثے کا شکار ہوگیا یا بچھڑ گیا...... مدیحہ نے کمرے کی کھڑکی سے ان کی ویران آنکھوں سے بہتے اشک دیکھے تو رہا نہ گیا باہر آ کر ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔

''اگر میری ذرا سی بھی عزت ہے تمہارے دل میں تو راجا خاندان کے کسی فرد سے کبھی نہیں ملنا۔'' وہ گلوگیر لہجے میں فقط اتنا بولیں۔

''کیا، کیا ہوا آپا، آپ دونوں جب سے آئی ہیں اس قدر خاموش کیوں ہیں؟''

''صرف خاموش ہیں، مر نہیں گئے۔''

''بات کیا ہے؟'' وہ فکرمند ہوگئی۔

''طلال، وسیمہ کا بیٹا ہے، اس سہیلی کا بیٹا جس نے میرا گھر برباد کیا۔ طلاق کے کاغذات بھجوائے اور وہ سفاک میرا بیٹا چھین لے گیا...... اس کے بیٹے سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''یہ تو میں نے بتایا تھا کہ طلال نیناں کی پھپو کا بیٹا ہے۔'' مدیحہ نے کلیئر کرنا چاہا۔

''کاش وہ اس کا بیٹا نہ ہوتا۔'' اکبری بیگم صحن میں سے تار پر سوکھے دسترخوان اتارنے آئیں تو اس کی بات سن کر طنزیہ بولیں۔

''آپ دونوں نیناں کے گھر گئی تھیں......؟'' وہ پریشان ہوگئی۔

''ہاں! اور اب کسی نیناں کا اس گھر میں ذکر نہیں ہو، نیناں کی پھپو نے تمہاری آپا کا گھر اجاڑا ہے سمجھیں تم......'' اکبری بیگم نے زور سے کہا تو وہ سناٹے میں آ گئی...... سب خواب بکھرتے ہوئے دکھائی دیے۔ ایک دکھ اور نفرت کا سا احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

''آپا! آپ غمزدہ نہ ہوں، میں اب کبھی طلال سے نہیں ملوں گی، نیناں سے بھی نہیں۔'' وہ شدتِ غم سے تڑپ کر ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

''تمہیں یقین ہے کہ طلال، وسیمہ کا ہی بیٹا ہے۔'' ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق آپا نے بھی پُرامید نگاہوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

''ہاں! وہ نیناں کی پھپو کا بیٹا ہے۔'' مدیحہ نے کہا تو وہ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

''آپا! آپ تو میری اچھی آپا ہیں، آپ تو حوصلہ دیتی ہیں، بھول جائیں سب کچھ۔'' مدیحہ نے پیار سے ان کے بال سنوارے تو وہ ضبط نہ کرسکیں پھوٹ پھوٹ کر رودیں۔ مدیحہ کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہوگیا...... اس کی آواز پر اکبری بیگم دوڑی آئیں...... عین اسی وقت زلفی کھانا لے کر آگیا، آپا کو روتے دیکھ کر اس کے بھی حواس جاتے رہے۔

''کیا، کیا ہوا ہے......؟''

''کچھ نہیں بس ویسے ہی......'' آپا نے ہتھیلی سے رگڑ کر جلدی سے آنکھیں صاف کیں اس سے چھپانا ضروری تھا۔

''کچھ تو ہے۔'' وہ اڑ گیا۔

''ارے کچھ نہیں، ہمارا خیال تھا کہ راجا ریحان کے گھر سے آپا کے بیٹے کا اتا پتا چل جائے گا مگر بوا کے بقول انہیں کچھ علم نہیں۔'' اماں نے ٹالنے کے سے انداز میں کہا۔

''اور وہ ریحان صاحب کا بھانجا......؟''

''وہ وسیمہ کا بیٹا ہے۔'' اماں نے دھیرے سے جواب دیا۔

''خیر! آپ لوگوں کو وہاں جانے کی ضرورت کیا تھی، یہ حساب تو مجھے خود لینا ہے۔'' وہ سختی سے بولا۔

''وہ، وہ بس ویسے ہی......'' اماں اور آپا کی زبان لڑکھڑا گئی، مدیحہ کنی کترا کر باہر نکل گئی...... اصل بات زلفی کو بتانا مناسب نہیں تھا۔

''آپ فکر نہ کریں ایک بار میں ملوں گا ضرور راجا صاحب سے۔'' وہ گہری سوچ میں غلطاں بڑی گہرائی سے بولا۔

''اچھا، تم چلو ہاتھ دھولو میں کھانا نکالتی ہوں۔'' اماں نے اس کا موڈ بدلنے کی خاطر کہا اور باورچی خانے کا رخ کیا۔

☆☆☆......☆☆☆

رمان کی ڈیوٹی لگائی تھی عارفہ نے کہ قرآن خوانی شروع ہونے سے پہلے طاہرہ پھپو اور دعا کو لے کر آنا ہے۔ لہٰذا وہ بڑی مصروفیت میں سے وقت نکال کر پہنچا...... گو کہ اس کے دفتر کے ایک دو ساتھی مدد کے لیے موجود تھے اور پھر سبحان بھی بڑھ چڑھ کر مردانہ حصے میں مصروف تھے۔ اس کا موڈ آف ہوا لیکن ٹال گیا۔ البتہ طاہرہ پھپو نے دعا کو گھور کر اشارہ کیا۔

''اماں، وہاں میرا کیا کام ہے؟''

''ہاں، بہت کام ہے تمہارا دیگیں پکانی ہیں تم نے۔'' رمان نے جل کر کہا۔

''دیکھا آپ نے کیسے بات کی ہے۔'' دعا نے ماں کی طرف دیکھ کر شکوہ کیا۔

''ٹھیک کہا ہے اس نے۔'' طاہرہ پھپو بولیں۔

''مجھے کہیں نہیں جانا، ویسے بھی نیناں وہاں موجود ہے۔'' دعا نے تڑخ کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی، رمان جل بھن سا گیا پیچھے پہنچا اور اس کی لمبی چوٹی پکڑ کر بولا۔

''اپنے دماغ کی کھڑکیاں اب تو کھول لو، تازہ ہوا آئے، بند دماغ سے بساند آتی ہے۔''

''میرا دماغ ہے، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے بل کھا کر اپنی لمبی چوٹی آزاد کرائی۔

''دعا! فراخدلی کا مظاہرہ کرو، اب تو یہ رویہ چھوڑ دو۔'' وہ نرم پڑ گیا۔

''کیا ہے مظاہرہ فراخدلی کا، تمہیں بخش دیا ہے اس امیر زادی کے لیے جو دولت کے باعث تمہیں خرید سکتی ہے۔'' وہ طنزیہ بولی۔

''شٹ اپ! کیا میں تمہیں بکنے والا لگتا ہوں۔'' وہ چلایا تو وہ چپ ہوگئی۔

''دکھ ہے دعا تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔'' وہ رنجیدہ ہوگیا تو وہ نادم سی ہوگئی۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔''

''ایسے نہیں سوچتے، خدا گواہ ہے وہ تو کبھی دولت درمیان میں لائی ہی نہیں۔''

''سوری!''

''پلیز آج یہیں سب حاسدانہ جذبے دفن کردو۔''

''اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔''

''ویسے بھی اب تم انگیجڈ ہو، یہ فیصلہ قبول کرو۔'' وہ جتلا کر چلا گیا تو اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر آنکھوں کی نمی صاف کی اور اپنی ضدی طبیعت کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر الماری سے سفید کُرتہ شلوار نکال کر غسل خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد چینج کر کے باہر آئی شیشے کے سامنے کھڑے ہوتے ہی زبان پر شکوے مچل اٹھے۔

''رمان! تمہیں بھی تو خبر ہوگی کہ دریا کے پاس بیٹھے ہوں تو پانی اچھا لگتا ہے، کناروں سے جڑی مٹی سے پوچھو روگ چاہت کا کیا ہوتا ہے، اس پانی کی چاہت میں کناروں سے اکھڑ کے اجنبی دیسوں میں جانا کتنا مشکل ہے......؟ تم نے انگیجڈ سمجھ لیا۔'' کتنے ہی یاسیت زدہ لمحے دبے قدموں گزر گئے اور شاید مزید گزر جاتے کہ طاہرہ بیگم کی آواز نے چونکا دیا...... وہ بلا رہی تھیں۔

''دعا! دعا! جلدی آؤ، دیر ہو رہی ہے۔''

''آتی ہوں......'' اس نے بلند آواز میں جواب دیا اور جلدی سے چپل تبدیل کر کے باہر نکل آئی۔

☆☆☆......☆☆☆

وہ ڈرائیور کے فرنٹ ڈور کھولتے ہی بیٹھنے والے تھے کہ طلال کی گاڑی اندر داخل ہوئی...... تو وہ غصے میں کچھ سوچ کر برآمدے تک آگئے۔ جونہی گاڑی سے اتر کر وہ قریب آیا تو وہ برس پڑے۔

''شرم نہیں آتی کسی کی بیٹی پر نظر رکھتے ہو۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ......؟'' پہلی بار شاید اس قدر غصے میں اس نے انہیں دیکھا تھا۔

''نیناں کی سہیلی کی......'' دانت کچکچائے۔

''اوہ! تو کیا کروں، نیناں نظر ڈالنے نہیں دیتی، کسی پر تو نظر ڈالنی ہے۔'' اس نے تمسخر اڑایا تو انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا۔

''نیناں کا نام بھی زبان پر مت لانا۔''

''کیوں، کیا خرابی ہے مجھ میں، آپ کی بہن کا بیٹا ہوں، آپ کی طرح کسی اور کے عشق میں گرفتار نہیں ہوں، مدیحہ تو عارضی کیس ہے۔'' وہ جانے کیا سے کیا کہتا چلا گیا۔

''کیا بکواس کی تم نے......؟'' ریحان اختر کا ہاتھ اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ آواز سن کر فیضو اور بوا باہر آگئے۔

''ماموں! بس اب اور کچھ میں برداشت نہیں کروں گا، سچ کی کڑواہٹ نے آپ کو پاگل کر دیا ہے...... میں سب جانتا ہوں کہ مامی کیوں اپنے گھر ہیں، یہ ہاتھوں پر زخم کیسے آئے ہیں؟ ارے اس دلشاد نے صرف پانچ ہزار لے کر سب کچھ بتا دیا تھا...... آپ کی بیٹی سے کون شادی کرے گا؟ رمان کو پتا چل گیا تو نیناں پر تھوک دے گا۔'' وہ خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے گال سہلاتے ہوئے بولتا گیا...... ریحان اختر کی حالت متغیر ہوگئی، چہرہ عرق عرق ہوگیا، خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا، دیوار نہ تھامتے تو چکرا کر گر جاتے...... بوا نے بڑھ کر سہارا دیا۔

''طلال کچھ تو حیا کرو، اس ماموں نے اولاد کی طرح پالا ہے۔'' بوا نے بھی خاصے غصے سے کہا۔

''پالا ہے، سمجھا تو نہیں، میں ان کی بیٹی کے لائق نہیں۔'' وہ طنزیہ بولا۔

''کیوں، کیوں نام لاتے ہو میری بیٹی کا......؟'' وہ آپے سے باہر ہوگئے۔

''ریحان! تم اپنے کمرے میں چلو، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' بوا نے جلدی سے انہیں اندر لے جانے کی کوشش کی تو وہ زخمی شیر کے مانند غراتے ہوئے اندر چلے گئے کیونکہ سچ مچ طبیعت خاصی خراب ہوگئی تھی، ڈرائیور نے گاڑی لاک کی اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

بوا ریحان اختر کے ساتھ کمرے میں آئیں ان کی حالت فکر مندی کی حد تک خراب لگ رہی تھی...... انہوں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور انہیں لٹا کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ طمانیت بھری مسکراہٹ اور ممنونیت بھری نگاہوں سے انہوں نے ان کے ماں جیسے شفیق چہرے کو دیکھا، احساسِ ندامت سے آنسو آگئے۔

''نہیں، راجا ریحان اختر اتنا کمزور نہیں۔'' انہوں نے ان کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''افسوس! میں رابعہ کے گھر نہیں جاسکا، وہ بدگمان ہوگی۔'' انہیں ایک دم ہی یاد آگیا۔

''کوئی بات نہیں، بدگمانی کی گرد چھٹ جائے گی تم ذہن پر بوجھ نہ ڈالو''

''طلال کو دیکھا، یہ دو ٹکے کا گندا خون بول رہا تھا، وسیمہ آپا نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ ایک بار پھر کھول اٹھے۔

''اچھا بس، اب خاموش ہو جاؤ، طلال اور وسیمہ کا تعلق ہی کیا ہے؟'' انہوں نے دھیرے سے کہا مگر ریحان اختر کو زوردار جھٹکا سا لگا۔

''کیا مطلب......؟''

''ڈاکٹر صاحب چیک کرلیں تو باتیں کریں گے۔'' وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال کر باہر آئیں، ڈاکٹر صاحب آچکے تھے وہ انہیں ساتھ لے کر ریحان اختر کے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆......☆☆☆

قرآنی خوانی کے بعد کھانا کھلایا گیا...... باہر لان میں مرد حضرات کھانے میں مصروف تھے اور اندر ہال کمرے میں ٹی وی لاؤنج میں خواتین کے لیے کھانا لگایا گیا تھا...... رابعہ نے خواتین کے درمیان سے اٹھ کر ذرا دیر کو اپنے کمرے کا رخ کیا کیونکہ نیناں کمرے میں تھی، اسے چپ سی لگی تھی۔

''نیناں! اٹھو کچھ کھالو۔'' رابعہ نے کمرے کی ٹیوب لائٹ آن کی تو وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی...... بے ترتیب بال، ملگجے سے لباس میں بے حد ڈسٹرب سی لگی۔ رابعہ جانتی تھیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟

''مما! بھوک نہیں ہے۔''

''بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن آپ کے ساتھ کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' رابعہ نے بات بنائی۔

''مما! بابا......'' ایک لمبا وقفہ آیا۔

''نہیں آئے......''

''بوا کا فون آیا تھا......'' نیناں نے بتایا۔

''اچھا......''

''بابا کی طبیعت خراب ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، وہ آرہے تھے مگر......''

''کوئی بات نہیں، کون سا ضروری تھا؟'' رابعہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔

''مما! میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی......'' یکدم نیناں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''نہیں، آپ کے بابا کی طبیعت خراب ہے تو آپ کو جانا چاہیے۔'' رابعہ نے دانستہ کہا تاکہ بیٹی کا ذہن کچھ منفی نہ سوچے۔

''تب بھی نہیں۔''

''وہ خود لینے آجائیں گے پھر؟''

''پھر بھی نہیں۔''

''اچھا، دیکھا جائے گا۔'' رابعہ بولیں۔

''کیا دیکھا جائے گا؟'' عارفہ مہمان خواتین کو رخصت کر کے وہیں آگئیں۔

''نیناں بابا کے پاس جانا نہیں چاہتی۔'' رابعہ نے بتایا۔

''بری بات، بڑوں کی باتیں بڑے جانیں، آپ تو اُن کی لاڈلی بیٹی ہو۔''

جس کا نام انہوں نے اپنی محبوبہ کے نام پر رکھا۔'' نیناں طنزیہ ہنس دی۔

''اوہ ہو! ایسی باتیں بیٹیاں نہیں کرتیں، معاف کر دو بابا کو۔'' عارفہ نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

''بڑی خالہ۔'' وہ ٹھنکی۔

''میرا بچہ بہت سمجھدار ہے۔'' عارفہ نے بہت دلار سے چمکارا تو وہ جزبز سی ہوگئی۔

''رابی خالہ، رابی خالہ!'' رمان آوازیں لگاتا آگیا۔

''کیا بات ہے؟''

''یہ دیکھیں، آپ سے ملنے کون آیا ہے؟'' رمان یہ کہہ کر دروازے سے ایک طرف ہوگیا تو بڑے ابا اور سبحان کمرے میں داخل ہوگئے...... عارفہ اور رابعہ احتراماً کھڑی ہوگئیں۔

''آئیں، بیٹھیں پلیز!''

''بس رابعہ بیٹی تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔'' بڑے ابا نے شفقت سے رابعہ کے سر پر ہاتھ پھیرا......

رمان نے نیناں کی جانب دیکھ کر دائیں آنکھ دبائی اور دونوں کمرے سے چلے گئے۔

"ارے بیٹھیں تو سہی" رابعہ اور عارفہ نے ایک ساتھ کہا تو وہ دونوں ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھ گئے۔

"رابعہ بیٹی! یہ تمہارا کمال ہے کہ یہ نالائق شادی کے لیے راضی ہو گیا۔" بڑے ابا کی خوشی دیدنی تھی البتہ سبحان صرف سنجیدہ سے تھے۔

"اس میں کمال کی کیا بات ہے؟"

"نہیں نہیں، یہ تو سب کچھ بیچ باچ کر جا رہا تھا، تمہارے کہنے پر شادی کر رہا ہے، اب اکیلا جائے گا اور سب کچھ سمیٹ کر استعفیٰ دے کر آ جائے گا۔"

"اچھا، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" عارفہ بولیں۔

"ہاں! بہت مبارک ہو۔"

"اب آنے والے جمعے کو نکاح ہے اور ہفتے کو ولیمہ۔" بڑے ابا نے تفصیل پیش کی۔

"ماشاءاللہ! اللہ مبارک کرے۔" عارفہ نے دعا دی۔

"شکریہ......" پہلی بار سبحان بولے تو عارفہ کو ان کے لہجے پر چھائی کہر صاف نظر آئی مگر وہ یکسر نظریں چرا گئیں۔

"آپ سب نے آنا ہے بلکہ دو دن پہلے آنا ہے، سارا انتظام آپ لوگوں نے کرانا ہے۔" بڑے ابا نے کہا تو عارفہ نے بخوشی اثبات میں گردن ہلا دی۔

"سن لیا رابعہ بیٹی......" وہ براہ راست بولے۔

"جی کوشش کروں گی مگر ریحان علیل ہیں، دیکھیں کیا بنتا ہے۔"

"اللہ خیر کرے، ہم انہیں بھی مدعو کرنے آ جائیں گے، جلدی میں کارڈ تو چھپے نہیں پھر سادہ سی تقریب ہوگی۔"

"سادگی اچھی چیز ہے......" عارفہ نے سراہا۔

"رابعہ! ریحان کے پاس جاؤ......" سبحان نے کچھ سوچ کر اچانک کہا تو رابعہ پہلو بدل کے رہ گئیں...... سبحان نے اصل بات سمجھ کر مشورہ دیا تھا۔

"ہاں بیٹا! اب تو مہمان گئے فوراً چلی جاؤ......" بڑے ابا نے یہ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے...... ان کے جانے کے بعد وہ گم صم سی بستر پر دراز ہو گئیں...... زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا...... ستم گر خود ستم کا شکار ہو کر بے بس ہو گیا تھا...... بیٹی اس سے ہی متنفر ہو گئی تھی۔

"کاش! ریحان تم اس وقت کا پہلے سوچ لیتے...... میں اب کیا کروں؟" بے بس سوچ سر پٹخ کر ان کے کانوں تک ہی رہ گئی۔

☆☆☆......☆☆☆

گلو سے کافی کا کہہ کر وہ کچن سے نکل رہی تھی کہ دعا آ گئی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کچن میں کیا کر رہی تھیں؟" دعا نے پوچھا۔

"کافی پینے کو دل چاہ رہا تھا......" نیناں نے بتایا۔

"تو پھر مل کر پیتے ہیں بلکہ خود بناتے ہیں۔" دعا کو وہ سنجیدہ سی لگ رہی تھی اس کے چہرے پر بشاشت

نہیں تھی اس لیے دانستہ وہ اس کے پاس آئی تھی۔

"ہاں! گڈ آئیڈیا، کم آن......" نیناں نے خوش دلی سے آفر قبول کی۔

"میں بہت اچھی کافی بناتی ہوں۔" دعا نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو اس نے فوراً گلو کے ہاتھ سے کافی کا جار لے کر دعا کو تھما دیا...... اور خود اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"نیناں! کیا بات ہے؟" فریج سے دودھ کا جگ نکالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں، کیوں......؟"

"خاموش اور اداس ہو۔"

"کچھ خاص نہیں بس نامعلوم سی اداسی ہے، تم سناؤ کیسے ہیں وہ موصوف......؟" نیناں نے ٹالنے کی غرض سے موضوع بدل دیا۔

"نہیں معلوم......" وہ بجھ سی گئی۔ نیناں نے صاف محسوس کیا۔

"دعا کیا تم خوش ہو؟"

"شاید نہیں یا شاید ہاں......"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"چھوڑو میں نے سمجھوتا کر لیا ہے ویسے دوبارہ اب تک وہ لوگ نہیں آئے، جانے آتے بھی ہیں کہ نہیں۔"

"انشاءاللہ ضرور آئیں گے۔"

"تم اداس کیوں ہو؟" دعا کے اندر جانے کیا شبہ تھا کہ سوئی ایک ہی مقام پر اٹکی تھی۔

"پتا نہیں۔" وہ اس کو مہارت سے کافی پھینٹتا دیکھ کر بولی۔

"رمان تو تمہیں بہت چاہتا ہے۔" ذو معنی جملہ دعا کے لبوں سے نکل گیا۔

"رمان کہاں سے درمیان میں آ گیا۔" اپنے کافی کے مگ کو اٹھاتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔

"رمان تو ہے ہی تمہاری زندگی کا حصہ، غلط کہہ رہی ہوں کیا؟" وہ برابر آ بیٹھی۔

"نہیں ٹھیک کہہ رہی ہو مگر زندگی ہے کہاں؟ کیا ہوگا یہ معلوم نہیں۔" ایک طویل سرد سانس بھاپ اڑاتے مگ میں ڈوب گئی۔

"مطلب......؟"

"بس چھوڑو، میری الجھنوں میں نہ الجھو، آج یہیں رہ جاؤ۔" ایک دم ہی اس نے فرمائش کی۔

"نہیں، اماں کے گھٹنوں میں درد زیادہ ہے مشکل ہوگی۔"

"او کے!"

"نیناں! نیناں! چلو تمہیں گھر چھوڑنا ہے۔" رمان گاڑی کی چابی گھماتا وہیں آ گیا۔

"کیوں؟"

"رابی خالہ نے اور امی نے کہا ہے۔"

"مگر مجھے نہیں جانا......" وہ بیزاری سے بولی۔

"کم آن یار! اتنی سنگدل نہ بنو، تمہارے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" رمان نے کہا۔

"میری وجہ سے نہیں ہے، میری مما کی وجہ سے نہیں ہے۔"

"بی ہیو پلیز!" رمان نے آہستہ آواز میں منع کیا کیونکہ وہ یہ بات دعا کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ بابا سے خفا کیوں ہے۔

"مجھے اجازت دو۔" دعا خود سمجھدار تھی جلدی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

"رمان پلیز! مجھے مجبور نہ کرو۔"

"نیناں یہ موقع نہیں ہے، ریحان انکل کو غلطی کا احساس ضرور ہے۔" وہ دعا والی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"ابھی میرے نمبر پر فون کیا ہے انہوں نے اور ریکویسٹ کی ہے۔"

"اس میں احساس کی کیا بات ہے، میرا نام بھول کر لے گئے ہوں گے۔"

"سمجھا کرو، وہ ڈسٹرب ہیں، تمہیں مس کر رہے ہیں، میں رابی خالہ کو بھی سمجھا کر آیا ہوں۔"

"تو وہ راضی ہیں؟"

"کافی حد تک لیکن وہ صبح آئیں گی۔"

"وہ جب مرضی جائیں مگر مجھے نہیں جانا۔" وہ تلملا کر کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ وہ روکتا ہی رہ گیا مگر وہ رکی نہیں۔

☆☆☆......☆☆☆

آپا کو ہلکا سا بخار تھا، جسم میں درد اور نقاہت سی تھی اس لیے آج سارا دن وہ بستر پر رہیں۔ تاہم اکبری بیگم کو یہ بھی احساس تھا کہ جب سے وہ راجا ہاؤس سے ہو کر آئی ہیں بہت مضطرب ہیں، کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے بیٹے کی یاد کے زخم تازہ محسوس کر رہی تھیں شاید۔ آنکھوں کے گوشے نم تھے۔

"آپا! کیوں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی ہو؟" گرم دودھ کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے اکبری بیگم نے کہا تو انہوں نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

"جانے کیوں مجھے اپنے حسن کی یاد شدت سے آ رہی ہے۔" وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولیں۔

"آپ کو تو صبر آ جانا چاہیے، زمانے بہت بیت گئے ہیں۔"

"مگر جب سے وہاں سے آئے ہیں سب کچھ تازہ ہو گیا ہے۔"

"بھول جائیں، مدیحہ چپ چپ تھی، میں نے اسے بھی سمجھا دیا ہے کہ بھول جائے چند دن کی شناسائی کو۔"

"اکبری، طلال کون ہے؟" انہوں نے یکدم بیتاب ہو کر پوچھا۔

"اس بڑھیا کے کہنے کے مطابق راجا صاحب کا نواسہ......" کچھ غم و غصے کے ساتھ اکبری بیگم نے جواب دیا۔

"مگر کیسے؟ اور میرا احسن کہاں گیا؟"

"وہ کہہ تو رہی تھیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔"

"اللہ کرے کہ وہ سلامت ہو۔" ان کے پھڑ پھڑاتے لبوں نے دعا مانگی...... اکبری بیگم ان کی ذہنی حالت جانتی تھیں جلدی سے سہارا دے کر بٹھایا اور دودھ کا گلاس ہونٹوں سے لگایا مگر انہوں نے سخت بیزاری سے پرے کر دیا۔

"رہنے دو...... کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔"

"آپا! نئے سرے سے زخم مت چھیلو، ہمیشہ صبر سے کام لیا ہے۔" اکبری بیگم نے دودھ کا گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ میرا بچہ زندہ ہے، طلال ہی ہے۔" وہ مصر تھیں۔

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ پرایا بچہ کیوں رکھتے؟ اتنا پڑھایا لکھایا ٹھاٹھ باٹ سے رکھا۔ بھلا کیوں رکھتے؟ پھر ویسے بھی بھائی صاحب اپنا بیٹا انہیں کیوں دے کر جاتے؟" اکبری بیگم نے کافی تفصیل کے ساتھ تاویل پیش کی لیکن آپا کا دل کچھ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"شاید انہیں بھی یہی پتا ہو، بچہ وسیمہ نے اپنا کہہ کر بھیجا ہو۔"

"کیوں؟ وہ کیوں پرائی اولاد کو اپنا کہے گی، اس نے اتنی بے حسی اور خود غرضی کا مظاہرہ کیا اور آپ کو وہ اتنی عظیم لگ رہی ہے۔"

"اس میں میرا اپنا شوہر مجرم ہے، اس نے مجھے دھوکا دیا، وہ وسیمہ سے اتنا بے تکلف ہوتا گیا کہ دونوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" آپا ماضی کے کربناک لمحات میں کھو سی گئیں۔

"بس آپ کی سادہ طبیعت کی وجہ سے ایسا ہوا۔"

"میرا احسن مجھے مل جائے بس۔" وہ رو دیں۔

"خدا کرے، آپ بے فکر ہو جائیں، اللہ بہتری ضرور کرے گا۔"

"ایک بار، ایک بار پھر چلیں۔"

"وہاں...... نہیں، اچھا نہیں لگتا، زلفی نے کہا تو ہے کہ وہ ملے گا۔" اکبری بیگم نے تسلی دی۔

"مدیحہ، مدیحہ کہاں ہے؟" وہ یکلخت مدیحہ کو پکارنے لگیں...... اکبری بیگم نے مدیحہ کو آواز دے کر بلایا...... وہ آئی تو اس سے پوچھنے لگیں۔

"مدیحہ! تم نے کبھی نیناں سے نہیں سنا کہ طلال کسی اور کا بیٹا ہے؟"

"کیا مطلب؟ وہ کیوں کہتی، ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اس کی پھپو کا بیٹا ہے۔"

"اور...... اور کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔"

"نہیں، آپا نیناں اکلوتی ہے، طلال بھی ایک ہیں...... آپ کیوں بار بار ان کا ذکر کر رہی ہیں......؟" مدیحہ کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی سی تھی وہ روکھی روکھی سی ہو گئی تھی۔

"ہاں! مدیحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" اکبری بیگم نے بیٹی کی تائید کی۔

"اچھا بس چپ ہو جاؤ، بالکل چپ......" آپا کو ہلکا سا غصہ آ گیا... وہ کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔

☆☆☆......☆☆☆

انہوں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ سنہری چمکدار سورج کی کرنیں ابتدائی حالت میں تھیں...... لان کے دائیں طرف اور کچھ ان کے کمرے کی سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھیں...... لان میں مالی پھولوں، پودوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ ان کا دل چاہا کہ ہلکی ہلکی دھوپ میں ہلکی ہلکی سردی کا مزہ اٹھانے کے لیے باہر جائیں مگر ڈاکٹر کی ہدایت اور بوا کی تاکید کے باعث وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ ہائی بلڈ پریشر اور معمولی سے ہارٹ پرابلم کا ڈاکٹر نے کہا تھا...... یہ سن کر وہ خود کو بہت تھکا تھکا اور مضطرب سا محسوس کررہے تھے...... نیناں کے نہ آنے کا ملال سا تھا...... رابعہ کی بددلی کا دکھ تھا...... طلال کی بدتہذیبی کا صدمہ تھا...... کھڑکی سے باہر کا منظر اچھا لگ رہا تھا...... اسی لمحے ہارن بجا تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا...... طلال کی گاڑی اندر داخل ہوئی وہ باہر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آگیا...... اتنی صبح وہ کہاں سے آیا ہے، یعنی رات باہر گزاری تھی یہ سوچ کر وہ اور پریشان ہوگئے...... پردہ برابر کرکے دھیرے دھیرے چل کر کمرے سے باہر آگئے...... وہ کچن کے سامنے سے گزرے تو بوا چیخیں۔

"ارے پھر بستر سے اٹھ گئے۔"

"میرا اور طلال کا ناشتا لے آئیں، طلال کے کمرے میں۔" انہوں نے بوا کی بات نظر انداز کردی اور طلال کے کمرے کی طرف چل دیے...... ہلکی سی دروازے پر دستک دی۔

"یس......" اندر سے اس کی بھاری آواز آئی تو وہ اندر داخل ہوگئے...... وہ آڑا ترچھا بیڈ پر لیٹا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔

"جی راجا صاحب!"

"کہاں سے آرہے ہو؟" وہ اس کا طنز نظرانداز کرگئے۔

"پہلی بار یہ بات پوچھنے کی وجہ......؟" وہ طنزیہ مسکرایا۔

"جاننا چاہتا ہوں کہ کہاں تھے، کیوں تھے......؟" وہ اس کے سامنے صوفے پر ٹک گئے۔

"آوارہ گردی کررہا تھا۔"

"جس پر شرمندہ نہیں ہو؟"

"لوگ بڑے بڑے گناہ کرکے شرمندہ نہیں ہوتے، میں تو آوارہ ہوں......" وہ دوبدو کہہ گیا۔ ریحان اختر نے بہ مشکل تمام ضبط کیا...... عین اسی لمحے بوا ناشتے کی ٹرے لیے آگئیں۔

"آؤ ناشتا کرو، ماموں کے ساتھ......" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"معاف کرنا راجا صاحب، میں ناشتا کرکے آیا ہوں۔"

"یہ کیسے بول رہے ہو؟" بوا کو اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔

"جیسے بولنا چاہیے......" اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ایش ٹرے میں اسے رگڑ کر بجھادیا۔

"یہی صلہ ہے راجا فیملی کی محبتوں کا......" ریحان اختر رنجیدہ ہوگئے۔

"کاش میں اپنی مرضی سے آیا ہوتا، آپ کی بہن کا قصور ہے مجھ پر احسان نہیں۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا۔

"بس کرو طلال، تم حقیقت نہیں جانتے......" بوا کو زبان کھولنی پڑی۔

"تو بتایئے حقیقت، میں کون ہوں، آپ کے اس عزت دار گھرانے کی بیٹی کا گناہ یا کچھ اور......؟" وہ چلایا۔

"شٹ اپ جو میری بہن کے لیے ایسا کہا......" ریحان اختر کو شدید غصہ آگیا۔

"حقیقت تو ریحان اختر بھی نہیں جانتے، جاننے کے بعد کیا ہو یہ سوچ کر اب تک میں نے زبان بند رکھی ہے۔ بڑے راجا صاحب کے حکم پر عمل کرتی تو تم کہیں اور ہوتے۔ یہ محل، یہاں کا عیش و آرام، دولت، عزت کچھ بھی تمہارے پاس نہ ہوتا مگر میری بی بی کے دل میں اتنی ممتا تھی کہ انہوں نے تمہیں اس محل کا حصہ بنادیا۔" بوا ایک دم جوش میں آگئی تھیں...... طلال حیرت زدہ سا تھا اور ریحان اختر متذبذب کیفیت سے دوچار تھے۔

"کیا مطلب......؟"

"ان کے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے کیوں بوا جی......؟" ریحان اختر کے جملے پر طلال نے خاصا برا ردعمل ظاہر کیا۔

"اگر بھیجنا ہوتا تو اس وقت بھیجتے جب تمہارا لالچی باپ اپنی بیوی کو طلاق دے کر وسیمہ کے ساتھ شادی کرکے بھاگا تھا۔ وہ جذباتی ہوکر تمہیں بیوی سے چھین تو لایا تھا مگر پھر ساتھ لے جانے کو تیار نہیں تھا۔ شاید وسیمہ کی مرضی بھی یہی تھی۔ وہ لے کر ہی نہیں گئے، بھاگ گئے تب راجا صاحب نے یتیم خانے میں جمع کرانے کا فیصلہ سنایا لیکن بی بی صاحبہ نے بہتر مستقبل اور اچھی زندگی دینے کے لیے سمجھا بجھا کر یہیں رکھ لیا کہ اس معصوم کو اچھا رہن سہن ملے۔ تمہارا نام طلال رکھا، یہ بات بی بی صاحبہ نے اپنے بیٹے ریحان اختر کو بھی بتانے سے منع کیا تھا...... وہ دونوں حادثے کی نذر ہوگئے تھے تو پھر بھی بی بی صاحبہ نے یہی بہتر جانا۔" بوا کی آنکھیں نم ہوگئیں...... طلال کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ جھپٹ پڑا بوا کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"تم نے ملازمہ ہوکر اتنی گہری سازش کی، مجھے نام نہیں دیا، بے نام رکھا اور زبردستی کا احسان کیا...... کیوں کیا تم نے ایسا؟"

"طلال! طلال! ہوش میں آؤ، یہ سازش ہوتی تو مجھے باخبر رکھا جاتا۔" ریحان اختر نے اٹھ کر اس کی مضبوط گرفت سے بوا کو آزاد کرایا۔

"اور سازش کیا ہوتی ہے؟ مجھ سے میری شناخت چھین لی، کیا حیثیت ہے میری، راجا ریحان اختر اپنی بیٹی سے میری شادی کیوں نہیں کررہے؟ ان سب کڑیوں کو ملائیں...... میری ذات، میری اوقات کیا ہے؟ ترس کھا کر پالا گیا......" وہ گلوگیر لہجے میں چلاتا چلا گیا۔

"طلال بیٹا! ایسا نہیں سوچو، تم طلال اختر ہو اس گھر کے ہو۔" بوا نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جسے اس نے جھٹک دیا۔

"نہیں چاہیے یہ سراب محل مجھے، میں گمنام ہوں۔" وہ دہاڑا۔

"بوا! کچھ تو اتا پتا چھوڑا ہوگا اس شخص نے۔" ریحان اختر نے پوچھا۔

"ہاں! اس کی ماں زندہ ہے۔" وہ ندامت سے بولیں۔

"کیا! میری ماں زندہ ہے، یہ اب بتا رہی ہو۔" طلال کو اور شاک لگا۔

"چند روز پہلے پتا چلا ہے، وہ خواتین جو آئی تھیں ان میں ایک طلال کی ماں زینت تھی...... مجھے اس سے

پہلے کچھ پتا نہیں تھا...... وہ بھی بیٹے کے لیے بے تاب ہے، اسے اب تک بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''
''اوہ! بوا تو آپ نے انہیں کیوں نہیں بتایا، مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' ریحان اختر سر تھام کر بیٹھ گئے۔
''مجھے تم سے بات کرنی تھی، مشورہ کرنا تھا مگر طلال نے آج......'' وہ خود بے حد خفت محسوس کر رہی تھیں اس گھر کی مالکن کے حکم پر جو قدم اٹھایا تھا وہ انہیں مجرم قرار دے رہا تھا۔ طلال کی نگاہوں میں شدید نفرت تھی وہ کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا...... اس صورتِ حال میں ریحان اختر بے بس سے ہو گئے۔

☆☆☆......☆☆☆

چند گھنٹے کمرے میں بند رہنے کے بعد ریحان اختر باہر نکلے تو سیدھے طلال کے کمرے میں ہی گئے...... کمرے میں اس کا سامان بے ترتیب سا پڑا تھا، چاروں طرف کپڑے، کتابیں، جوتے اور پرفیومز وغیرہ وہ خود خالی خالی نظروں سے چھت گھور رہا تھا۔
''طلال!'' انہوں نے پکارا۔
''جی راجا صاحب......؟'' وہ طنز سے باز نہ آیا۔
''ایسے نہ کہو یار، میں آپ کا ماموں ہوں......'' وہ شرمندہ سے ہو گئے۔
''پلیز! اب یہ فریب مت دیں، میں گمنام ہوں، میری ماں کہاں ملے گی صرف یہ بتا دیں۔'' وہ بپھر اٹھا۔
''ہاں کیوں نہیں، وہ بھی میری بہن ہیں اس حوالے سے آپ بھانجے ہی لگے۔'' ریحان اختر نے خاصے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہا۔
''کہنے میں اور ہونے میں فرق ہوتا ہے، میری زندگی کا نقشہ بدل گیا...... ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں میں، جی چاہتا ہے آگ لگا دوں ساری دنیا کو۔'' وہ غصے سے پھنکارا۔
''آپ کا غصہ بجا ہے لیکن اس کا قصوروار آپ کا باپ ہے جس نے بنا سوچے سمجھے اپنا گھر برباد کیا، میری طرح۔'' وہ دکھی سے ہو کر بولے تو طلال نے غور سے ان کو دیکھا، وہ اپنے کیے پر سچ مچ پشیمان لگ رہے تھے۔
''بہر کیف! مجھے یہاں سے جانا ہے۔''
''کہاں؟ کیا یہ صلہ ہے میری محبت کا؟''
''پلیز! مجھے اور برا انسان نہ بنائیں، جانے دیں ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''
''نہیں طلال یار! تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟''
''ہا...... ہا...... ہا...... جیسے آپ کی بیٹی اور بیوی چلی گئیں، سچ ہے یہ گھر نہیں مقتل ہے یہاں انسانی احساسات کا خون کیا جاتا ہے......'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
''سب چھوڑ جائیں مگر آپ اور بوا ہمیں نہیں چھوڑ سکتے......'' وہ وثوق سے بولے۔
''آپ بوا کو ایوارڈ دیں، بڑے بڑے راز چھپا رکھے تھے انہوں نے۔'' اس نے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔
''نہیں...! ایک وفادار ملازم کیا ہوتا ہے یہ بوا کے کردار سے معلوم ہوا ہے، انہوں نے اپنی ساری زندگی اس گھر کو دے دی، تمہیں، ہمیں پال پوس کر بڑا کیا، اپنی بی بی سے کیے عہد کا پاس کیا۔ انہیں دوش نہ دو، ان کا صدمے سے برا حال ہے۔'' ریحان اختر بولے۔
''صاحب، صاحب جی! بوا کو کیا ہو گیا ہے وہ جائے نماز پر سے نہیں اٹھ رہیں۔'' اسی اثنا میں فیفو لے

گھبرا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
''کیا...... نماز پڑھ رہی ہوں گی......'' ریحان اختر کچھ پریشان ہوئے اور اٹھتے ہوئے بولے۔
''وہ گری پڑی ہیں۔'' فیفو نے جواب دیا۔
''کیا، کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ بھاگے، فیفو بھی ہمراہ بھاگا۔ طلال چند لمحے کے توقف کے بعد باہر نکلا...... تو فیفو کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا بوا کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔
''ک، ک کیا ہوا......؟'' طلال نے پوچھا۔
''وہ، وہ بوا گزر گئیں......'' فیفو سسکیوں سے روتا ہوا دوسری طرف چلا گیا...... طلال کے قدم وہیں جم گئے...... کچھ دیر بعد ریحان اختر باہر نکلے تو بہت غمگین اور رنجیدہ تھے، آنکھوں کے گوشے نم تھے۔
''راز داں کا سفر مکمل ہو گیا...... اب سب آزاد ہیں......'' وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے...... طلال کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ جائے یا ٹھہر جائے...... جائے تو کیا کہہ کر جائے...... ٹھہرے تو کیا جواز بنائے؟ بوا کا چہرہ نظروں میں آ گیا تو بہت کچھ یاد آ گیا...... دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر ان کے کمرے کے دروازے تک گیا...... وہ بستر پر چادر اوڑھے پُرسکون سوئی ہوئی تھیں کچھ نہیں تھا ان کے چہرے پر ایک طمانیت تھی...... سرد سی خاموشی تھی...... فرض کی ادائیگی کے بعد جیسا سکون انسان کے چہرے پر آتا ہے ویسا ہی تاثر ان کے چہرے پر موجود تھا۔
''بوا! کاش آپ مجھے آگاہ کر دیتیں، مجھے میری ماں کی گود لوٹا دیتیں۔'' اس نے اپنی دانست میں ان سے شکوہ کیا اور وہاں سے سیدھا باہر نکل گیا۔

☆☆☆......☆☆☆

عارفہ کچن میں ناشتا بنوا رہی تھیں۔ رابعہ وہیں چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے اخبار پڑھ رہی تھیں کہ رمان کی گاڑی کا ہارن پوری قوت سے بجا۔
''اللہ خیر! رمان کو تو آفس میں ہونا چاہیے تھا۔'' عارفہ نے کچن میں رکھے چھوٹے سے ٹائم پیس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
''کوئی ضروری کام ہو گا......'' رابعہ نے اخبار پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ عارفہ کے کچھ کہنے سے پہلے رمان آندھی اور طوفان کے مانند آوازیں دیتا ہوا وہیں آ گیا۔
''امی! امی! رابی خالہ، نیناں......''
''ارے کیا بات ہے، کیوں چلا رہے ہو؟'' عارفہ بیگم بوکھلا کر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پلٹیں۔
''چھوڑ دیں سب کام، آپ بھی رابی خالہ فوراً اٹھیں اور نیناں مہارانی تو اب تک سو رہی ہوں گی......'' بات کرتے کرتے وہ سیدھا نیناں کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے آئیں۔
''نیناں! نیناں! اٹھو۔'' اس کے سرہانے چلایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔
''کیا مصیبت ہے؟''
''رمان پاگل ہو گئے ہو کیا، کیوں بچی کو پریشان کر رہے ہو؟'' عارفہ بیگم نے لتاڑا۔

”کمال ہے، میں پاگل لگ رہا ہوں۔“

”ہاں بالکل پاگل......“ نیناں جھلا کر دوبارہ لیٹنے لگی تو وہ پھر چیخا۔

”چڑیا! بستر چھوڑ دو، اٹھو چلنا ہے۔“

”افوہ! مسئلہ کیا ہے لڑکے یہ تو بتاؤ......؟“ رابعہ کو طیش آ گیا۔

”آپ لوگ فوراً میرے ساتھ چلیں، پریشانی اور افسوس کا وقت ہے۔“ اس نے پھر نامکمل سی بات کی تو عارفہ بیگم نے زوردار ہتڑ اس کے کندھے پر مارا۔

”ہاتھ، پاؤں پھول گئے ہیں، کیسی پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔“

”رابی خالہ کو اپنے گھر جانا چاہیے، اب غصے سے کام نہیں لینا چاہیے۔“ وہ بڑی دانشمندی کا ثبوت دے رہا تھا مگر وہ تینوں کھول اٹھیں کیونکہ سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”رمان! فارگاڈ سیک کیا مسئلہ ہے تمہارا......؟“ رابعہ نے چیخ کر کہا۔

”آپ کو نہیں معلوم جیسے کہ آپ کو اس وقت وہاں ہونا چاہیے تھا، اب بھی آپ کا غصہ کم نہیں ہوا......اور یہ نیناں اسے بھی ذرا احساس نہیں ہوا، ضد پر قائم رہی......“ اس نے پھر بقراط بننے کی کوشش کی لیکن بے سود ان تینوں پر الٹا اثر ہوا، رابعہ اور عارفہ سہم سی گئیں ایک دوسرے کو سراسیمگی کی حالت میں دیکھنے لگیں۔ نیناں احمقوں کی طرح ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

”خدانخواستہ، کوئی بری خبر تو نہیں ہے۔“ عارفہ نے پوچھا۔

”کسی کی موت کی خبر سے زیادہ بری خبر کیا ہوگی؟“ وہ جھنجلا گیا۔

”ہیں! کیا، کیا کہہ رہے ہو؟“ رابعہ، ریحان کے خیال سے دہل سی گئیں۔

”بس دیر نہ کریں میرے ساتھ چلیں۔“

”رمان! کچھ بتاؤ تو......“ نیناں نے سر پیٹ لیا۔

”کیا آپ لوگ لاعلم ہیں؟“ اب حیرت زدہ ہونے کی اس کی باری تھی۔

”ہمیں کیا معلوم تم کیا کہہ رہے ہو......؟“

”تو آپ کو کچھ معلوم نہیں، فوتگی کی اطلاع آپ کو نہیں ہوئی؟“

”کیا، ارے خدا خیر، کون فوت ہو گیا؟“ عارفہ کے جسم میں سے تو جیسے جان نکل گئی......رابعہ سکتے کی سی کیفیت میں آ گئیں......نیناں خوفزدہ سی ہو کر ماں سے لپٹ گئی۔

”مما! بابا......“

”کہا تھا نا کہ چلی جاؤ......“ رابعہ نے صدمے کے ساتھ اس کے کان میں کہا۔

”اوہو اب تو دیر نہ کریں......“ وہ آگے آگے چل دیا اور وہ تینوں پیچھے پیچھے دھڑکتے دلوں کے ساتھ۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



احساس

ریما علی سید

میں نے گاڑی میں اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ خود احتسابی کے کڑے عمل سے گزر رہی ہے۔ اسے بھی میری طرح کئی سوالوں کے جواب نہیں مل رہے ہوں گے۔ اس کے پاس بھی اپنی کسی سوچ کی کوئی توجیہہ نہیں ہوگی۔

تو ہوا کچھ یوں کہ ڈھائی گھنٹے پہلے میں اپنی بیوی نازنین اور دونوں بیٹوں کے ساتھ گھر سے نکلا

تھا۔ اس کی بنیادی وجہ میرے بیٹے کی فرمائش تھی، اس کے کسی کلاس فیلو کے پاس بیٹری سے چلنے والی موٹر بائیک تھی جسے دیکھ کر میرے صاحبزادے نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ ایسی ہی موٹر بائیک اس کے پاس بھی ہونی چاہیے۔ چنانچہ ایک اچھا باپ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میں اپنے بیٹے کی بات مان گیا مگر چونکہ میرے دو بیٹے ہیں اور میں دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرتا ہوں لہٰذا میں نے دو موٹر بائیکس خریدی تھیں۔ اس ضمن میں ہزاروں روپے میری جیب سے خرچ ہوگئے مگر مجھے رتی بھر ملال نہیں ہوا۔ میرے بیٹوں کے چہروں پر مسرور سی مسکراہٹیں تھیں جو میرے لیے انمول تھیں۔ وہاں سے واپسی میں نازنین نے گھر کے قریب لگنے والے ہفتہ وار بازار میں جانے کی فرمائش کردی تھی۔

گوکہ نازنین ہر ماہ دو سے تین بار شہر کے بڑے مالز اور یوٹیلٹی اسٹور کے چکر لگالیتی ہے اور ضرورت کی ہر شے جس میں گھر کے لیے سودا سلف، کپڑے لتے، میرے، بچوں اور خود اپنی ضرورت اور استعمال کی ہر شے شامل ہے، وہ لے آتی ہے۔ اس کے باوجود ہر ہفتے کو لگنے والے اس بازار میں آنا بھی وہ بے حد ضروری خیال کرتی ہے۔ میرے استفسار پر وہ ہمیشہ کہتی ہے۔

''میں مانتی ہوں کہ گھر میں ضرورت کی ہر شے موجود ہوتی ہے اس کے باوجود بھی کئی ایسی چیزیں ہیں جو بروقت ذہن میں نہ آنے کی وجہ سے لینا رہ جاتی ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر ان بازاروں میں اکثر چیزیں کم نرخوں پر مل جاتی ہیں۔'' اس کی یہ نرالی منطق میں بنا حجت کیے مان لیتا ہوں۔

معمول کے مطابق آج بھی نازنین نے ''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں'' کا راگ الاپتے ہوئے فلور کشنز کے نئے کورز، بیڈشیٹس، برتن دھونے کے لیے ڈٹرجنٹس، اپنے لیے چند لان کے سوٹس اور ان پر لگانے کے لیے لیسز کے علاوہ ایک نیا کراکری سیٹ بھی خرید لیا تھا۔ دونوں بیٹوں کو بھی اس نے کپڑے اور کئی طرح کے کھلونے ''سستے ہیں'' کہہ کر دلائے تھے۔

''ابھی مہینے کی بارہ تاریخ ہے نازنین، ہاتھ ذرا ہلکا رکھو۔'' میں نے اسے ٹوکا بھی تھا۔

''کوئی بات نہیں فاروق! پرسوں آپ نے جو فائل سائن کرکے تین لاکھ روپے کمائے ہیں وہ ان معمولی چیزوں کی خریداری پر ختم نہیں ہوں گے۔'' اس نے اپنی مخصوص شگفتہ مسکراہٹ مجھے نوازتے ہوئے جیسے مجھے کچھ یاد دلایا تھا۔ میں نے کندھے اچکا دیے تھے۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں ایک سرکاری محکمے میں بائیسویں گریڈ کا ملازم ہوں اور ہر ماہ دو تین فائلز ''ادھر سے اُدھر'' کرکے اور محض ایک سائن کرکے سات آٹھ لاکھ آرام سے کما لیتا ہوں۔ نہیں، ''کما'' نہیں ''بنا'' لیتا ہوں۔ سرکار کی جانب سے ملنے والی تنخواہ میں آج کے دور میں ایک شریف انسان کا گزارہ بھلا کیونکر ہوسکتا ہے۔ ایک سیکنڈ۔ یہ سب جان لینے کے بعد اگر آپ مجھے لعنت ملامت جیسا کوئی سلسلہ شروع کرنے والے ہیں تو برائے مہربانی ایسی کوئی ناکام کوشش مت کیجیے۔ آپ میں سے کون ایسا ہے جو ان ''مواقع'' کی تلاش میں نہیں رہتا؟ اگر آپ مجھے قناعت اور صبر کا درس دینا چاہتے ہیں تو یہ بھی نری زحمت ہوگی۔ اخلاقیات پر عمل کرنے والے کا جو انجام میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے بے حد عقل مند بنا دیا ہے۔ میں چیزوں کو صحیح اور غلط کی عینک لگا کر دیکھنا چھوڑ چکا ہوں۔

میرے والد صاحب جو ایک سرکاری اسکول ٹیچر تھے اور ساری زندگی حق حلال اور ایمانداری کی کمائی کھانے والے میرے والد نے مقدور بھر اپنی اولادوں کو اچھی زندگی دینے کی کوشش کی تھی اور ہمیشہ یہ سوچ کر مطمئن رہے تھے کہ اپنے تئیں وہ ہمیں بہت سکھ دے رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ہم بہن بھائیوں نے کہاں کہاں اپنا دل مارا تھا۔ اپنی جائز خواہشات کا گلا گھونٹا تھا، انہیں کبھی پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ ہم سب کو قناعت، صبر، برداشت، حوصلے، ایمانداری اور سچائی کا سبق پڑھانے والے ہمارے والد ٹی بی کے مرض کا شکار ہوکر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے تھے۔ ان کے محکمے نے ایسے ایماندار اور فرض شناس انسان کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ ان کی قناعت، ایمانداری، صبر اور سچائی کہیں کسی کلینک، کسی اسپتال میں ان کے کسی کام نہیں آئی تھی، ایسی ہر جگہ روپیہ چلتا ہے ایسے بوگس اصول نہیں اور میں ایسی زندگی نہیں چاہتا۔

اب ایک سوال میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ آج جب مقابلے کا دور ہے، مہنگائی ہر لمحے کے ساتھ بڑھ رہی ہے، ایک اچھے لائف اسٹائل کو مین ٹین کرنے، بچوں کو ہر بنیادی سہولت اور آسائش، بہترین تربیت و پرورش، بیوی کے جائز مطالبات پورے کرنے اور معاشرے میں سر اٹھا کر جینے کے لیے روپیہ تو چاہیے۔

بات بھی کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے۔ تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں نے نازنین کی بات سن کر اچھے اور فرمانبردار شوہر کی طرح سمجھ لی تھی۔ خود میں نے بھی اپنے لیے ضرورت نہ ہونے کے باوجود چند شرٹس، ٹائیاں، موزوں کی تین چار جوڑیاں، چند کلونز کے علاوہ اپنے چند افسران کے ''ٹیسٹ'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے بھی چند چیزیں ''تحائف'' میں دینے کے لیے خریدی تھیں۔ اب یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آج کے دور میں ترقی کرنے کے لیے اسٹرونگ پی آر کتنی ضروری ہے۔

لدے پھندے اور خوش باش ہم بازار سے نکلے۔ اب ارادہ کسی پارک میں جانے کا تھا اور پھر رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھا کر ہمیں گھر جانا تھا۔ شاپنگ بیگز گاڑی میں رکھ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ نازنین اور دونوں بچے بھی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ میں گاڑی اسٹارٹ کررہا تھا جب میں نے ایک نہایت عجیب منظر دیکھا تھا۔ وہی منظر جس کو دیکھتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کچھ لمحوں بعد میری ساری فلاسفیز بھاپ بن کر اڑ جائیں گی۔ میرے سارے اصول پانی بن جائیں گے اور میری زندگی کسی اونی سویٹر کی طرح اُدھڑ جائے گی۔ اگر مجھے علم ہوتا تو میں اسی وقت نظریں چرا لیتا، پیش قدمی نہ کرتا۔ ہم میں سے ہر ایک ایسے ہی کسی لمحے کی گرفت سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر وہ لمحہ بالکل اچانک کہیں سے آکر کسی آکٹوپس کی طرح ہمیں جکڑ لیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔

سڑک کے کنارے پھلوں کے تین چار ٹھیلے لائن سے کھڑے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بلا ارادہ ہی میری نظریں اس جانب گئی تھیں اور پھر واپس نہیں پلٹی تھیں۔ ان پھلوں کے ٹھیلوں کے سامنے وہ ایک چالیس بیالیس سالہ مرد تھا جو اپنے ساتھ سات آٹھ سالہ ایک بچے کو کھینچتے ہوئے لے کر جا رہا تھا۔ وہ بچہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پورا زور لگا رہا تھا۔ وہ شخص بلند آواز میں اس بچے کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

"کہیں یہ بچہ اغوا تو نہیں ہورہا۔" پہلا خیال یہی تھا جو میرے ذہن میں آیا تھا۔ پھلوں کے ٹھیلے والے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جبکہ آس پاس سے گزرنے والے راہ گیر بھی پلٹ پلٹ کر اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے حیرانی تھی۔

ایک مہذب، پڑھے لکھے اور باشعور انسان کی حیثیت سے میں اس بات کا قائل ہوں کہ انسان کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے اور کسی دوسرے انسان کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی بڑی مشکل میں گرفتار ہو مگر وہ منظر دیکھ کر میں اپنے خود ساختہ اصول پر قائم نہیں رہ سکا تھا۔ میں گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر اترنے لگا تھا کہ نازنین نے مجھے روکا تھا۔

"کیا ہوا، کہاں جارہے ہیں آپ؟" وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر اس کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔

"وہاں دیکھو.. وہ شخص اس بچے کو مارنے کی دھمکیاں دے رہا تھا اور وہ بچہ بری طرح رو رہا تھا۔"

"چھوڑیں بھی ہمیں کیا، ہوگا کوئی مسئلہ۔" نازنین نے بے پروائی سے کہا تھا مگر میں اسے کوئی جواب دیے بغیر گاڑی سے اتر گیا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ کون ہے یہ بچہ اور کیوں رو رہا ہے؟" وہاں پہنچ کر میں نے کڑے لہجے میں پوچھا تھا اور ناقدانہ نظروں سے اس شخص کا سرتاپا جائزہ لیا تھا۔ وہ شخص چہرے مہرے سے خاصا شریف لگتا تھا۔ میں نے بچے کو بھی دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت بچہ تھا اور ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس پر ترس آیا تھا اور اس شخص پر شدید غصہ۔

"بیٹا ہے میرا۔" اس شخص نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ میں چونک گیا تھا۔

"اگر یہ تمہارا بیٹا ہے تو یہ کون سا طریقہ ہے اولاد کے ساتھ پیش آنے کا؟ یہاں سڑک پر کیوں تماشا لگایا ہوا ہے تم نے۔ اگر اس نے کوئی غلطی کی ہے تو تم گھر جا کر بھی سرزنش کرسکتے ہو۔" میرا لہجہ مزید سخت ہوگیا تھا۔

"مجبوری ہے بھائی۔" اس نے ایک سرد سی نگاہ بچے پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"کیسی مجبوری؟" میں نے بے ساختگی سے پوچھا تھا۔

"سفید پوش آدمی ہوں۔ تنخواہ کم ہے اور کھانے والے زیادہ۔ بچہ پھل کھانے کی ضد کررہا ہے اور میری جیب اس کی اجازت نہیں دیتی۔" اس شخص نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ عجیب سی ندامت تھی اس کے لہجے میں۔ "میں تو اسے پیار سے سمجھا رہا تھا مگر بچہ ہے جناب، کیسے اپنی ضد سے پیچھے ہٹ جائے اس لیے ذرا سختی کرنی پڑی۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" میں ایک لمحے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ ویسے بھی آج کل لوگوں نے "مانگنے" کے نت نئے طریقے ایجاد کرلیے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ شخص بھی ایک "پروفیشنل فقیر" ہوگا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔" میں نے سرسری سے انداز میں کہا تھا اور پھر میں اس بچے سے مخاطب ہوا۔

"کیوں بیٹے، کیوں پریشان کررہے ہو ابو کو؟"

میرا اندازہ تھا کہ وہ بچہ یقیناً "سدھایا" ہوا ہوگا اور میرے پوچھنے پر رٹو طوطے کی طرح مجبوریوں، غربت، افلاس اور خواہش پر مبنی افسانہ سنانا شروع کردے گا مگر...... مگر میرے اندازے کے برخلاف وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر اپنے باپ کے پیچھے ہوگیا تھا۔ مجھے حیرت سی ہوئی تھی۔ اگر وہ پروفیشنل مانگنے والے نہیں تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ واقعی...... اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکا تھا۔ بے اختیاری کے عالم میں، میں نے اپنی جیب سے سو کے دو نوٹ نکال کر اس شخص کی جانب بڑھائے تھے۔ ترس نے کچھ اس طرح مجھ پر غلبہ پایا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ یہ روپے رکھ لیجیے اور دلا دیجیے اپنے بیٹے کو جو وہ کہتا ہے۔" مگر اس شخص کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا تھا۔

"یہ آپ کیا کررہے ہیں؟" وہ تیزی سے بولا تھا۔ "آپ نے شاید مجھے بھکاری سمجھ لیا ہے۔ مانا کہ خدا نے آپ کو بہت دیا ہے مگر خدا کا شکر ہے میں قلاش اور بے ضمیر نہیں ہوں کہ اپنے بچوں کے لیے چندہ اکٹھا کرتا پھروں۔" اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔

"نہیں نہیں بھائی۔" میں نے یکدم وضاحت دینی شروع کی تھی۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ کا بچہ ایک جائز خواہش کررہا ہے، آپ اسے پورا نہیں کرسکتے تو میں کردیتا ہوں۔" اسے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا تھا۔

"میں بھی بال بچوں والا ہوں اور اس تکلیف کا اندازہ کرسکتا ہوں جو ایک باپ کو اپنی اولاد کی فرمائش رد کرتے ہوئے ہوتی ہے۔"

"مگر میرے لیے یہ تکلیف اس اذیت سے بہتر ہے جو ایسی کسی حرکت کرنے پر مجھے میری نظروں میں گرا کر ہوگی۔ خدا کی جانب سے ایک آزمائش ہے، میں اس کے آسرے پر بیٹھا ہوں اور وہ میری ہر جائز خواہش وقت آنے پر پوری کردیتا ہے۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا تھا۔

"آپ خوامخواہ بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں بھائی صاحب، آج کل تو لوگ اولاد کی خاطر نہ جانے کیا کچھ کررہے ہیں اور......" اس نے میری بات کاٹی تھی۔

"آپ کی بات بجا مگر آج میرے بیٹے نے صبر اور برداشت کرنا نہیں سیکھا تو کل خواہشوں کے بے لگام گھوڑے اسے کہیں کا نہ چھوڑیں گے، مجبوریوں کی بیڑیاں پیروں میں ڈال کر یہ شکر ادا کرنا کبھی نہیں سیکھے گا، ہاں چور، ڈاکو ضرور بن جائے گا۔ محنت کرکے رزق کمانے کے بجائے ساری زندگی خوشامدی بن کر گزارے گا۔" اس معمولی لباس والے عام سی شکل صورت کے اس مرد کی زبان سے اتنی گہری بات نے مجھے نہ جانے کیوں مفلوج کردیا تھا۔ آج کے دور میں ہر چیز کے لیے خود کو مجبور سمجھنے والے "آدمیوں" کے درمیان وہ کون تھا؟ بے نیاز درویش صفت "انسان" یا...... اس جیسا انسان میں نے اپنی اڑتیس سالہ زندگی میں دوسری بار دیکھا تھا۔ محض ایک لمحے میں اس کی جگہ میرے والد آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ میں پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔

"اولاد بڑی آزمائش ہوتی ہے جس کی خاطر انسان ہر برا کام کرگزرتا ہے مگر میں مجبوری میں بھی ایسا کوئی بیج نہیں بونا چاہتا جس کی وجہ سے کل میری نسل خسارے کی فصل کاٹے۔" اس کے الفاظ مجھے سالوں پیچھے لے گئے تھے۔

"بیٹا فاروق! میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، رزقِ حرام کا ایک بھی دانہ انسان کے پیٹ میں چلا جائے تو آنے والی کئی نسلیں زہر آلود ہوجاتی ہیں، رزقِ حلال کم بھی ہو مگر زندگی میں راحت، سکون اور برکت بہت ہوتی ہے۔" ابو کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی۔ میں تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا ہوا واپس اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ سو روپے کے وہ دو

نوٹ میری مٹھی میں دبے ہوئے تھے۔

میں نے نازنین کی جانب دیکھا جو سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے بیٹوں کو دیکھا اور جیسے مجھے یاد آ گیا کہ کچھ دیر پہلے ہی میں نے اپنے بیٹوں کی فرمائش کس طرح چٹکی بجاتے پوری کر دی تھی، کس وجہ سے؟ صرف اس وجہ سے کہ میرے پاس روپیہ تھا، میں اہلیت رکھتا تھا کہ اپنے بچوں کی زبان سے نکلنے والی ہر فرمائش کو پورا کر سکوں اور اتنا روپیہ میرے پاس آیا کیسے تھا؟ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔

ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچ کر ''مدد'' کے نام پر لوگوں کی فائلز دبا کر، کبھی صرف ایک سائن کر کے، کبھی بلز میں معمولی سی ردوبدل کر کے مٹھائی کے نام پر ہزاروں روپے کھرے کرتا ہوں، کیوں، کس لیے؟ اس خوف سے دامن چھڑانے کے لیے جو مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کے حوالے سے درپیش ہے، وہ خوف جو اس وقت سے میرے دل میں ہے جب میں نے اپنے باپ کو سسکتے ہوئے زندگی کی بازی ہارتے دیکھا تھا۔ رزقِ حلال کی ''زندگی'' جینے کی خواہش رکھنے والا میرا باپ جو رزقِ حلال کی ''موت'' مرتے ہوئے اپنی اولادوں کو کسی محفوظ مستقبل کے حوالے کر کے نہیں گیا تھا، کیسی بے کسی اور مفلسی کی زندگی تھی جو ہم سب بہن بھائیوں نے گزاری تھی اور جس سے مجھے نفرت تھی مگر میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ ایسی زندگی کے باوجود ہم پر کبھی کوئی قہر نہیں ٹوٹا تھا۔ دھکے کھا کر ہی سہی ہم سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے تھے تو کیوں؟ کیا اس رزق کی وجہ سے جو پاکیزہ تھا اور باپ بننے کے بعد میرے ذہن میں کیا تھا؟ صرف یہ کہ میں اپنے باپ کی طرح ایک ناکام باپ کبھی نہیں بنوں گا۔ میں مرتے ہوئے اپنے بچوں کے لیے ایک ''ایمپائر'' چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ میں سے ہر ایک چاہتا ہے۔

ہم اپنی زندگی کے اگلے متوقع تیس سالوں کی منصوبہ بندی اپنے بچوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کرتے ہیں، کبھی اپنا پیٹ کاٹتے ہیں تو کبھی کسی دوسرے انسان کی جیب، ہماری بس یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے بچے ہمارے جاننے والوں، رشتے داروں، سب کے بچوں سے بالکل منفرد نظر آئیں، سب سے اچھے کپڑے پہنیں، انہیں ہر طرح کی سہولیات میسر ہوں اور اس مقصد کے لیے ہم کرپشن کرتے چلے جاتے ہیں اور خود کو بہت بڑا پروگریسیو قرار دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کی دنیا سنوارنے کے چکر میں ہم اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں۔ ہمیں کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ ہمارے اردگرد کئی ایسے لوگ ہیں جو رزقِ حلال کمانے اور صبر وقناعت کی زندگی گزارتے ہوئے اپنے جگر گوشوں کی بنیادی ضروریات بھی ٹھیک سے پوری نہیں کر پاتے۔

زندگی میں پہلی بار میں نے کسی پر ترس کھایا تھا مگر یکدم مجھے احساس ہوا کہ خدا کی پسندیدگی کا شرف جسے حاصل ہو اس پر ترس کھانا کیسا ظلم سا ظلم ہے، مجھے اپنا آپ اتنا چھوٹا پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ مجھے آج سے پہلے خود پر کبھی ترس نہیں آیا تھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں نازنین کو ساری بات بتائی تھی اور وہ جب سے گم صم ہو کر بیٹھی ہے۔ اب وہ مسلسل فرمائشیں بھی نہیں کر رہی، شاید آج وہ بھی گھر جلدی واپس جانا چاہتی ہے۔ آپ کو بھی میں پوری بات بتا چکا ہوں اور اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ پر بھی اس وقت ادراک کا کاری لمحہ گزر رہا ہے۔ آپ کے ذہنوں میں بھی سوال اٹھ رہے ہیں۔



ہوا تو وہی تھا جو عموماً ہر گھر میں ہوتا ہے یعنی بھائی کی شادی ہوئی تو ان کی بیوی 'بہو، بھابی' بن کر اس گھر میں آئی۔ چند دن گھر میں خوب رونق لگی رہی' خوب خوشیاں رہیں مگر سولہ سترہ دن بعد ہی بھابی نے اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا تو بشریٰ کو خوامخواہ کی بے چینیوں نے گھیرا...... شروع شروع میں اسے یہ بے چینیاں خوامخواہ ہی کی لگی تھیں مگر جب واقعی بھابی کا رویہ سخت روکھا سوکھا اور ترش سا ہونے لگا تو وہ

بنو حاکم ایسے

نادیہ جہانگیر

اندر سے کھٹک گئی۔

"امی بھابی کا مزاج بہت خراب ہے۔" اس دن وہ اپنی امی سے کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

"ہش، ایسے نہیں کہتے۔ اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔" امی نے اسے فوراً ٹوکا۔

"مگر امی دیکھیں نا...... وہ جب سے یہاں آئی ہیں، ہمیں وہ کوئی لفٹ ہی نہیں کراتیں، اہمیت دینا تو ایک طرف وہ تو ہم سے بات کرنا بھی شاید گوارا نہیں کرتیں۔"

"بری بات بشریٰ، اسے یہاں آئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تم اس کے خلاف اتنی بدگمان ہو رہی ہو۔" چاول صاف کرتی امی نے اسے ہلکا سا ڈانٹا تو وہ نفی میں گردن ہلانے لگی۔

"بدگمانی نہیں امی، میں تو حقیقی اور سچی بات کر رہی ہوں، آپ دیکھ نہیں رہیں وہ جب سے یہاں آئی ہیں ان کی آنکھیں ماتھے پر ٹکی رہتی ہیں اور جب دیکھو ماتھے پر شکن ڈالے ہر آنے جانے والے کو گھورتی رہتی ہیں۔" ان بیس دنوں میں اس کا لیا گیا جائزہ اتنا غلط بھی نہ تھا جبھی تو امی نے اس دفعہ بولنے کے بجائے چپ سادھ لی تو وہ چور نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی مگر تبھی جھٹکا کھا کر رہ گئی۔ بھابی بیگم امی کے پاس کھڑی تھیں اور اس کے تجزیے کے عین مطابق شکن زدہ ماتھے اور آنکھوں میں گھوری لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ بشریٰ کے تو گویا چھکے چھوٹ گئے۔

"یہ گھر میرا ہے بی بی، میں آنے جانے والوں کو محبت سے دیکھوں یا نفرت سے گھوروں، تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" وہ تڑخی۔

"بھابی، میں تو......"

"بہرحال، میں تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں، آنٹی سے پوچھنے آئی ہوں کہ کیا آج پھر درباری کھانے پہ ہی گزارہ کرنا پڑے گا یا یہ کوئی چینجنگ ہونے دیں گی۔"

"کیا مطلب بیٹا......؟" اس کے ساتھ امی کو بھی حفصہ بھابی کا لہجہ کسی قدر ترش اور چبھتا ہوا لگا تھا۔

"مطلب وطلب کیا آنٹی...... میں جب سے یہاں آئی ہوں ہر دوسرے تیسرے دن دال چاول چڑھا کر آپ سامنے رکھ دیتی ہیں۔" کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر اس نے کہا تو امی حیرت سے ہاتھوں میں پکڑی چاولوں کی پرات کو دیکھنے لگیں۔

"مگر بیٹا یہ تو ہمارے گھر کی سب سے زیادہ مرغوب غذا ہے، ہم سب ہی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

"مگر میں شوق سے نہیں کھاتی، بہتر ہوگا کہ آپ آج انہیں کہیں سنبھال کر رکھ دیں بلکہ ایسا کریں آپ رہنے ہی دیں میں خود ہی کچھ پکاتی ہوں۔ آپ آرام سے جا کر باہر بیٹھ جائیں۔" حفصہ نے کہنے کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ سے چاولوں کی پرات لے کر ایک طرف رکھ دی اور خود فریج کھول کر اس میں جھانکنے لگی۔ امی نے کن انکھیوں سے بشریٰ کو دیکھا جو پہلے ہی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی پھر اس سے نظریں چرالیں۔ بشریٰ آہستگی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ پیچھے امی بھی دبے قدموں سے چل پڑی تھیں۔

☆☆☆

بشریٰ کی یہ شروع سے عادت تھی کہ وہ رات دس بجے تک اپنے ابو کے ساتھ بیٹھ کر خبریں سنتی، ٹاک شوز دیکھتی اور پھر دونوں باپ بیٹی اپنے اپنے خیالات کا تبادلہ کرتے، نیند آتی تو وہ کمرے میں جاتی ورنہ وہیں بیٹھی رہتی۔ کبھی ابو خود کافی بنا کر لے

آتے اور کبھی امی بنا کر دے جاتیں۔ اسے شروع سے ابو کی پسند کے چینلز دیکھنے کا شوق تھا۔ اسپورٹس، نیوز اور ایسے ہی معلوماتی چینلز مگر جب سے بھابی آئی تھیں انہوں نے ان دونوں باپ بیٹی کی اس عادت میں خلل ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت دھوم دھڑکے والے چینلز یا پھر ڈرامے دیکھتی رہتیں۔

احسان علی اپنی عادت کے ہاتھوں بے چین ہو کر نیوز چینل یا اسپورٹس کا پروگرام لگاتے تو وہ بنا کسی لحاظ کے ان سے ریموٹ لے لیتی۔

"انکل یہ بھی بھلا کوئی دیکھنے والی چیز ہے۔ آپ بھی بڑے خشک مزاج ہیں، اپنی...... طرح کے چینلز ہی دیکھتے ہیں۔"

"بھابی ابو تو شروع سے ایسے ہی چینلز دیکھنے کے عادی ہیں۔" اس دن اس سے چپ نہ رہا گیا تو بول ہی پڑی۔

"توبہ ہے سارے گھر والے ہی گئے گزرے ہیں، یہ بھی دیکھنے والی چیزیں ہیں بھلا۔" بھابی کو تو اس کے بھی نیوز چینل دیکھنے پر اعتراض تھا۔

"بھابی اب ابو ناچ، گانا دیکھتے بھی تو اچھے نہیں لگیں گے نا......" اس کا دل چاہا کہ کہہ دے مگر بہ مشکل خود پر قابو پا لیا مگر اگلے ہی دن ٹی وی کو لاؤنج سے اٹھوا لیا گیا تو بشریٰ ٹی وی کی خالی جگہ کو دیکھ کر حیرت سے بھائی کو دیکھنے لگی جو ابھی ابھی ٹی وی اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ آئے تھے۔

"حفصہ کو رات دیر تک ٹی وی دیکھنے کا شوق ہے تم اور ابو رات گئے تک خشک چینلز دیکھتے رہتے ہو اس بے چاری کو اپنے پسندیدہ چینلز دیکھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا تو میں نے سوچا ٹی وی کمرے میں ہی شفٹ کر دوں۔" بھائی کے بودے سے بہانے پر وہ تاسف سے انہیں دیکھنے لگی۔

"میں اور ابو ٹی وی کہاں دیکھیں گے؟"

"تم لوگ نیا ٹی وی لے لینا، ویسے بھی اب ابو کی پنشن تھوڑی سی بڑھ گئی ہے، دو ماہ کی پنشن سے ایک اچھا سا ٹی وی مل سکتا ہے۔" بھائی کے پاس جواب پہلے سے حاضر تھا۔

"مگر بھائی پنشن سے تو گھر کا سودا ہی بہ مشکل آتا ہے ٹی وی کیسے آئے گا؟"

"گھر کا سودا آ جایا کرے گا اب مجھے تنخواہ ملنے لگی ہے۔" اور وہ جانتی تھی کہ یہ سودا خالصتاً بھابی کے لیے آ رہا ہے ان کی چاہ اور مرضی کے مطابق۔

"یہ تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں مگر بھائی! ابھی تو آپ کی شادی کا قرض ہی اتنا ہے کہ آٹھ، نو ماہ لگ جائیں گے اسے اتارنے میں۔"

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں جنہوں نے قرض لیا تھا وہ اتار بھی لیں گے۔" اس سے پہلے کہ بھائی بولتے پیچھے سے حفصہ کی پاٹ دار آواز آئی۔

"قرض تو ابو نے لیا تھا۔"

"ہاں تو اتاریں گے بھی وہی۔"

"ایکسکیوزمی بھابی! وہ قرض والے پیسے ابو نے اپنی ذات پہ نہیں بھائی کی شادی پر خرچ کیے ہیں۔" بھابی کی ترشی پر اسے بھی غصہ آ گیا۔

"تو کس نے کہا تھا کہ قرض لیں اگر پاس جمع پونجی نہیں تھی تو ضرورت کیا تھی بیٹے کو بیاہنے کی؟" بھابی کو گویا لڑنے کا خبط تھا بھائی الٹا اسے گھورنے لگے۔

"بشریٰ! تم خاموش رہو، میں کرلوں گا سب مینج، جاؤ میرے لیے پانی لے کر آؤ۔" بھائی کے گھورنے اور سختی سے کہنے پر اسے مجبوراً چپ ہونا ہی پڑا۔ رات جب ابو ٹی وی دیکھنے کی غرض سے لاؤنج میں آ کر بیٹھے تو خالی جگہ ان کا منہ چڑانے لگی۔ بشریٰ

کے بتانے پر وہ چپ کے چپ رہ گئے۔

☆☆☆

گھر میں شادی کے اولین ماہ تھے مگر حقیقی اور سچی خوشی کے بجائے گھر میں اک اضطرابیت سی تھی۔ ہر کوئی بے چین تھا...... جمال بھائی تو بیوی پا کر اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے اس سے بے خبر کہ ان کی بیوی بے حد پُرسکون گھر کو عجیب طرح کی بے سکونی میں بدل رہی ہے۔ بشریٰ تو بشریٰ، حفصہ، حسنہ بیگم اور احسان علی کو بھی بات بے بات ٹوک کر انہیں بھی... ناخوش اور بے چین کر رہی تھی۔ اپنی مرضی کا کھانا اپنی مرضی کا پکانا اگر گھر کا کوئی فرد ذرا سی کوئی فرمائش کر دیتا تو اس کے ماتھے پر ایسی لکیریں ابھرتیں کہ فرمائش کرنے والا وہیں نادم ہو جاتا۔

پہلے بشریٰ کو جہاں بھی جانا ہوتا تھا اس کے ایک ہی بار کہنے پر جمال بائیک نکال کر حاضر ہو جاتا مگر اب سو بار کہنے پر بھی وہ یا تو چپ چاپ بیوی کی طرف دیکھتا رہتا یا پھر اسی وقت...... کوئی نہ کوئی جواز گھڑ لیتا۔ بشریٰ بھائی کے اس رویے پر غصہ کرتی تو اس کا اظہار ماں کے سامنے کرتی جو اسے مسکرا کر حوصلہ اور صبر کرنے کو کہتیں۔

اس دن بھی اسے اور حسنہ بیگم کو بازار جانا تھا چونکہ اتوار ہونے کی بنا پر جمال گھر پر ہی تھا، حسنہ بیگم نے اسے بازار لے جانے کو کہا تو وہ حفصہ کو دیکھنے لگا جو فوراً آگے آئی تھی۔

"دراصل آنٹی آج ہمیں امی کی طرف جانا ہے نا تو اس لیے جمال آپ کے ساتھ نہیں جاسکیں گے۔"

"کس وقت جانا ہے بیٹا؟" حسینہ بیگم نے برا مانے بغیر پیار سے پوچھا۔

"شام کو......" جمال کے منہ سے فوراً پھسلا تو حفصہ اسے گھورنے لگی۔

"اور ہمیں ابھی جانا ہے، ہم ایک آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔"

"سوری امی! میں نے ابھی پٹرول بھی نہیں ڈلوایا، ساری ٹنکی خالی ہے۔" بیوی کے گھورنے پر جمال نے فوراً ان سے معذرت کی تو وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

"یہ صوفہ کتنا پرانا ہے؟" حسنہ بیگم، بشریٰ کے لائے ہوئے کپڑے دیکھ رہی تھیں، جب حفصہ کی آواز پر پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کون سا صوفہ؟"

"جس پر آپ بیٹھی ہیں۔"

"یہ...... شاید تین چار سال پہلے لیا تھا۔"

"مگر لگتا تو بہت پرانا ہے۔"

"اس کا رنگ ہی ایسا ہے۔"

"خیر جو بھی ہے، میں چاہ رہی ہوں کہ اس کی جگہ کوئی نیا برائٹ سے کورز والا صوفہ رکھنا چاہیے۔"

"کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں......؟"

"اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے آنٹی، اٹس سمپل اس کی جگہ ہم نیا صوفہ لائیں گے اور یہ کسی کباڑی کو دے دیں گے۔" اس کے بے پروا سے انداز پہ حسنہ بیگم کچھ بول ہی نہ سکیں اور چند ہی دنوں بعد وہاں سے وہ صوفہ اٹھوا لیا گیا اور اس کی جگہ ایک نیا اور بہت عمدہ کوالٹی کا صوفہ رکھ دیا گیا۔

"یہ تو بہت مہنگا ہوگا بیٹا۔"

"ہاں تو کیا ہے، بندہ کوئی چیز لے تو ایک ہی دفعہ اچھی لے نا، یہ کیا ہوا کہ بندہ چیز بھی لے اور کاٹھ کباڑ کی طرح......" حفصہ کا لب ولہجہ ہی نہیں انداز بھی شاہانہ تھا۔

"مگر بیٹا جمال کی تنخواہ تو اتنی نہیں ہے کہ وہ اتنی مہنگی مہنگی چیزیں افورڈ کر سکے۔ ابھی تو اس کی شادی کا قرضہ بھی نہیں اترا۔"

"وہ بھی اتر جائے گا آنٹی...... آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو جمال کی کچھ سلامیوں کے پیسے تھے اور کچھ اس نے آفس سے لون لے کر یہ صوفہ لیا ہے۔"

"مگر اس کی ضرورت کیا تھی؟" حسنہ بیگم پوچھنا تو چاہتی تھیں مگر موقع کی نزاکت جان کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

جمال کی شادی کا قرضہ ابھی ویسے کا ویسا پڑا تھا اور حفصہ نے سارے ڈرائنگ روم کا فرنیچر چینج کرا دیا۔ احسان صاحب پنشن لے کر آئے تو اس سے گھر کا سودا سلف منگوا لیا گیا۔

"ابو ہم نے ٹی وی لینا تھا۔" سودا سلف آتے ہی بشریٰ احسان صاحب سے شکایت کر بیٹھی۔

"وہ بھی آجائے گا بیٹا بس ایک دو ماہ صبر کرو۔"

"نہیں آئے گا ابو، میں جانتی ہوں...... اب اس گھر کے خرچے بڑھ گئے ہیں...... لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں لے آئیں گے، آپ بس سودے کے ہو کر رہ جائیں گے۔" اس کا منہ پھول گیا تو احسان صاحب پیشانی مسلنے لگے۔

"ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔"

"ایسی ہی بات ہے ابو، اب آپ خوش فہمیاں نہ پالیے گا، خاموشی سے گھر کا خرچہ پانی چلاتے رہیں کیونکہ اب بھائی سے کسی بھی قسم کی امید رکھنا فضول ہے، وہ اب ہمارے نہیں۔ اپنی شاہ خرچ بیوی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔" اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر تلخی سے کہا تو حسنہ بیگم اور احسان صاحب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

اور واقعی اس کی یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ اگلے پانچ ماہ تک حفصہ نے کچن کا سارا میٹریل بدلوا دیا نیچے والی منزل کی سیڑھیاں توڑ کر نئی بنوائیں، اوپر والی سیڑھیوں کی گرل لوہے کے بجائے لکڑی کی لگوانے کی خاطر نئی گرل کا آرڈر دے دیا، لان میں نئی کرسیاں لا کر رکھیں اور تو اور ساس سسر کے کمرے میں بھی بہت سی چینجنگ کرا دیں۔ یہ سب دیکھتے ہوئے بھی جمال نے دانتوں تلے سے زبان نہ نکالی اور خاموشی سے ہر ماہ ملنے والی تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر رکھتا چلا گیا۔ احسان صاحب نے کتنی بار اس کے سامنے جتایا کہ قرضہ اتارنا ہے...... قرضے کا بوجھ سر پر ہے مگر وہ سن کر نہ دیا۔ مجبوراً احسان صاحب کو اپنی ہی پنشن سے کچھ بچت کر کے اور کچھ بشریٰ کے لیے بنوائے گئے زیورات بیچ کر وہ قرض اتارنا پڑا۔

"ابو آپ نے بھائی بھابی کو ڈھیل دے کے بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ دیکھا وہ ہمارے معاملات میں کس قدر بے پروا ہو گئے ہیں۔" بشریٰ اندر ہی اندر کلستی اور پھر اس کا اظہار اپنے ماں باپ کے سامنے بھی کر دیتی...... جواباً وہ بے چارے ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر سر جھکا دیتے۔ کبھی اس کے کلسنے اور غصہ کرنے پر حسنہ بیگم سختی سے اسے ڈانٹ دیتیں کہ وہ کیوں شادی شدہ بیٹے کے خلاف انہیں بھڑکانا چاہ رہی ہے مگر ان کی ڈانٹ میں وہ سختی نہ ہوتی جو کھری ہو کیونکہ وہ خود جانتی تھیں کہ بشریٰ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہی، یہ سب سچ ہی ہے۔

بشریٰ کو تو وہ دن ہی نہیں بھول پا رہا تھا جب بھابی کی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد امی نے سارے گھر کی چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا،

اب وہ چابیاں کیا سارے گھر پر قبضہ جما چکی تھی۔ کیا کھانا ہے، کیا پینا ہے، دن کا کھانا کیا، رات کا پکانا کیا، جو دل چاہتا وہ کرتی، جو نہ کرتا، وہ نہ کرتی۔ باقی گھر والوں کو تو وہ کسی کھاتے ہی میں نہ لاتی۔

اب کچھ دنوں سے بھابی بیگم کو لان کی صفائی ستھرائی کا بخار چڑھا ہوا تھا اور بشریٰ اندر ہی اندر کھٹک گئی کہ یقیناً وہ یہ صفائی لان کے پودوں، درختوں اور بیلوں کے بارے میں کرنے کا سوچ رہی ہیں مگر اس سے پہلے کہ حفصہ کوئی قدم اٹھاتی وہ پہلے ہی اس کے سامنے آ گئی۔

''بھابی یہ پودے، یہ درخت میں نے اور ابو نے بڑی محنتوں سے لگائے ہیں، پلیز آپ ان کو یہیں لگا رہنے دیجیے گا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ لجاجت لیے ہوئے تھا مگر حفصہ کے صاف ماتھے پر پھر بھی ایک دو لکیریں آ گئیں۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو، یہ گھر میرا ہے، میں جیسے چاہوں اسے سجاؤں، سنواروں۔ مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کی اگلی بات سنے بغیر حفصہ تیز، تیز چلتی ایک طرف گم ہو گئی جبکہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور پھر اگلے ہی دن جمال پودوں، درختوں کی تراش خراش کے لیے چند بندے لے آیا تو وہ اپنی ماں کے سامنے تن فن کرنے لگی۔

''تمہیں کیا ہے، یہ گھر حفصہ کا ہے، وہ جو چاہے کرے۔'' اس دن بھی الٹی ڈانٹ اسے ہی پڑنے لگی تو وہ اور بھڑک اٹھی۔

''حد ہو گئی امی، اتنی سادہ بھی نہ بنیں ورنہ ایک دن پچھتانا پڑ جائے گا، مجھے تو وہ دن دور نہیں لگ رہا جب بھابی بیگم کسی کوڑے کرکٹ کی طرح آپ کو بھی اٹھا کر باہر پھینک آئیں گی اور بھائی صاحب کے منہ میں تو زبان پہلے سے نہیں تب کیا بولیں گے۔''

''خدانخواستہ بشریٰ...... بری فالیں منہ سے مت نکالو۔'' حسنہ بیگم نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تبھی حفصہ اندر چلی آئی۔

''آنٹی میری ایک کزن کراچی سے یہاں رہنے آ رہی ہے۔''

''سو بسم اللہ بیٹا، کب آ رہی ہے؟'' وہ خوش دلی سے پوچھنے لگیں۔

''اسی ہفتے۔''

''تو......؟'' بشریٰ نے فوراً اگلا سوال اٹھایا اسے حفصہ کا بات کرنے کا انداز خوامخواہ کھٹکا گیا تھا۔

''تو یہ کہ وہ ایک دن کے لیے نہیں، شاید ایک دو ماہ کے لیے یہاں رکے کیونکہ اسے یہاں نئی نئی جاب ملی ہے اور اتنی جلدی اس کے لیے اپنی رہائش کا بندوبست...... کرنا آسان نہیں سو میں نے اسے یہاں رہنے کی آفر کر دی۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے بیٹا، تم اور بشریٰ مل کر اسٹور کے ساتھ والا کمرا صاف کر دو اور اس کی ضرورت کی چیزیں وہاں رکھ دو۔''

''اسٹور کے ساتھ والا کمرا نہیں آنٹی......'' حفصہ بات کرتے کرتے ذرا سا ٹھہری۔ ایک ثانیے کے لیے بشریٰ کو دیکھا جو پہلے ہی اسے دیکھ رہی تھی۔ حفصہ کی پیشانی پر ذرا سا پانی آ گیا۔

''اور تو کوئی بھی کمرا خالی نہیں ہے بیٹا۔''

''آنٹی میں سوچ رہی تھی کہ میں نے آپ کے کمرے میں نیا فرنیچر وغیرہ ڈلوا دیا ہے نا تو کیوں نا...... وہ کمرا؟''

''مگر بیٹا......''

''صرف ایک دو ماہ کی تو بات ہے آنٹی......

پھر آپ دوبارہ سے اپنے کمرے میں شفٹ ہو جائیے گا۔'' اس نے جھجکنے کے بجائے ذرا سی بے پروائی سے کہا تو حسنہ بیگم بشریٰ کو دیکھنے لگیں جو غصے سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ حسنہ بیگم کے لیے ہر بار کی طرح سر جھکانے کے سوا اور کوئی بھی چارا نہیں تھا۔

☆☆☆

''امی، ابو ہرگز بھی اپنا کمرا نہیں چھوڑیں گے اگر بھابی بیگم کو اپنی کزن کو یہاں رکھنے کا زیادہ ہی شوق ہے تو آپ دونوں اپنے کمرے میں رکھ لیں نہیں اور خود اسٹور کے ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہو جائیں۔'' وہ جانتی تھی اس کی ماں حفصہ کے سامنے کبھی بھی انکار نہیں کرے گی جبھی تو تن فن کرتی جمال کے پاس آئی تھی۔

''حفصہ نے تمہیں نہیں امی کو کہا ہے، بہتر ہے تم اس معاملے میں خاموش رہو۔'' جمال کی آنکھیں تو پہلے ہی ماتھے پر ٹکی تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے بھائی آپ کو؟'' وہ دکھ سے اسے دیکھنے لگی۔

''یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے، تم خوامخواہ حفصہ سے الجھنے کی کوشش نہ کرو۔''

''کیا...... یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے بھائی، ماں باپ کو ان کے کمرے سے نکالا جا رہا ہے، اس کمرے سے جس کو انہوں نے شروع سے اپنے لیے بنا رکھا ہے، جہاں بیس سال سے اوپر ہو گئے ہیں انہیں رہتے ہوئے۔ کیا وہ اسے دل سے چھوڑ سکتے ہیں؟'' وہ ایک دکھ کے عالم میں جمال سے پوچھ رہی تھی۔

''کچھ ہی دنوں کی بات ہے بشریٰ، جب امی ابو کو کوئی اعتراض نہیں تو تم کیوں بگڑ رہی ہو؟''

''جمال بھائی! کیا ہو گیا ہے آپ کو، آپ کو نہیں لگتا کہ جب سے بھابی یہاں آئی ہیں، آپ ہم سے اپنے سگے رشتوں سے دور ہو گئے ہیں؟'' وہ اسے آئینہ تو دکھانا نہیں چاہتی تھی مگر غصہ اتنا تھا کہ بولے بغیر رہ بھی نہ سکی۔

''بھائی کیا آپ کو امی، ابو کا مرجھایا مرجھایا سا چہرہ نظر نہیں آتا...... ان کی آنکھوں کی پرانی چمک کہاں گئی...... کیا آپ نے کبھی سوچا؟''

''تمہارا مطلب ہے یہ سب حفصہ کر رہی ہے؟ حفصہ نے ان کے چہرے مرجھا دیے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک چھین لی ہے؟'' بھویں اچکا کر جمال غصے سے پوچھنے لگا تو وہ ملامتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تو آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہ سب خود ہی ہو رہا ہے؟''

''تم...... تم حفصہ سے جیلس ہوتی ہو۔'' اس کی بات نے جمال کو خوامخواہ ہی اتنا گرم کر دیا کہ بے ساختہ اس کے منہ سے وہی بات نکل گئی جو دن رات حفصہ اس کے کان میں بھرتی رہتی تھی۔ اس بات کے بے ساختہ منہ سے نکلنے پر بشریٰ نے اک دکھ کے عالم میں اسے دیکھا تبھی اس کی ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بے وقوف بچی، جب بھی کوئی لڑکی بیاہ کر نئے گھر آتی ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ نئے گھر کو اپنی خواہش اور اپنی سوچ کے مطابق بنائے، سجائے، سنوارے اس کا جیسے جی چاہے وہ گھر کو رکھے۔'' ماں نے اس کو سمجھانا چاہا تو وہ شکایتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''تو کیا اس خواہش میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ساس سسر کو اُن کے کمروں سے ہی نکال دیا

جائے۔''

''امی دیکھ رہی ہیں آپ...... یہ، یہ......''

''بھائی مجھے افسوس ہے کہ آپ کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔'' وہ سر جھٹک کر غصے سے وہاں سے ہٹ گئی۔ جمال نے اسے دور تک دیکھا تھا جبکہ حسنہ بیگم خاموش تھیں۔

☆☆☆

گھر میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب بشریٰ کے کلاس فیلو کا رشتہ اس کے لیے آیا اور شومئی قسمت اس کے ماں باپ کو یوسف ہر طرح سے فٹ نظر آیا۔ باپ کے اتنے بڑے کاروبار کا اکلوتا وارث جس نے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ملک بھر میں پھیلے اتنے بڑے بزنس کو اپنے ہاتھ میں لے بھی لیا تھا۔ حسنہ بیگم اور احسان علی کو دل و جان سے پسند آیا۔

اسے یوسف کے گھر والوں کی آمد کا پتا چلا تو وہ بجائے خوش ہونے کے اپنے ماں باپ سے ناراض ہو گئی کہ وہ اتنی جلدی اسے اس گھر سے نکالنا چاہ رہے ہیں۔ بھائی کو خبر ہوئی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا کہ وہ جانتا تھا حفصہ اس سے خار کھاتی ہے، اس کے خیال میں جتنی جلدی ہو سکے بشریٰ کو یہاں سے نکالا جائے تو اچھا ہے کیونکہ وہ امی سے زیادہ جمال سے شکایتیں کرتی تھی اور بدل جانے کے طعنے دیتی تھی۔

''ٹائم مانگنے کی کیا ضرورت تھی امی، ایک ہی بار ہاں کر دیتے۔'' بھائی کی باچھیں یہاں سے وہاں تک پھیلی دیکھ کر بشریٰ کو بہت دکھ ہوا۔

''بھائی میں آپ پہ بوجھ نہیں ہوں، میرے ماں باپ ابھی حیات ہیں۔'' اسے بھائی کا خوش ہونا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے بشریٰ، جمال تمہارا بھائی ہے۔ اسے تمہاری فکر نہیں ہو گی تو اور کس کی ہو گی؟'' امی نے فوراً اسے ٹوکا۔

''امی آپ تو رہنے ہی دیں۔ ہر بات کو خوامخواہ ...... مثبت انداز میں لے جاتی ہیں۔'' وہ ناراضی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''نہ جانے کیا بات ہے امی، جب سے میری شادی ہوئی ہے اسے نہ میں اچھا لگتا ہوں اور نہ حفصہ۔'' جمال کو ایسے ہی غصہ آ گیا۔ ''میں تو رہا ایک طرف حفصہ سے تو اسے خدا واسطے کا بیر ہے میں کہہ رہا ہوں امی جتنی جلدی ہو سکے اس کی شادی کر دیں ورنہ یہ میرے گھر کا سکون برباد کر دے گی۔'' جمال بشریٰ سے کچھ زیادہ ہی تپا ہوا اور بے حد بیزار لگ رہا تھا، اب کی بار اس کی امی نے بھی بے حد شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا مگر وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد اس کے ماں باپ نے یوسف کے گھر والوں کو ''ہاں'' کر دی۔

''میں جانتی ہوں آپ یہ سب بھابی کی وجہ سے کر رہی ہیں، میں انہی کو کھٹکتی ہوں یہاں، انہی کو خوش کرنے کی خاطر آپ مجھے یہاں سے نکالنا چاہ رہے ہیں۔'' روتے دھوتے نہایت کرب و دکھ سے وہ ماں سے شکایت کرنے لگی اور اس کی یہ شکایتیں مہندی کے دن تک جاری رہیں پھر خود کو اس نے سنبھال لیا اور اچھے سے پیارے سے چمکتے دن وہ یوسف کی دلہن بن کر اس کے خوب صورت گھر میں اتر آئی جہاں اس کی دو بہنیں ایک امی اور ابو رہتے تھے۔

☆☆☆

یوسف اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے سارے گھر

والوں کی آنکھ کا تارہ تھا۔ بہنوں سمیت ماں، باپ اسے بہت چاہتے تھے، دو تین دنوں میں ہی اسے پتا چل گیا کہ یوسف بھی اپنے خاندان کی بہت عزت و قدر کرتا ہے۔ اپنے والدین اور بہنوں کی بہت کیئر کرتا ہے...... شروع شروع میں اسے یہ بہت اچھا لگا تھا مگر شادی کے ایک دو ماہ بعد ہی نہ جانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا کہ یوسف کا اپنے گھر والوں کی طرف کچھ زیادہ ہی جھکاؤ ہے۔ اسے اندر ہی اندر کچھ کھٹکنے لگا اور آہستہ آہستہ اس کا دل گھر والوں سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ بیزار سا رہنے لگا۔ یوسف کا اپنے والدین کی جی حضوری کرنا اور ہر وقت بہنوں کے بے جا لاڈ اٹھانا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ خود بخود سب سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ یوسف نے اس کے گھر والوں کے ساتھ سرد رویے کی شکایت کی تو وہ کھول کر رہ گئی۔

''یقیناً یہ آپ کی امی نے آپ کو میرے خلاف اکسایا ہے۔''

''بشریٰ کتنا فضول سوچتی ہو تم؟'' یوسف کو یقیناً اس کے ایک دم سے یوں اس کی امی کے خلاف بولنے پر غصہ آیا تھا مگر وہ اور بگڑ اٹھی۔

''یوسف میں آپ کی بیوی ہوں اور مجھے آپ کی پوری توجہ چاہیے۔''

''تم نے کب اپنے معاملے میں میری غفلت دیکھی ہے؟'' یوسف کا لب ولہجہ ہی نہیں انداز بھی سخت تھا۔

''تو یہ کیا ہے؟ ہر وقت ماں کے گھٹنوں سے لگ کے بیٹھے رہنا۔ ہر وقت بہنوں کی دلجوئی کرتے رہنا، ان کی فضول فرمائشیں پوری کرتے رہنا اس سب میں، میں کہاں ہوں؟''

''بشریٰ کتنا غلط سوچتی ہو تم......؟''

''میں کچھ بھی غلط نہیں سوچتی، تین ماہ سے اوپر ہو گئے ہیں، مجھے یہاں آئے ہوئے اور ان تین ماہ میں آپ نے کبھی مجھے اہمیت نہیں دی بلکہ اپنے گھر والوں کو مجھ پر ترجیح دی ہے۔ انہیں مجھ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔''

''پاگل ہو تم بشریٰ! کیا تم بھی عام عورتوں کی طرح سسرال کو اپنا دشمن سمجھتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بہت افسوس ہے بشریٰ۔'' یوسف نے تاسف بھری سانس کھینچی تو وہ ذرا سی ٹھنڈی پڑ گئی۔

''میں کہاں غلط ہوں، یوسف اپنی فیملی کو مجھ سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ کیا یہ مجھے نظر نہیں آتا۔'' یوسف کے جانے کے بعد وہ تنہائی ملتے ہی خود کو سچا اور درست ماننے کی کوشش کرنے لگی مگر جانے کیوں اس کا اندر خاموش ہی رہا تبھی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی ثانیہ اندر چلی آئی۔

''بھابی، بھائی کو فون کریں تاکہ آج باہر ڈنر کرنے چلتے ہیں، وہ جلدی آ جائیں نا!''

''کوئی ضرورت نہیں ہے باہر ڈنر ونر کرنے کی، گھر میں جو پکا ہے آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔'' وہ ایک دم سے تڑخی تو ثانیہ کے ہنستے ہونٹ وہیں سل گئے۔ وہ حیرت سے بشریٰ کو دیکھنے لگی۔

''ہر وقت کھانا، کھانا، خرچہ، خرچہ...... تم لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے بھائی کو لوٹنے کے علاوہ؟'' بے حد مشتعل سی وہ ثانیہ پر برسی تو ثانیہ بنا کوئی جواب دیے آہستہ سے باہر نکل گئی۔

رات کے کھانے کے بعد وہ کمرے میں جانے کے لیے اٹھی تو ثنا، ثانیہ نے یوسف کو بازوؤں سے پکڑ لیا کہ وہ پہلے انہیں آئسکریم پارلر لے کر جائیں۔

''یوسف آپ کمرے میں چل کر آرام کریں، سارے دن کے تھکے ہوئے ہیں، ثنا، ثانیہ کو آئس

کریم کھائی ہوگی تو یہ آنٹی کے ساتھ چلی جائیں گی۔ چلیں آپ کمرے میں۔" اس نے مڑ کر سختی سے کہا تو ثنا، ثانیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر بھائی سے ذرا پیچھے ہٹ گئیں۔ وہ یوسف کو لے کر اندر چلی گئی۔

اس کے بدلے رویے پر گھر میں اچانک ہی بے سکونی اور بے چینی نے ڈیرا ڈالا تھا۔ سارے گھر والے ایک دوسرے سے کترائے کترائے سے رہنے لگے۔ خصوصاً اس سے، اسے دیکھتے ہی سب دائیں بائیں ہوجاتے۔ اس سے بات کرنے سے پہلے ہچکچاتے، اسے کوئی بات نہ بری لگ جائے یہ سوچ کر اور ناپ تول کر بات کرتے اور وہ ان سب کو ایسا دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے نہ جانے کیوں اندر سے بجھ سی گئی اور من ہی من میں بے چین رہنے لگی۔ یوسف بھی اس کے سامنے بہنوں کے لاڈ اٹھانے سے کترانے لگا، ماں کے پاس زیادہ نہ بیٹھتا جیسے ہی آفس سے لوٹتا اس کی جی حضوریاں کرتا تو وہ خوامخواہ اندر سے تلملا جاتی، اس دن بھی وہ یوسف کو شاپنگ کے لیے لے جانے کا کہہ رہی تھی تو یوسف نے فوراً گاڑی کی چابی اٹھالی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے میرا دل رکھنے کی...... مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ۔" خوامخواہ وہ تلملائی تو یوسف حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"میں جانتی ہوں، آپ دل سے میری کوئی بات نہیں مانتے۔ صرف مجبوری کے تحت میری جی حضوریاں کرتے ہیں۔"

"ارے، یہ تمہیں کس نے کہہ دیا؟" یوسف ابھی بھی حیران تھا۔

"میں جانتی ہوں سب، یہ سب کیا دھرا آپ کی ماں، بہنوں کا ہے۔ وہ مجھے یہاں دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔"

"بشریٰ تم بات بے بات میری ماں، بہنوں کو درمیان میں کیوں گھسیٹ لاتی ہو، انہوں نے آخر تمہارا بگاڑا ہی کیا ہے۔"

"یہی تو پرابلم ہے کہ وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ رہیں اور میرے غصے میں خوامخواہ اضافہ کررہی ہیں۔" اس کا اندر چیختا تھا مگر وہ ہونٹ بند کیے سختی سے نفی میں گردن ہلانے لگی۔

"یوسف آپ مجھے مکمل طور پر چاہئیں۔"

"تو میں مکمل طور پر تمہارا ہی تو ہوں۔"

"مجھے یہ گھر بھی چاہیے۔"

"یہ بھی تمہارا ہے بشریٰ۔" یوسف نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"پھر میں بے چین کیوں ہوں؟" وہ روہانسی ہوکر چیخی۔ وہ خود کو سمجھنے سے قاصر تھی اور جب اس نے خود کو سمجھا تو بے دم سی ہوگئی اور وہ پہلی فرصت میں صدیقہ بیگم کے پاس بھاگی اور ان سے یوسف کی شکایت کی کہ وہ اسے ثنا اور ثانیہ کو ڈنر کے لیے باہر لے کر نہیں جارہا۔ صدیقہ بیگم اس کے منہ سے ثنا، ثانیہ کا نام اور ان کے لیے فکرمندی سن کر نہال ہی تو ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

"آنٹی یہ صوفہ کچھ پرانا نہیں ہوگیا......" صدیقہ بیگم اور وہ ٹی وی دیکھ رہی تھیں جب بہت سوچنے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"اتنا پرانا تو نہیں ہے بیٹا، ہاں تھوڑا سا رنگ اتر گیا ہے اس کا۔"

"آنٹی ہم کیوں نہ اسے چینج کردیں اور اس کی جگہ ایک اور نیا صوفہ لے آئیں۔"

"مگر بیٹا......"

"آنٹی ثنا اور ثانیہ کی تمام دوستیں بڑے بڑے گھرانوں کی ہیں۔ وہ جب بھی یہاں آتی ہیں ثنا اور ثانیہ تھوڑی سی کونشس نظر آتی ہیں۔ جیسے وہ خود کو ان سے ذرا سا کمتر محسوس کررہی ہوں۔ کل بھی ثانیہ کی دوست آئی تھی اور اس صوفے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ثانیہ بھی خوامخواہ اس کی نظروں سے الجھ رہی تھی۔ جبھی کل میں نے فیصلہ کرلیا کہ ہم اس صوفے کی جگہ ایک نیا صوفہ لے آئیں۔" نہایت خوب صورتی سے اس نے بات بنا کر معصومیت سے صدیقہ بیگم کی طرف دیکھا تو وہ محبت اور اپنائیت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"تم کتنی اچھی ہو بشریٰ۔ اپنے ساتھ ساتھ ہماری بھی عزت رکھنے کے لیے کتنی فکرمند رہتی ہو۔" خلوص دل سے انہوں نے اس کی تعریف کی تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور ہاں آنٹی آج لنچ میں کڑاہی گوشت نہ بنالوں، ثنا کی یہ فیورٹ ڈش ہے، کالج سے لوٹے گی تو خوش ہوجائے گی۔" اپنے کمرے کا دروازہ پار کرنے سے پہلے اس نے گردن موڑ کر صدیقہ بیگم سے کہا تو وہ جیسے اس پر واری ہونے لگیں۔ بشریٰ مسکرادی۔

☆☆☆

"تمہاری بیوی بہت سعادت مند ہے یوسف، ہم لوگوں کا ہم سے زیادہ خیال رکھتی ہے۔" وہ رات کے کھانے کے لیے بریانی بنارہی تھی جب اس کے کانوں میں صدیقہ بیگم کی آواز آئی تو وہیں ہنس دی۔

"اب دیکھو کل میں نے بریانی کا کہا تھا مگر کل اس نے ثانیہ کی فرمائش پر کڑھائی پکوڑے بنادیے مگر میری فرمائش بھی نہیں ٹالی۔ آج میرے کہنے

سے پہلے ہی بریانی بنانے لگی۔'' صدیقہ بیگم بے حد سرشاری یوسف کے سامنے اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں اور وہ اندر اپنی ذہانت کو داد دینے لگی جس کو بروقت استعمال میں لا کر اس نے نہ صرف اپنے پیر یہاں مضبوط کر لیے تھے بلکہ ساتھ ہی اس گھر کے ہر فرد کے دل بھی قابو کر لیے تھے۔ اس نے کیا ہی کیا تھا صرف ذرا سا دماغ لڑایا، تھوڑا سا دل وسیع کیا اور اپنی ذہانت کے بل بوتے پر میدان میں آ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ سسرال میں حسد اور جلن کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اگر عورت نئے گھر آتے ہی حسد اور جلن سے کام لینا شروع کر دے سب پر اپنی مرضی تھوپنا شروع کر دے، بات بے بات اپنا حکم چلانے لگے تو گھر کی فضا میں بے چینی اور اضطرابیت پیدا ہو جانا لازمی سی بات ہے اور اس نے نہایت سمجھداری سے اس بات کو سمجھا اور پھر کمال خوب صورتی سے گھر کو سنبھال لیا۔ ایسے کہ نہ کسی کی دل آزاری کی اور نہ کسی کو ناراض کیا بلکہ آہستہ آہستہ بے حد سمجھداری سے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لیتی چلی گئی۔

اب گھر میں جو بھی ہو رہا تھا اس کی ایما اور مرضی کے مطابق ہو رہا تھا مگر ایسے کہ نہ کسی کو پتا چل رہا تھا اور نہ کسی کی دل آزاری ہو رہی تھی۔ کھانے پکانے سے لے کر شاپنگ وغیرہ تک پر اس کا کنٹرول تھا۔ اِدھر اس کا بریانی کھانے کو جی چاہا تو وہ فوراً صدیقہ بیگم کے پاس حاضر ہو گئی۔

''آنٹی میں سوچ رہی ہوں بہت دن ہو گئے آپ نے بریانی کی فرمائش نہیں کی تو کیوں نہ آج میں اسپیشلی آپ کے لیے بریانی بنا لوں۔'' اس کی اتنی چاہت پہ صدیقہ بیگم واری نیاری ہو گئیں۔

کڑھی پکوڑوں پر دل آیا تو ثانیہ کی پسند کا حوالہ دیا اور فٹ بنا لیے کڑاہی گوشت بنانا چاہا تو ثنا کے لیے بنا رہی ہوں کہہ کر اپنا کام بھی نکال لیا اور اگلے کا دل بھی جیت لیا۔ ڈرائنگ روم کا صوفہ چینج کیا تو ثانیہ، ثنا کا بہانہ کر دیا۔ کچن کو نئے سرے سے تعمیر کرایا تو صدیقہ بیگم کو پرانے اور گدلے میٹریل کی وجہ سے ہونے والی الرجی کا سدباب ہے یہ...... یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر لیا۔

چھت پہ دو کمروں کا اضافہ کرایا تو کیا کہا۔

''جوان جہان ثنا، ثانیہ کے ہوتے ہوئے نیچے مہمان سلانا قطعی اچھا نہیں لگتا۔ بہتر ہے کہ مہمانوں کو اوپر ہی رکھا جائے۔'' اور اس کی اتنی فکر کرنے پر سب گھر والے ہی سرشار ہو گئے اور دل سے اس کے گرویدہ ہو گئے کہ وہ سب کا اتنا خیال رکھتی ہے اور وہ اندر ہی اندر اپنی ذہانت پر خوش ہوتی رہتی کہ کیسے آرام سے وہ اپنے مطلب کے ہر کام نکلوا رہی ہے۔

اور وہ اس بات پر بھی خوش تھی کہ اس گھر کے تمام فرد اس سے شاداں و فرحاں تھے۔ اس سے بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ اس کے حسن سلوک کے گرویدہ تھے اور وہ سب کی محبت دیکھ کر اندر سے مطمئن ہو جاتی کہ اس نے اس گھر میں بھابی کی طرح سلطنت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، سختی نہیں کی اور کسی کو بیزار نہیں کیا اور سب سے بڑھ کر اس گھر میں کسی کو بشریٰ (شادی سے پہلے والی) بننے نہیں دیا۔ جس کا دل آنے والی بھابی سے بیزار صرف اس لیے تھا کہ اس نے صرف حکمران بننا چاہا تھا اپنی جبلت، کرخت اور سخت فطرت کے ساتھ...... اگر حفصہ بھی بشریٰ کی طرح تھوڑا سا دل نرم کرتی اور میٹھی چھری بن جاتی تو آج بشریٰ اور بشریٰ کے ماں باپ بھی یوسف کے گھر والوں کی طرح حفصہ کے دلدادہ ہوتے اور اسی کے گن گاتے مگر......





تمہیں خوشیاں مبارک ہوں

کرن احمد

''شازم دیکھیے تو بھلا، یہ گجرے کیسے لگ رہے ہیں؟'' اس نے گجرے کے پھولوں کو اپنے کندھے پر لہراتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اس نے فائلز پر جھکے جھکے ہی جواب دیا۔

''کھانا کیسا بنا؟'' اس نے کچھ دیر بعد پھر پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے یار، جیسا روز ہوتا ہے ویسا ہی ہے۔'' اس کے جواب نے پھر اسے مایوس کر دیا۔ کچھ دیر افسردہ رہنے کے بعد وہ اپنے مسکراتے چہرے کے ساتھ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

''شازم آپ نے دیکھا نہیں آج میں نے آپ کے فیورٹ کلر کی ساڑی پہنی ہے۔ بتائیں نا میں کیسی لگ رہی ہوں۔'' اس نے شازم کا بازو پکڑ کر کہا۔

☆☆☆

''شازم کو جب اس بارے میں پتا چلے گا تو وہ تو خوشی سے پاگل ہی ہو جائے گا۔ اچھا سنیے۔'' شائستہ بیگم نے سرفراز علی سے کہا۔ ''اسے یہ خوش خبری میں ہی سناؤں گی۔'' ان کی آواز میں خوشی کے ان گنت انداز چھپے تھے۔

''ہاں اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے بغیر اس کی طرف دیکھے ہی جواب دیا۔ ''ذرا میری بلیو فائل نکال کر دو دراز سے۔''

''جی اچھا۔'' وہ خاموشی سے مڑ گئی۔

''عدینہ آج میری میٹنگ ہے آفس میں۔ رات کو ہو سکتا ہے میں گھر نہ آ پاؤں، میرا انتظار مت کرنا۔ کھانا کھا کر سو جانا۔'' وہ تیز تیز بولتا ہوا چلا گیا۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ زرد رنگ کی ساڑی اس کے زرد ہوتے رنگ کو اور لو دے رہی تھی۔

انسان کی زندگی بھی بدلتے موسموں کی طرح ہے، کبھی حدتوں سے مخمور جذبے اور کبھی سرد مزاجوں کے موسم۔ بہاروں کے بعد خزاؤں کی رت لیکن موسموں کی شدت کی طرح جذبوں کی شدت بھی حساسیت کے آئینے کو توڑ دیتی ہے۔ بارش کی طرح برستا پیار اگر روح کو سیراب کرتا ہے تو بے رخی و بے اعتنائی کی کڑی دھوپ من کو گہرائیوں تک جھلسا دیتی ہے۔

''ٹھیک ہے بیگم تم ہی سنا دینا...... آج تو لگتا ہے اپنے بیٹے کی خوشی میں تمہیں نیند بھی نہیں آنے کی۔''

''ہاں ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے اور اس کی کوئی

بھی خوشی میرے لیے دنیا جہاں سے بڑھ کر ہے۔''
''ہاں بیگم ٹھیک کہا تم نے اور خوشی بھی وہ جو من پسند ہو۔'' سرفراز علی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔'' دیکھا نہیں موصوف کتنے چکر لگاتے ہیں تمہارے بھائی کے گھر کے۔ کالج جانے سے لے کر رات دیر گئے تک پڑھنے کا بہانہ کر کے ان کے گھر میں ہی گھسے رہتے ہیں۔ پورے مجنوں ہوگئے ہیں صاحبزادے۔''

''جب یہ پتا چلے گا کہ ہم نے انہیں پکا ہی اس کھونٹے سے باندھ دیا ہے تو ذرا دیکھیے گا اپنے بیٹے کو کیسے مچلتے ہیں جلد از جلد شادی کے لیے۔''

''دونوں کی جوڑی ہے بھی تو کتنی پیاری ماشاءاللہ!'' شائستہ بیگم نے کہا۔'' سونیا بہت پیاری بچی ہے، میرا تو دل کرتا ہے جلد از جلد دلہن بنا کر لے آؤں اسے گھر میں۔'' شائستہ بیگم مسرور لہجے میں کہے جا رہی تھیں۔

''ارے بھئی اتنی جلدی بھی کیا ہے تعلیم تو مکمل ہو جائے دونوں کی اور ویسے بھی قاسم بھائی عدینہ کے لیے بہت فکر مند ہیں، جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی وہ سونیا کی شادی بھی نہیں کریں گے۔ سچ بتاؤں بیگم مجھے تو عدینہ کی بہت فکر ستاتی ہے کبھی کبھی۔ عمر نکلی جا رہی ہے بچی کی پر والدین بھی کیا کریں کوئی مناسب رشتہ ہی نہیں ملتا۔'' شائستہ بیگم بھی اچانک افسردہ ہوگئیں۔

''میں تو کہتا ہوں آخر کیا کمی ہے عدینہ میں جو اب تک جوڑ کا رشتہ ہی نہیں ملا۔ پڑھی لکھی ہے خوب صورت ہے، سمجھدار ہے، پتا نہیں یہ معاشرہ کس طرف جا رہا ہے۔ کیسے کیسے خودساختہ پیمانے بنا لیے ہیں لوگوں نے رشتے جوڑنے کے لیے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں کلیجا منہ کو آتا ہے، اگر میرا کوئی بڑا بیٹا ہوتا تو میں عدینہ کو بھی اپنے گھر میں بہو بنا کر لے آتی۔'' شائستہ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

''مما مجھے سونیا سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ تقریباً چیخ پڑا۔

''مگر کیوں، کیا ہوا۔'' شائستہ بیگم نے بھی قدرے بلند آواز میں کہا۔'' تم تو بہت پسند کرتے تھے اسے۔''

''فار گاڈ سیک مما...... میں نے آپ لوگوں سے کب کہا تھا کہ میں سونیا کو پسند کرتا ہوں۔''

''پر کچھ باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ تمہارا اس گھر کی طرف بہت رجحان ہے، سارا دن تم سونیا کے ساتھ رہتے ہو اور اب ہم قاسم بھائی کو زبان دے چکے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے بیٹا۔'' شائستہ بیگم نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

''سوری مما، میں سونیا سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔''

''تو پھر کسے پسند کرتے ہو؟'' شائستہ بیگم نے ایک گہری خاموشی کے بعد پھر پوچھا۔

''میں عدینہ سے محبت کرتا ہوں اور اسی سے شادی کروں گا۔''

''کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟'' شائستہ بیگم چیخ اٹھیں۔'' جانتے بھی ہو وہ تم سے کتنی بڑی ہے؟ دس سال کا فرق ہے تمہاری اور اس کی عمر میں۔''

''سو واٹ مما! محبت کسی عمر، ذات، نسل کے فرق کو نہیں دیکھتی اور کم از کم آپ تو اس طرح کی خرافات میں نہ پڑیں مما، وہ بھی تو آپ کے بھائی کی ہی بیٹی ہے اور سونیا سے رشتہ طے کرنے سے پہلے آپ لوگوں نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا۔ اب ان سے

کس طرح بات کرنی ہے یہ آپ لوگوں کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ میں صرف عدینہ سے شادی کروں گا ورنہ آپ لوگ میری شادی کا خواب دیکھنا چھوڑ دیجیے۔'' وہ غصے میں بپھرا ہوا جانے کب کمرے سے چلا گیا۔ شائستہ بیگم کے کانوں میں بہت دیر تک شازم کی آواز گونجتی رہی۔

☆☆☆

کئی دنوں کی طویل بحث کے بعد شازم اور عدینہ کی منگنی ہو رہی تھی۔ دونوں خاندانوں نے آخر کار رشتے کو قبول کر لیا تھا اور اس کے ٹھیک دو ماہ بعد وہ عدینہ شازم بن کر شازم کی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی۔ شازم کے پیار نے اس کے مردہ دل کو زندگی دے دی تھی۔

''تم جب زرد رنگ کی ساڑی پہنتی ہو تو یوں لگتا ہے اس زمین پر چاند کی چاندنی دن میں بھی چمک رہی ہے عدینہ۔''

''تمہاری مسکراہٹ کتنی گہری ہے عدینہ جو سارے جہاں کی تھکان، دکھ، تکلیف اپنے اندر چھپا کر سکون اور راحت کی وسعتوں پر لے جاتی ہے۔''

''مجھے تو بس تمہارے جیسے چھوٹی سی عدینہ چاہیے جلدی سے۔'' وہ اکثر اس خواہش کا اظہار کرتا اور وہ تو اس معاملے میں بے بس تھی ورنہ اس شخص کے لیے جس نے اس کی زندگی کو معنی دیے، اس کی دم توڑتی امیدوں کا بھرم رکھا، اس کے جلتے وجود پر محبتوں کا ساون برسایا، اس کے لیے تو وہ بچھنے کو تیار رہتی۔ اس کی ہر خواہش کو اس کی زبان پر آنے سے پہلے پورا کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اس طرح اس پر مہربان ہوگی۔

شازم کا بے پناہ پیار مخمور جذبوں کی حدت کا

شاید

بہت درد ہو گیا ہے
میرے سامنے رو گیا ہے
اس لیے بے قرار ہوں
میرا چاند کھو گیا ہے
تنہائی اپنا مقدر ہے
کہ نصیب سو گیا ہے
رک ہی گئی ہیں دھڑکنیں
جب سے وہ گیا ہے
میں جاگتی رہتی ہوں
شبِ انتظار ہو گیا ہے
اب دل ہی لوٹ آئے
اس کے ساتھ جو گیا ہے
صدف کیوں مر رہی ہو تم
شاید وہ کسی کام کو گیا ہے

شاعرہ، صدف جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ

موسم تھا اور موسم بدل جاتے ہیں۔ شازم نے ایک پرائیوٹ کمپنی میں جاب شروع کی۔ کچھ دن تو وہ موسم نہیں بدلا مگر اس کے بدلنے کا وقت آ گیا تھا۔ انسان جب دنیا کے روایتی کاروبار کی محبت میں پڑتا ہے تو وہ محبتیں جو اس کے دل کی عطا کردہ ہوتی ہیں ان کا رنگ پھیکا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

''شازم آپ کتنے مصروف ہوگئے ہیں۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پاتی۔

''بس کچھ دنوں کی بات ہے عدینہ، مجھے یہ کنٹریکٹ مل جانے دو۔ مہک میڈم میری پروموشن

کردیں گی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے اگلے پروجیکٹ میں وہ میرے ساتھ ہی ہوں اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے عدینہ، تم بس دعا کرو سویٹ ہارٹ! مجھے پتا ہے میں تمہیں وقت نہیں دے پا رہا، پر یہ صرف وقتی مسئلہ ہے، کچھ دنوں کی مشکل ہے پھر آسانی ہی آسانی ہوگی۔'' اس دن وہ بہت خوش تھا۔ اسے کنٹریکٹ مل گیا تھا۔

''عدینہ تم مجھ سے روٹھ تو نہیں گئیں؟'' اس نے اس کی خاموش سی صورت دیکھ کر کہا۔

''نہیں شازم......'' وہ مسکرا کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''تم بہت اچھی ہو عدینہ، ایسے ہی تو نہیں مرمٹا تھا تم پر۔''

''شازم......!'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

''ہاں عدینہ، بولو کیا بات ہے؟''

''مجھے کبھی اکیلا تو نہیں کریں گے۔'' اس نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

''نہیں عدینہ، تم بھلا ایسا کیوں سوچتی ہو ایسا نہیں ہوگا کبھی بھی... اور ہاں، صبح ڈاکٹر زیدی نے بلایا ہے تمہاری رپورٹس آ گئی ہیں۔ لگتا ہے بیگم صاحبہ فائنلی ہماری خواہش پوری کرنے جارہی ہیں۔'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بھئی میں تو بتائے دیتا ہوں مجھے چاہیے بس چھوٹی سی عدینہ ہی۔'' وہ رات بہت عرصے کے بعد خوشی کی کرنوں سے چمکتی ہوئی رات تھی۔

☆☆☆

''ڈاکٹر زیدی ابھی آتے ہیں آپ لوگ بیٹھیں۔'' وہ جب اسپتال پہنچے تو باوردی ملازم نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر زیدی ہاتھ میں رپورٹس لیے وہاں پہنچ گئے۔ کچھ دیر توقف کے بعد شاید بہت مشکل سے انہوں نے بولنا شروع کیا۔

''مسٹر اینڈ مسز شازم جو بات میں آپ کو بتانے جارہا ہوں وہ آپ کو بہت تحمل سے سننی ہوگی۔ مسز شازم مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ شاید کبھی ماں نہ بن سکیں۔'' لفظ تھے یا قیامت...... چند لمحے ایک سکتے کی سی کیفیت چھائی رہی پھر اسی نے کچھ ہمت کر کے پوچھا تھا۔

''کیا میں کبھی ماں نہیں بن سکتی؟''

''دیکھیں مسز شازم، اس طرح کے کیسز میں 95 فی صد چانسز نہیں ہوتے۔ صرف پانچ پرسنٹ ماں بننے کے چانسز ہوتے ہیں لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اس لیے میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دے سکتا۔'' صرف ان چند لفظوں نے انہیں دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا۔

''مجھے تو تم جیسی ایک ننھی سی گڑیا چاہیے۔'' اس کے کانوں میں اکثر دُہرائی جانے والی شازم کی وہ واحد خواہش گونج رہی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شازم کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں چرالیں۔

گھر کے کونے کونے میں اداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وہ رویا نہیں تھا، بس رات کے کسی پہر اس کی ایک سرگوشی ابھری تھی۔

''عدینہ یہ دکھ ہم دونوں کا سانجھا ہے اور تازہ بھی اور ہم دونوں نے زندگی اب یونہی گزارنی ہے، یہ سچ ہے مگر بہت کڑوا۔ اس کی کڑواہٹ جب تک کم نہیں ہوتی آؤ بہت مصروف ہوجائیں بہت مصروف۔ سنا ہے بہت زیادہ مصروفیت میں انسان خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ کچھ دن خود کو بھول جاتے ہیں عدینہ۔'' اس کا لہجہ ڈوبنے لگا تو وہ خاموش ہوگیا۔ رات کی اس گہری خاموشی میں کبھی کبھی عدینہ

کی دبی سسکی کی آواز ابھرتی تو گھر کی سوگواری اور بڑھ جاتی۔

اور پھر یونہی ہوا وہ بہت مصروف ہوگیا۔ اتنا مصروف کہ آج اپنی شادی کی سالگرہ کا دن بھی اسے یاد نہیں۔ وہ اکیلی بیٹھی ان عہدوں کو یاد کر رہی تھی جو کبھی شازم نے کیے تھے۔

''تم نے تو صرف مصروف رہنے کا کہا تھا شازم، بے اعتنائی یا سرد مہری کا نہیں۔'' اس نے کرب سے گجرے بالوں سے اتار پھینکے۔

☆☆☆

مہک میڈم نے آپ کو بلایا ہے۔'' ملازم نے شازم سے کہا۔ وہ فائلز اٹھا کر مہک میڈم کے آفس پہنچا۔

''آؤ بیٹھو شازم۔'' میڈم نے کہا۔ وہ وہاں بیٹھنا ہی تو نہیں چاہتا تھا۔ اتنا عرصہ مہک میڈم کے ساتھ کام کرتے کرتے اب اس کے حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ وہ اتنی کم عمری میں اتنا بڑا بزنس سنبھال رہی تھی۔ حسن و جمال کی تمام حدیں اس چھوٹی سی لڑکی پر ختم ہوجاتی تھیں۔ یوں اس کے دل میں عدینہ کے ڈیرے تھے مگر وہ مہک میڈم کی ایک نظر کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ مہک میڈم کی نظروں میں اپنے لیے پسندیدگی وہ بہ آسانی اکثر دیکھتا تھا۔

''شازم یہ ہمارا نیا پروجیکٹ ہے۔'' مہک میڈم نے فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جس کو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی تھام لیا تھا۔ وہ ان کے سامنے ہوتے ہوئے اکثر وہ سب کر دیتا تھا جن کو نہ کرنے کی ٹھانتا تھا۔ معلوم نہیں کیسا سحر تھا اس کی شخصیت میں۔

''اوکے میڈم۔'' اس نے کچھ لمحے بعد کہا۔

''کم آن شازم میرے ساتھ کام کرتے ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا ہے تمہیں، میرے مزاج سے بہت واقف بھی ہوگئے ہو تم۔ ہم ایک فیملی کی طرح ہیں تو تم مجھے یہ میڈم، میڈم کہہ کر اجنبی نہ بنایا کرو۔'' اس کی مدھم آواز دل کی ساری دنیا میں گونجتی جاتی تھی۔ مہک میڈم کے ساتھ اس کا یہ چوتھا پروجیکٹ تھا اور اس پروجیکٹ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں وہ کسی کولیگ کی طرح ساتھ کام کر رہے تھے۔ باس اور ورکر کے رشتے سے فیملی کا رشتہ بنا، فیملی کے رشتے سے اب وہ دوست بن رہے تھے۔

ہوتا یوں ہے کہ محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی اگر اس کی تجدید ہوتی رہے لیکن جب انسان محبت کی تجدید کرنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ کسی یاد کی طرح ہوجاتی ہے، کسی بھولی بسری یاد کی طرح...... عدینہ کی محبت اس دن پرانی ہوگئی تھی جب کاروبارِ دنیا کی محبت دل میں آئی۔ کاروبارِ دنیا کی محبت میں ساتھ دینے کے

لیے ایک نیا چہرہ جو عدینہ سے زیادہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس پر چھاتا رہا، وہ چہرہ مہک کا تھا۔ مہک کے ہر وقت کے ساتھ نے عدینہ کی محبت کو بھولی بسری یاد بنا دیا۔ وہ جب تک مہک کے ساتھ رہتا، مہک کی مہک سے اس کا وجود شاد رہتا اور جب وہ گھر آتا تو اسے ہر سمت مہک کا وجود ہی نظر آتا اور جب کبھی عدینہ اپنے ہونے کا احساس دلاتی تو اسے اکتاہٹ ہونے لگتی۔ اسے اس لڑکی سے اکتاہٹ ہونے لگتی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ عدینہ شازم اس کی من چاہی ساتھی۔ ایسے ہی کسی دن اس اکتاہٹ کا اقرار اس نے مہک کے سامنے کر دیا۔

''میں سمجھتا ہوں میرا وہ فیصلہ بہت جذباتی تھا مہک، اس کا اور میرا اسٹر الگ الگ تھا۔ وہ مجھ سے دس سال بڑی تھی۔ بس بنا سوچے سمجھے اس سے شادی کر لی مگر مجھے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ڈاکٹر نے کہا کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ شاید اس کی وجہ عمروں کا یہ فرق تھا۔ انسان جب عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو جذبوں کی بے لگام سطحی تہ ہٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ اولاد یا بچے میری شدید خواہش رہے ہیں۔ اس سے شادی کرنے کے بعد یہ احساسِ محرومی مجھے اسی غلطی کی سزا کے طور پر ملا ہے جو میں نے اس سے شادی کر کے کی۔ صرف یہی نہیں وہ جذبوں کا اظہار کرنے میں بھی بانجھ ہے۔ مجھے کبھی اپنی محبت کی دلکشیوں سے جواب نہیں دے پائی وہ مہک مگر جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو زندگی کا مطلب کیا ہوتا ہے وہ میں نے جانا...... تمہیں آج سب کچھ بتا دیا ہے۔ چاہو تو میرا ہاتھ تھام لو، چاہو تو مجھے میری محرومیوں میں چھوڑ کر چلی جاؤ۔''

''شازم! اس کا مترنم لہجہ اسے بے خود کر دیتا تھا۔ وہ پکار رہی تھی شازم۔

''ہاں بولو مہک، کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

''یہی کہ کوئی کسی کا ہاتھ اس لیے نہیں تھامتا کہ اسے چھوڑ دے...تو میں تمہارا ہاتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟''

☆☆☆

اس رات اسے تیز بخار رہا تھا۔ صبح دیر گئے جب وہ اٹھی تو شازم جا چکا تھا۔

''شازم آفس بھی چلے گئے مجھے اٹھایا بھی نہیں۔'' وہ بوجھل قدموں سے اٹھ کر ہال کی طرف گئی۔ فون کی گھنٹی تیسری بار بج رہی تھی۔ اس نے فون اٹھایا۔

''ہیلو کون......؟''

''جی میں ڈاکٹر عذرا بات کر رہی ہوں، کیا آپ مسز شازم بات کر رہی ہیں؟''

''جی میں عدینہ مسز شازم بات کر رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''مسز شازم آپ کچھ دن پہلے میرے پاس آئی تھیں چیک اپ کے لیے اور میرے کہنے پر آپ نے چند ٹیسٹ کروائے تھے، ان کی رپورٹس آ گئی ہیں اور آپ کے لیے گڈ نیوز ہے۔''

''گڈ نیوز؟'' اس کے کانوں کے لیے جیسے کوئی نیا لفظ تھا۔ اس لیے اس نے دوبارہ اتنی حیرت سے پوچھا۔

''جی گڈ نیوز......''

''تو بتائیے کیا گڈ نیوز ہے ڈاکٹر صاحبہ؟''

''مسز شازم آپ ماں بننے والی ہیں۔''

''کیا......!'' اس کے کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹر؟''

''جی ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں، ایسا بہت کم ہوتا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ ہو گیا ہے مسز شازم۔'' معلوم نہیں اس نے کب ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ تو بس اس اچانک ملنے والی خوشی میں جھوم رہی تھی۔ گھر کی اداسیاں جیسے یہ خبر سنتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی ہوں۔ خوشی سے ایک ایک چیز، ایک ایک لمحہ، ایک ایک ذرہ جھوم اٹھا تھا۔

''میرے خدا نے میری سن لی......اب میرے اور شازم کے درمیان کھڑی مصروفیت کی یہ دیوار گر جائے گی جسے کھڑے ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اے میرے مالک! تیرا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ تو نے میرے مردہ وجود میں زندگی ڈال دی۔'' وہ زندگی میں پہلی بار اتنی خوش تھی۔

''آتے ہی شازم کو بتاؤں گی، وہ تو اتنی بڑی خوشخبری سن کر پتا نہیں کیا کریں گے۔'' وہ آنے والے وقت کا تصور کر کے مسکرائے جا رہی تھی۔

بیل بجتے ہی اس نے بے تابی سے دروازہ کھول دیا۔ ایک لمحے کو شازم نے اس کے چہرے پر غیر معمولی رنگ، جو کسی اجلی دھوپ یا صبح کا ہوتا ہے محسوس کیا مگر اگلے ہی لمحے اکتاہٹ کے تلخ سائے نے اسے اپنے زیر اثر کر لیا۔

''شازم مجھے آپ کو بہت ضروری بات بتانی ہے۔''

''فار گاڈ سیک عدینہ تم دیکھ تو رہی ہو کتنا مصروف ہوں میں۔'' اس نے مسلسل پانچویں مرتبہ اسے وہ خبر بتانے کی کوشش کی جس پر شازم نے اسے جھڑک کر خاموش کرا دیا۔

اگلی صبح وہ بزنس ٹور پر دوسرے شہر جا رہا تھا۔ ''عدینہ میرے پاس تمہاری فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔'' عدینہ نے پھر بتانا چاہا مگر وہ کچھ سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی جس کا اسے بے حد انتظار تھا سنے بغیر ہی چلا گیا۔

''کتنی بیزاری تھی شازم کے چہرے پر۔'' عدینہ کا دل کٹا جا رہا تھا۔

''مگر دیکھنا شازم جب تمہیں پتا چلے گا نا تو بھی تم مجھے ہی کہو گے کہ میں نے اتنی دیر سے کیوں بتایا۔'' اگلے ہی لمحے وہ پھر اس نئے مہمان کی خوشی میں جی اٹھی تھی۔

☆☆☆

''مہک، میں نے تمہیں جو سمجھایا ہے وہی کرو۔''

''مگر مما......شازم کو پتا چلا تو......''

''اسے کون بتائے گا، اتنی بات سننے کے بعد کوئی پاگل ہی ہو گا جو وہاں رکے گا۔''

''ٹھیک ہے مما......'' مہک نے جواب دیا۔

فون کی گھنٹی بجی ہی تھی کہ عدینہ نے یہ سمجھ کر جلدی سے فون اٹھا لیا کہ شازم ہوں گے مگر اس طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

''ہیلو......ہیلو!''

''جی آپ کون؟'' عدینہ نے پوچھا۔

''میں مہک بات کر رہی ہوں۔''

''جی بولیے مہک کون؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔''

''پر میں آپ کو جانتی ہوں عدینہ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا وہ کیسے، کون ہیں آپ؟''

''میری بات سنو عدینہ۔ میں مہک ہوں، مہک شازم......''

''مہک شازم، کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میرا مطلب جو بھی ہے تم اس ایک بات کو غور سے سنو۔ میں شازم کی سیکنڈ وائف ہوں عدینہ اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شازم میرے بچے کا باپ بننے والا ہے۔ مجھے اب اس کی بہت سخت

ضرورت ہے مگر تم جو ہو اس کے گلے میں بے مقصد کا پڑا ہوا ڈھول جسے اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بجانا پڑتا ہے۔ وہ تمہیں طلاق نہیں دے سکتا کیونکہ اسے اپنی ماں کا خیال ہے جن کے تم بھائی کی بیٹی ہو۔ پر تم تو اسے اس کی زندگی جینے کا حق دے سکتی ہو۔ دیکھو اس وقت اس نے تم پر احسان کیا شادی کر کے جب تم سے کوئی شادی ہی نہیں کر رہا تھا پر اب تم اس کے حال پر رحم کرو۔ وہ میرے ساتھ خوش ہے بہت۔ تم نے اسے دیا ہی کیا ہے سوائے محرومیوں کے۔'' اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

''اس نے تم پر احسان کیا تھا۔'' یہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ رہی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے روم میں پہنچی، الماری کھول کر شازم کی پرسنل ڈائری نکالی جس کو اس نے کبھی نہیں پڑھا تھا مگر اس نے ہر رات اس کو لکھتے دیکھا تھا۔

کبھی یوں بھی تو ہو دریا کا ساحل ہو
پورے چاند کی رات ہو اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو سونی ہر محفل ہو
کوئی نہ میرے ساتھ ہو اور تم آؤ

اپنی زندگی مہک کے نام

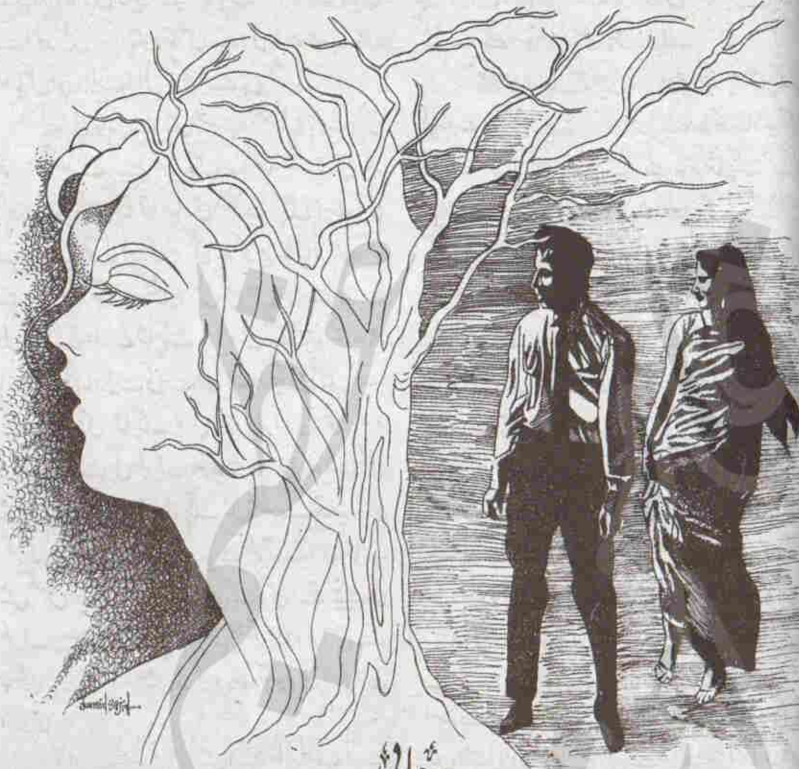
مہک کی تصویریں اس کی گود میں آ گری تھیں۔ ایک بے نام سا بھرم تھا سو وہ بھی ٹوٹ گیا۔ یہ دل کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں اس شیشے کے مانند جو کبھی اتنے شفاف کہ اپنا چہرہ دیکھنے پر زندگی کا عکس بن جاتے ہیں اور کبھی اتنے گرد آلود کہ دھندلا سا چہرہ بھی نظر نہیں آتا۔

''تم نے اسے دیا ہی کیا ہے سوائے محرومیوں کے۔'' یوں لگ رہا تھا جیسے آج یہ احساس اس وجود سے بھاری ہے جو اس کے اندر پل رہا تھا۔

''تم بہت اچھے، بہت اچھے ہو شازم۔ تم نے مجھے زندگی کے رنگ دیے، محبت کے احساس دیے، میرا ہاتھ تھاما جو اس وقت تمہارا مجھ پر واقعی احسان سے کم نہ تھا۔ زندگی اس قابل بنا دی کہ اس سے محبت کی جائے مگر ایسا کیا ہوا شازم کہ میری محبت تمہارے لیے احساسِ محرومی بن گئی۔ انسان جب چاہتوں کی سرزمین پر اپنا گھر بناتا ہے تو اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا مگر جب گھر کو چلاتا ہے تو اس کے کئی جواز ہوتے ہیں۔ کیا تمہارا وہ جواز اولاد تھی شازم......'' اس کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر وہ یہ سب لکھ رہی تھی'' یا تمہارا وہ جواز میرا تم سے عمر میں زیادہ ہونا تھا مگر محبت کے ہونے کے لیے یہ جواز نہیں تھے شازم۔ سو رشتے اگر بنائیں جائیں تو انہیں نبھانا چاہیے۔ دکھ سکھ کے ساتھی دکھ سکھ میں ساتھ نہیں رہیں یا کسی مصروفیت کی آڑ لے کر اپنی خوشیاں کہیں اور تلاش کر لیں تو ایسے رشتے ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ میرا اور تمہارا رشتہ تو شاید بہت پہلے ٹوٹ گیا تھا جب تمہاری زندگی میں مہک آ گئی۔ میں بے خبر تھی اس لیے اس رشتے کی ٹوٹی ڈور کو گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی مگر کچھ بندھن خدا بناتا ہے۔ تمہارے اور میرے بندھن کی ایک نشانی (تمہارا بچہ) اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میں عدینہ شازم تمہیں اجازت دیتی ہوں اپنے حصے کی خوشیاں جی لو۔ تمہیں خوشیاں مبارک ہوں۔'' بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے دل میں اٹھے آنسوؤں کے ایک طوفان کو ساتھ لیے اس نے شازم کے گھر پر آخری نظر ڈالی اور پھر ہمیشہ کے لیے اسے خیرآباد کہہ دیا۔

اس نے ایک بار کہا تھا......
مجھے تمہاری خوشیاں بہت عزیز ہیں
پھر یوں ہوا کہ ایک دن میں نے
اپنی سب خوشیاں اس کے نام کر دیں





بھابی

شمیم فضل خالق

جاوید صدیقی سے پہلی ملاقات مجھے آج بھی یاد تھی...... اس دن اماں نے مجھے بھیجا تھا کہ میں ان کے لیے آنے والی گرمیوں کے لیے لان کے چند جوڑے خرید لوں ساتھ ہی انہوں نے دو، دو سوٹ سائرہ اور خالہ کے لیے بھی لانے کے لیے کہا تھا...... میں نے لاکھ پہلو بچایا، احتجاج کیا۔

''اماں ...... مجھے لیڈیز شاپنگ کا تجربہ نہیں ہے...... آپ سائرہ کو لے کر اپنے لیے خود شاپنگ کریں جیسے ہمیشہ کرتی ہیں۔'' لیکن وہ اماں ہی کیا جن پر میری کوئی بات اثر کرے...... بڑے آرام سے بولیں۔

''لو جی...... جیسے ہمیں بڑا تجربہ ہے...... ارے بازار جاؤ تو تجربہ خود بخود ہو جاتا ہے...... اور ہمیں کون سا کسی فیشن شو میں جانا ہے...... بس گزارے لائق جوڑے لے آنا گھر میں پہننے کے لیے۔'' میں نے ایک آخری کوشش کی۔

''پھر بھی اماں...... ہمیشہ آپ خود جاتی ہیں پھر اس بار کیوں مجھے......'' اماں نے میری بات کاٹی۔

''بس بیٹا...... اب نہ عمر رہی بازاروں میں پھرنے کی نہ دم خم باقی رہا...... الجھن ہوتی ہے

بازاروں کا رش دیکھ کر۔'' وہ بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ گئیں...... میں خاصی بے دلی سے جیب میں موبائل اور والٹ ڈال کر گھر سے باہر آ گیا۔

لبرٹی مارکیٹ میں حسبِ معمول بہت رش تھا...... کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا...... نہ عید نہ تہوار...... لیکن لگتا تھا ساری خلقت یہیں سمٹ آئی ہے۔ اب تو لاہور کی ہر گلی ہر کوچہ بازار بن گیا ہے...... جگہ جگہ مارکیٹیں کھل گئی ہیں، بڑے بڑے دل لبھانے والے شاپنگ پلازہ بن گئے ہیں لیکن جو بات لبرٹی مارکیٹ کی ہے وہ کسی اور جگہ کی نہیں...... مجھے جب بھی شاپنگ کرنی ہو تو میرا رخ خود بخود لبرٹی مارکیٹ کی طرف ہو جاتا...... اس وقت بھی میں بے دلی سے ونڈو شاپنگ میں مصروف تھا یہ سوچ کر کہ جہاں مجھے اچھے ملبوسات نظر آئے اسی شاپ میں گھس جاؤں گا...... کہ اچانک کسی نے پیچھے کی طرف سے مجھے دبوچا...... بہ مشکل خود کو اس کے چنگل سے چھڑا کر میں نے دیکھا تو وہ میرا دوست اسد تھا۔

''ارے...... تم؟'' میں اپنے کالر ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں میں...... لیکن یہ تم شترِ بے مہار کی طرح کیوں گھوم رہے ہو؟''

''بس یار...... اماں نے گرمیوں کے کپڑے لینے کے لیے بھیجا ہے۔'' اسد بے اختیار ہنس دیا۔

''تو کیا کپڑے کسی ونڈو سے اڑانے کا پروگرام ہے جو ونڈو شاپنگ کر رہے ہو۔'' میں کچھ نہ بولا...... تو وہ جلدی سے کہنے لگا۔

''چلو آؤ...... سلیم فیبر کس میں جاتے ہیں، لیڈیز کپڑوں کی سیل لگی ہے...... تمہیں کم قیمت میں اچھی کوالٹی کے کپڑے مل جائیں گے۔'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... میں فوراً اس کے ساتھ سلیم فیبر کس میں گھس گیا...... اندر ہر کوالٹی اور ڈیزائن کے کپڑے تھے اسد میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''چلو اوپر جاتے ہیں...... اوپر لیڈیز شاپنگ کی بہت ورائٹی ہے...... آج میرے ساتھ جاوید بھی آیا ہے...... اپنے باس کے لیے کچھ شاپنگ کر رہا ہے...... میں تجھے اس سے بھی ملوادوں گا۔'' مجھے اس کے کسی دوست سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ الٹا مجھے کوفت ہوئی...... ویسے بھی میں زیادہ سوشل بندہ نہ تھا...... نہ زیادہ دوست احباب رکھتا تھا...... خود اپنے آپ میں مگن رہنے والا انسان تھا...... سو میں جلدی سے بولا۔

''اس وقت تو میں کسی سے نہیں مل سکوں گا کہ مجھے گھر سے نکلے کافی دیر ہو چکی ہے......'' لیکن اسد نے میرے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دی اور میرا ہاتھ تھامے وہ اس کونے والی جگہ پر گیا جہاں دکاندار مستعدی سے گاہکوں کو تھان کھول کر دکھا رہے تھے...... ان میں ایک گاہک جاوید صدیقی تھا...... اسد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر اسے متوجہ کیا، میں انتہائی بور چہرہ لیے اس کے ساتھ کھڑا تھا کہ اس نے مڑ کر دیکھا...... اور میں حیران رہ گیا۔

آج تک اتنا دلکش بندہ میری نظر سے نہیں گزرا تھا، کوئی دیو مالائی کردار لگتا تھا وہ...... بنانے والے نے اسے بڑے دل سے بڑی محنت سے بنایا تھا...... اونچا لمبا قد، ہنستا مسکراتا چہرہ، بھورے بال، کالی کالی بڑی بڑی آنکھیں، ہلکی سنہری رنگت...... غرض اس میں کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا...... اسد نے میرا اور اس کا تعارف کرایا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا جبکہ مجھ میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی...... جب وہ مجھ سے بات کرنے لگا تو اس کا لہجہ اتنا نرم اور پُر اثر تھا کہ... میں مزید حیران رہ گیا۔

''یا خدا...... کیا کسی شخص میں اتنی ساری صفات اکٹھی ہو سکتی ہیں۔'' اسد نے میری شاپنگ کے بارے میں بتایا تو وہ بڑے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''ارے یار...... ہم کس لیے ہیں...... آؤ...... تمہاری شاپنگ میں تمہاری مدد کرتے ہیں۔'' میں جیسے کسی ٹرانس کے عالم میں اس کے ساتھ کھنچتا چلا گیا...... شاپنگ کے بعد وہ اسد سے کہنے لگا۔

''چلو اسد...... آج احسن کے ملنے کی خوشی میں کولڈ کافی پیتے ہیں۔''

یا تو میں بڑی بوریت کے عالم میں لبرٹی مارکیٹ آیا یا اب یہ عالم تھا کہ گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا...... دل چاہ رہا تھا کہ جاوید صدیقی کے ساتھ پوری لبرٹی گھوموں، ونڈو شاپنگ کروں...... کھاؤں، پیوں، قہقہے لگاؤں مجھے تو خود اپنی حالت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

گھر آ کر بھی مجھ پر جاوید صدیقی کا سحر طاری رہا۔ میں جتنا اسے اپنی تصور کی آنکھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی میری آنکھوں میں گھستا چلا آتا...... وہ نہ میرے دل سے دور ہو رہا تھا نہ آنکھوں سے اس کی صورت ہٹ رہی تھی...... یہ مجھے کیا ہو گیا تھا...... اگر جاوید صدیقی کوئی لڑکی ہوتا تو پھر بھی میری بے قراری کی وجہ سمجھ میں آ سکتی تھی لیکن وہ تو میری عمر کا ایک جوان جہان مرد تھا اور میں تو ہم جنس پرستی کے مضامین تک پڑھنا پسند نہیں کرتا تھا...... مجھے تو اس ٹاپک سے ہی گھن آتی تھی...... بھلا لڑکا لڑکے سے بھی محبت کر سکتا ہے؟ یہ تو فطرت کے قانون کے خلاف بات ہے...... اور اب میری یہ بے قراری، یہ بے چینی...... کیا میں اپنے دل کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو چکا تھا کہ ایک وجیہ و شکیل لڑکے کو دیکھ کر میں خود پر قابو نہ پا سکا...... اس رات خود کو جتنا لعن طعن کر سکتا تھا...... میں نے کیا...... لیکن دل اس قدر ڈھیٹ بنا ہوا تھا مجال ہے کہ اس کے کان پر جوں رینگی ہو...... دل کے ہاتھوں میری مجبوری اس قدر بڑھی کہ اگلے دن میں اس کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھا تھا...... کل ہی لبرٹی میں ہمارے بیچ فون نمبرز، موبائل نمبر وغیرہ کے تبادلے ہو چکے تھے...... اس تھوڑے سے وقت میں ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے...... جاوید مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا...... اس کے...... دلکش چہرے پر بڑی ہی...دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سچ کہوں احسن...... تو میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔'' مجھے دل ہی دل میں خود پر غرور سا ہوا...... جاوید صدیقی نے مجھے یاد رکھا تھا اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی...... اس دن بھی میں کافی دیر تک جاوید صدیقی کے ساتھ رہا بلکہ اس دن تو میں نے اپنا

آفس جانا بھی گول کردیا...... آفس سے مجھے یوں بھی دلچسپی نہیں رہی تھی...... میں جس موبائل کمپنی کے آفس میں کام کرتا تھا وہاں تنخواہ بہت کم اور کام بہت زیادہ تھا...... میں آج کل اپنے لیے ایک اچھی سی جاب تلاش کررہا تھا اور آفس بس مارے باندھے ہی جایا کرتا تھا...... خیر...... اس دن جاوید صدیقی سے مل کر میں ایک نئی امنگ ایک نئی ترنگ اپنے دل میں محسوس کرتا رہا...... اور اس دن کے بعد جیسے روز ملنا ہمارے معمولات میں شامل ہوگیا...... جاوید بالکل اکیلا بندہ تھا اس کے والدین وفات پاچکے تھے، اسے اس کے ایک بے اولاد تایا نے پالا تھا...... نتیجے میں وہ نہ صرف اپنے والد کی بلکہ تایا کی بھی چھوڑی ہوئی جائداد کا مالک بن گیا تھا...... یہ جائداد کچھ زیادہ لمبی چوڑی تو نہ تھی بس گزارے لائق تھی لیکن جاوید کی جاب بھی اچھی خاصی تھی...... پھر اس پر ذمے داریوں کا کوئی بوجھ بھی نہیں تھا سو وہ عیش کررہا تھا...... ایک اچھے علاقے میں اس کا چھوٹا سا خوب صورت بنگلا تھا جس میں اپنے دو تین نوکروں کے ہمراہ رہتا تھا...... میں اکثر اس کے بنگلے میں چلا جاتا اور رات گئے وہاں سے میری واپسی ہوتی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں اس کے لیے زیادہ پاگل ہوتا جارہا تھا...... وہ بیٹھا رہتا تو میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہتا...... گھر آکر بھی میں اس کے خیالوں سے پیچھا چھڑا نہ پاتا...... اور اس انتظار میں رہتا کہ اب دوبارہ کب اس سے ملاقات ہوگی...... جاوید بھی میرا عادی بنتا جارہا تھا...... جس دن مجھے اس کے گھر جانے میں ذرا سی بھی دیر ہوجاتی تو وہ میرا موبائل کھڑکھڑاتا۔

''کدھر رہ گیا یار آج تو......؟'' میں اس کی محبت پر سرشار ہوجاتا...... لیکن اس کے باوجود ہم دونوں کی یہ محبت نما دوستی بڑی بے ضرر قسم کی تھی۔ ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے، ایک ساتھ گھومتے...... گپیں لگاتے بس ہمارے بیچ یہی تعلق تھا۔ اب جاوید کے دل کا تو مجھے علم نہ تھا کہ اس کے میرے علاوہ بھی بہت سارے دوست تھے لیکن میرے لیے جاوید سب کچھ تھا...... میں سمجھتا تھا اگر میں جاوید سے بچھڑ گیا تو سانس بھی نہیں لے پاؤں گا۔

☆☆☆

ان دنوں اماں پھر سے میری شادی کے پیچھے پڑ گئی تھیں...... سائرہ اماں کی بھانجی تھی...... رقیہ خالہ، اماں اور فیضی ماموں...... یہ تین بھائی بہن تھے...... فیضی ماموں کراچی میں ہوتے تھے، اچھے خاصے جوان بندے تھے مجھ سے چند سال ہی بڑے ہوں گے...... ابھی غیر شادی شدہ تھے کراچی میں اچھی جاب پر تھے...... اماں اور رقیہ خالہ لاہور میں تھیں، میں اماں کا اکلوتا بیٹا تھا، ابا چند سال پہلے گزر گئے تھے اب میں اور اماں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے...... رقیہ خالہ کے شوہر یعنی میرے خالو ابھی دو سال قبل ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پاچکے تھے...... رقیہ خالہ اچھرہ میں اپنے بھرے پُرے سسرال میں رہتی تھیں...... سائرہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی جو اکثر اپنے گھر کے بجائے ہمارے گھر میں پائی جاتی تھی...... اماں کی شدید خواہش تھی کہ سائرہ ان کی بہو بنے...... جب تک میں جاوید صدیقی سے نہیں ملا تھا...... سائرہ کے لیے میرے انکار میں اتنا زور نہیں تھا...... اگرچہ دل سے تو نہیں لیکن شاید اماں کے دل کے لیے میں سائرہ کو اپنانے کے لیے تیار ہو ہی جاتا لیکن اب تو خالی دل کے پنجرے میں کوئی بس چکا تھا لہٰذا اب تو سائرہ کو اپنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ سائرہ کوئی بدصورت لڑکی تھی...... وہ اچھی خاصی حسین لڑکی تھی...... ایک اچھے کالج میں پڑھ رہی تھی...... لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا جو صنفِ مخالف کے ساتھ کے لیے ایک فیصد بھی آمادہ نہیں ہوتا تھا...... چاہے وہ سائرہ ہو چاہے کوئی اور...... اماں بڑی غمگین تھیں...... بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی۔

''دیکھو منے...... اگر سائرہ اس گھر میں نہ آئی تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔'' میں نے بات مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا۔

''سائرہ تو روز اس گھر میں پائی جاتی ہے اور کیا چاہتی ہیں آپ......؟'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

''میں اسے اس گھر میں مستقل لانا چاہتی ہوں۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح اپنی جاب کو لے کر اپنا بچاؤ کیا۔

''اماں...... مجھے سیٹ تو ہونے دیں...... میں نے آپ کو کہا تو ہے کہ ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں...... خالہ کو کہہ دیں کہ سائرہ کی شادی اپنی سسرال میں کرادیں......'' اماں دوپٹا منہ پر لے کر رونے لگیں۔

''سائرہ کے لیے بہتیرے رشتے ہیں...... لیکن میں اس کو کھونا نہیں چاہتی...... پوری دنیا میں دو ہی تو سگے رشتے ہیں میرے...... ایک رقیہ دوسرا فیضی......'' مجھے اماں کے آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہورہے تھے لیکن میں بھی کیا کرتا...... میں زبردستی خود کو سائرہ کے لیے آمادہ نہیں کرسکتا تھا...... سو بہلا پھسلا کر اماں کو چپ کرادیا۔

سائرہ جب بھی آتی...... حیلوں بہانوں سے میرے آگے پیچھے ہوتی رہتی...... لذیذ پکوان بنا کر میرے آگے رکھتی...... معنی خیز گفتگو کرتی...... میں ٹھس سا بیزار سا بیٹھا رہتا لیکن اب کے میں نے سوچا...... کیوں نا سائرہ کو اعتماد میں لے کر اس سے بات کی جائے اور بات بھی ایسی ہو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے...... یعنی اماں کو دکھ بھی نہ ہو اور سائرہ کا پتا بھی صاف ہوجائے...... اس دن میں اسی بات کو لے کر سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا حکمتِ عملی استعمال کی جائے کہ کام بھی ہوجائے اور میرا نام بھی نہ آئے...... کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی اماں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فیضی ماموں تھے اماں کی باتوں سے میرا دھیان اس طرف ہوگیا...... اماں کی آواز مارے خوشی کے کانپ رہی تھی۔

''تو سچ کہہ رہا ہے فیضی...... میرے کان تو نہیں بج رہے۔'' اماں کی بات پر میرے بھی کان کھڑے ہوگئے۔

''ارے آئیں گے...... کیسے نہیں آئیں گے، سر کے بل آئیں گے...... پر اتنی جلدی نہیں آسکتے...... سائرہ کے امتحان چل رہے ہیں نا!''

اماں کی بات پر میں نے الجھ کر انہیں دیکھا...... کراچی جانا کیا اتنا آسان تھا...... اور وہاں ہوا کیا تھا جو اماں سر کے بل جانے کے لیے تیار تھیں...... حالانکہ فیضی ماموں نے انہیں جب بھی بلایا...... انہوں نے لمبے سفر کا بہانہ بنا کر انکار کیا اب اماں کہہ رہی تھیں۔

''احسن کی جاب کا مسئلہ چل رہا ہے لیکن میں اس سے بات کروں گی...... ہاں...... ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... اس اہم موقع پر ہم سب کی شمولیت ضروری ہے۔'' اب کے اماں ہنس کر بولیں۔

''ارے...... احسن کراچی میں جاب کیسے کرے گا ہم سب کو چھوڑ کر...... یہیں ڈھونڈ رہا ہے

اپنے لیے بہتر جاب......'' اماں نے فون بند کیا اور مسکرا کر بتانے لگیں۔

''فیضی نے اپنے لیے لڑکی پسند کرلی ہے...... اب جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہے...... بس ہمارے جانے کی دیر ہے۔'' میں اس خبر پر خوشی سے چلا کر بولا۔

''ارے کیا سچ اماں...... فیضی ماموں کی شادی ہوگی۔'' اماں بے ساختہ خوشی سے ہنس کر بولیں۔

''ہاں...... وہ تمہارے آنے پر زور دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا اس بیکار سی جاب کو لات ماردے...... میں یہاں کراچی میں اس کے لیے اچھی جاب ڈھونڈھ لوں گا۔'' جاوید صدیقی سے مجھے اتنی دوری کب گوارا تھی سو لہجے کو اداس بنا کر بولا۔

''میں کہاں جاؤں گا اماں...... بری بھلی جیسی بھی ہے...... جاب تو ہے نا...... اب پتا نہیں دوسری جاب کب ملتی ہے۔'' اماں نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا...... وہ فیضی ماموں کی شادی کو لے کر حد سے زیادہ ایکسائٹڈ تھیں اسی وقت وہ رقیہ خالہ کو فون کرنے بیٹھ گئیں اور کافی دیر تک دونوں بہنوں میں اس شادی کو لے کر پروگرام بننے بگڑنے لگے تھے...... میں بور ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

جاوید صدیقی کے لیے میری دیوانگی روز بروز بڑھتی جارہی تھی...... اماں اور رقیہ خالہ کراچی جانے کے لیے تیاری کررہی تھیں...... بات سائرہ کے ایگزام تک ٹلی ہوئی تھی...... اس دن میں جاوید کے گھر گیا تو جاوید گھر میں موجود نہ تھا۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی...... میں نے فون کھڑکھڑایا۔

''کہاں ہو یار...... میں یہاں آیا بیٹھا ہوں اور تم غائب ہو۔'' وہ اپنے مخصوص نرم سی ہنسی ہنس کر بولا۔

''میرے ایک رشتے کے چچا ہیں...... وہ بیمار ہوگئے تھے...... ان کی عیادت کے لیے آیا ہوں بس آرہا ہوں۔'' میں نے جھنجلا کر فون بند کردیا۔

''لو جی...... ابھی تک کوئی نہیں تھا...... اب یہ رشتے کے چچا کہاں سے نمودار ہوگئے۔'' میں وہیں بیٹھا دل کے جلے پھپھولے پھوڑ رہا تھا لیکن پھر یہ اکثر و بیشتر ہونے لگا...... میں جانے کے لیے تیار ہوتا تو موبائل پر اس کی رنگ آجاتی۔

''وہ احسن...... فیاض چچا کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے...... میں انہیں دیکھنے جارہا ہوں...... تم پلیز ایک گھنٹے بعد آجانا......'' اب ہماری گفتگو میں بھی ان کا ذکر ہونے لگا...... وہ اکثر و بیشتر اپنی تشویش ظاہر کرتا۔

''چچا بہت بیمار رہنے لگے ہیں...... پتا نہیں کیا ہوگا...... اپنا علاج بھی صحیح طرح نہیں کرار ہے۔'' مجھے اس کی یہ تشویش زہر لگتی...... میرے علاوہ جاوید کی تشویش کسی کے لیے بھی ہوتی مجھے اچھی نہ لگتی...... میں بات بدل دیتا...... اس دن میں بڑے اچھے موڈ میں جاوید کے گھر گیا...... میرا خیال تھا آج گھر میں گپ شپ نہیں لگائیں گے بلکہ پہلے لیبرٹی کا چکر لگائیں گے وہاں میں جاوید کے لیے ایک دو اچھی سی شرٹس لوں گا...... پھر بندو خان میں کھانا کھائیں گے اور ڈھیر ساری باتیں بھی کریں گے...... جاوید کے ساتھ کا سوچ کر ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا تھا...... اور خاص کر جب میں اس کے لیے شاپنگ کرتا تو میری خوشی کی انتہا نہ ہوتی...... جاوید بھی اکثر میرے لیے کچھ نہ کچھ خریدا کرتا لیکن آج جیب میں تگڑی سی رقم ڈال کر میں اس کے لیے شاپنگ کے خوشگوار موڈ میں تھا...... جاوید کو دیکھ کر میں چونک اٹھا...... وہ مجھ

سے زیادہ خوشگوار اور اچھے موڈ میں تھا...... بات بے بات ہنس رہا تھا...... میں نے سوچا شاید وہ آنے والوں لمحوں کی بابت سوچ کر خوش ہورہا ہو...... شاید اس کے دل میں ایسے ہی جذبات ہوں جیسے میرے دل میں اس کے لیے ہیں...... اس سوچ نے میرے جذبات میں جیسے تہلکہ مچادیا اور میں کانپتی آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے جاوید...... آج بڑے خوش لگ رہے ہو؟'' میرا خیال تھا وہ جھومتے لہجے میں جواب دے گا۔

''خوش کیسے نہیں ہوں گا احسن تمہارا قرب جو نصیب ہورہا ہے، تم جو میرے دل میں بس رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔'' شاید اس کے جواب سے ہمارے درمیان یہ فاصلے سمٹ جائیں۔ میں سوالیہ انداز میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا...... لیکن وہ سر جھکا کر اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں احسن...... آج میں سچ مچ بہت خوش ہوں بلکہ میں تو تمہیں مٹھائی کھلانے والا تھا لیکن کوئی بازار جانے والا نہیں تھا...... ایک نوکر چھٹی پر ہے دوسرا گھر کے کام کاج میں لگا ہے۔'' میں نے چونک کر...... الجھ کر اسے دیکھا۔

''مٹھائی...... لیکن کس خوشی میں؟'' وہ بڑے سادہ لہجے میں بولا۔

''میری منگنی ہوگئی ہے...... چچا کی بیٹی بیلا سے۔''

''کک...... کیا......؟'' میری چیخ بڑی بے ساختہ تھی...... مجھے لگا جیسے کسی نے ڈھیر سارے نوکیلے تیر میرے سینے میں پیوست کردیے ہوں...... جیسے میرا دل پاتال میں نیچے بہت نیچے گر رہا ہو...... جیسے کمرے کی چھت اور دیواروں نے آکٹوپس کی طرح مجھے اپنے پنجوں میں جکڑ لیا ہو۔ وہ اپنی دُھن میں تھا...... اس نے غور نہیں کیا کہ اس انکشاف سے مجھ پر کیا بیت گئی ہے لیکن پھر اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میرا پیلا پھٹ اور ہکا بکا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگیا...... پھر وہ میرے قریب آکر محبت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''تمہیں یقیناً برا لگا ہوگا احسن...... کہ اس اہم موقع پر میں تم کو...... اپنے انتہائی اچھے دوست کو ساتھ لے کر نہیں گیا اور اکیلے اکیلے منگنی رچالی...... لیکن میرے دوست یہ سب کچھ بہت اچانک...... بغیر کسی پلاننگ کے ہوگیا۔ دراصل میں تنہائی سے اکتا گیا تھا اور گھر بسانا چاہتا تھا...... جبکہ چچا بیمار رہنے لگے تھے اور ان کو بیلا کی شادی کرنی تھی...... ہم دونوں ضرورت مند تھے اور ہم دونوں کی ضرورت ایک دوسرے سے پوری ہوسکتی تھی......سو......''

''تم نے یہ اچھا نہیں کیا جاوید......'' میں پھٹ پڑا۔ ''اپنی پوری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ تم نے جھٹ پٹ کردیا...... تمہاری سادگی سے یقیناً تمہارے چچا نے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی ایسی ویسی بیٹی کو تمہارے پلے باندھ دیا۔'' جاوید نے حیرت سے میرے اس غصے کو دیکھا، اس کی فراخ پیشانی پر بل نمودار ہوئے...... لیکن اس کی لاتعداد صفات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ جلدی غصے میں نہیں آتا تھا...... اس وقت بھی وہ بڑے صبر کے ساتھ اپنی ناراضی بھول کر نرم لہجے میں بولا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو احسن...... چچا بڑے نفیس بندے ہیں...... بیلا سے شادی کی خواہش میری تھی...... بلکہ انہوں نے تو اختلاف بھی کیا تھا کہ ان کے اور میرے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے...... بیلا

غریب گھرانے کی لڑکی ہے، وہ شاید بنگلوں میں رہنا افورڈ نہ کرسکے لیکن میں نے بیلا کو پرکھ لیا تھا...... میں جب جب چچا کی عیادت کے لیے گیا...... تب تب اس خدمت گار لڑکی کو اپنے والد کی دل و جان سے خدمت کرتے دیکھا تھا...... چچا کا چھوٹا سا گھر بیلا کے سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا...... شکل صورت بھی اس کی بری نہ تھی...... چچا نے نامساعد حالات کے باوجود اسے پڑھایا تھا...... اس نے سوشیالوجی میں ماسٹر کیا ہے...... اور ویسے بھی احسن...... میں ساری عمر مکانوں میں رہا ہوں...... اب ایک گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔'' پھر وہ میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

''اب تم مزید ناراض مت ہو...... اس بار چچا کے گھر جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا...... تم چچا اور بیلا سے ملو گے تو تمہیں میری باتوں پر خود یقین آجائے گا۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں تیار ہو کر دو منٹ میں آتا ہوں پھر لبرٹی چلتے ہیں...... آج تمہارا پروگرام لمبا لگ رہا ہے...... یعنی پہلے شاپنگ پھر بندو خان میں کھانا...... واہ بھئی واہ۔'' میں کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہا...... مجھ میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں تھی...... آج سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا تھا...... جو کام فطرت کے قانون کے خلاف ہو ان کا یہی انجام ہوتا ہے...... جاوید تیار ہو کر آیا تو میں نے لرزتے لہجے میں بتایا۔

''اماں کا فون آیا تھا ان کی طبیعت ٹھیک نہیں...... مجھے ابھی جانا ہوگا، آج کا پروگرام پھر کسی دن پر رکھ لیتے ہیں۔'' جاوید نے جلدی سے ہمدردی سے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... یہ سب تو چلتا ہے...... تم فوراً گھر چلو...... کیا میں ساتھ چلوں؟''

''نہیں......'' میں نے اس کی بات رد کی اور عجلت میں اس کے گھر سے نکل آیا۔

گھر آکر میں اپنے کمرے میں بند ہو گیا...... جاوید سے جدائی میری موت تھی...... میں جی بھر کر رویا...... اتنا کہ میری آنکھوں میں جیسے پانی ختم ہو گیا...... میں نے تڑپ تڑپ کر اسے بند کمرے میں پکارا...... مجھے ہر طرف اس کی شبیہہ نظر آرہی تھی...... ہنستا مسکراتا جاوید...... باتیں کرتا جاوید...... چلتا پھرتا جاوید......

''میں کیا کیا بھولوں گا جاوید...... کیا کیا بھولوں گا...... میں نے تو تجھ سے کچھ نہیں مانگا تھا...... بس ایک دیوتا کی طرح تیری پرستش کی تھی...... تجھ سے عشق کیا تھا پھر تو نے اپنی زندگی میں کیوں ایک لڑکی کو شامل کیا...... کیوں...... کیوں......؟'' میں دیوار پر مکے مارنے لگا...... میں بلند آواز سے رونے لگا......

یہ بھی اچھا تھا کہ اماں، رقیہ خالہ کے گھر چند دنوں کے لیے گئی تھیں ان دونوں کو مل کر فیضی ماموں کی دلہن کے لیے شاپنگ کرنا تھی...... سائرہ کے ایگزام بھی ختم ہو گئے تھے...... بس اب ٹرین کی ٹکٹیں لانا رہ گئی تھیں اس دوران میرے موبائل پر جاوید کی کئی کالز آئیں جنہیں میں نے ریسیو نہیں کیا...... شاید وہ گھر بھی آیا ہو کیونکہ میں نے بیل کی کئی آوازیں سنی تھیں لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی تھیں...... میرے اندازے کے مطابق وہ بیل جاوید نے ہی دی ہوں گی۔

☆☆☆

دو تین دن کے سخت ڈپریشن کے بعد میں قدرے ٹھیک ہوا تو سب سے پہلے میں نے اس جاب سے استعفیٰ دیا، اپنے واجبات لیے اور فیضی ماموں کو فون کیا کہ وہ کراچی میں میرے لیے جاب کا

بندوبست کریں، میں اماں کے ساتھ آرہا ہوں۔

فیضی ماموں کا فلیٹ چھوٹا سا تھا لیکن صاف ستھرا تھا...... اس میں تین کمرے تھے...... ایک کمرے میں فیضی ماموں تھے دوسرے کو میرے لیے سیٹ کر دیا گیا...... تیسرے کمرے میں اماں، رقیہ خالہ اور سائرہ تھیں...... فیضی ماموں سب کے آنے سے خصوصاً میرے آنے سے بہت خوش تھے...... میں بھی دل کا درد چھپا کر بظاہر ان سے ہنستا بولتا رہتا لیکن راتوں کو جاوید کی یاد میں روتا رہتا۔

ان دنوں جب فیضی ماموں کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں تو ایک دن اماں رات کو اس وقت میرے کمرے میں آگئیں جب گھر کے سارے افراد سو چکے تھے...... میں رات گئے تک جاگا کرتا...... نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی...... میں راتوں کو جاگ جاگ کر ان لمحات کو یاد کرتا رہتا جب جاوید صدیقی میرے ساتھ ساتھ ہوتا تھا...... اماں کو اس طرح بے وقت دیکھ کر میں چونک گیا...... مجھے ان کی صحت کی فکر لاحق ہوئی تو میں نے تشویش سے پوچھا۔

''اماں آپ اس وقت...... خیر تو ہے نا......؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اماں میرے ساتھ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''ہاں پتر خیر ہے...... بس تجھ سے ایک بات کہنی تھی......'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا...... اماں کے انداز پر میرا ماتھا ٹھنک گیا...... میں سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگا...... اماں رقت بھری آواز میں بولیں۔

''منے...... بس میں آخری بار تجھ سے سائرہ کے بارے میں پوچھنے آئی ہوں...... دراصل مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنی خوشی کے لیے بچی کو بٹھائے رکھوں...... جبکہ تو اس سے شادی پر راضی بھی نہیں ہے...... اب رقیہ کے سسرال میں سے اس کے لیے بڑا اچھا رشتہ آیا ہے...... رقیہ کے جیٹھ نے اسے فون کیا تھا کل...... اگر تو اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو مجھے صاف صاف بتا دے...... تاکہ اس کے لیے آیا ہوا رشتہ قبول کیا جائے۔'' اماں یہ سب کہہ کر اٹھ گئیں...... یہ کہہ کر کہ میرا جواب کل لیں گی گویا آج کی رات انہوں نے مجھے سوچنے کے لیے دی تھی۔ سائرہ اچھی حسین لڑکی تھی...... اس کی اداؤں سے پتا چلتا تھا کہ وہ مجھے پسند بھی کرتی ہے...... لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا جس میں سائرہ کے نام سے کوئی ہلچل نہیں مچ رہی تھی...... لیکن اگر میں اس سے شادی سے انکار کرتا ہوں تو اماں کے پاس تو گویا جینے کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا...... اور اماں کو کھو کر میں کتنی دیر تک زندہ رہ سکوں گا...... اماں جب تھوڑا سا بھی بیمار پڑتیں تو میرے جسم کا خون خشک ہو جاتا...... میں ساری، ساری رات جاگ کر ان کے سرہانے بیٹھا رہتا...... اگر وہ نہ رہیں تو......؟ میرا دل اس سوچ کے ساتھ ہی بند ہونے لگا...... میں نے سوچا...... میرے تو جذبات اور احساسات ویسے بھی مردہ ہو گئے ہیں تو اماں کے لیے کیوں نہ یہ قربانی دے دوں...... چاہے میں سائرہ سے کوئی تعلق رکھوں یا نہیں رکھوں...... کم سے کم اماں تو خوش ہو جائیں گی...... سو اگلے دن اماں کو میں نے اپنی رضامندی دے دی...... اماں تو مارے خوشی کے پھولے نہیں سما رہی تھیں...... انہوں نے اسی وقت مٹھائی منگوالی...... رقیہ خالہ اور فیضی ماموں کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی...... سب ایک دوسرے کے منہ میں رس گلے ٹھونس کر خوشیاں منا رہے تھے...... اماں نے جھٹ سے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر سائرہ

کی انگلی میں ڈال دی...... سائرہ شرمائے جارہی تھی...... اماں اپنی پاٹ دار آواز میں رقیہ خالہ سے کہہ رہی تھیں۔

''اری رقیہ...... اپنے جیٹھ کو فون کر کے کہہ دے کہ سائرہ کی بات تو نے اپنے بھانجے کے ساتھ پکی کردی ہے، اب وہ کوئی رشتہ لانے کا تردد نہ کرے۔'' فیضی ماموں بولے۔

''ہاں بہن جی...... اپنے جیٹھ کو یہ بھی کہہ دینا کہ احسن کی شادی فیضی کی شادی کے ساتھ ہی ہوگی انوائٹ کرلیا انہیں۔'' اماں چونک گئیں...... میں بھی حیرت زدہ رہ گیا...... اماں بولیں۔

''کیا بول رہا ہے فیضی...... اتنی جلدی کیسے ہوگی احسن کی شادی......؟'' رقیہ خالہ بھی بولیں۔

''سائرہ کا جہیز بھی بنانا ہوگا فیضی...... اتنی جلدی تیاری نہیں ہوسکتی...... آرام سے لاہور جا کر شادی کریں گے۔'' فیضی ماموں بولے۔

''کراچی میں ایک دن...... بلکہ نہیں ایک دن کیوں دو، تین گھنٹوں میں شادی کی تیاری ہوسکتی ہے میں اور احسن کل ہی بازار جا کر شاپنگ کرلیں گے...... اور آپ دونوں بہنیں...... لاہور کو بھول جائیں...... میں نے احسن کے لیے اپنے آفس میں جاب ڈھونڈ لی ہے...... اور جب آپ دونوں کے بچے کراچی میں ہوں گے تو آپ دونوں لاہور جا کر کیا کریں گی۔''

ایک کام جو خدا کو کرنا منظور ہوتا ہے اس میں پھر ذرا بھی وقت نہیں لگتا...... مقررہ وقت پر میری اور فیضی ماموں کی شادی ہوگئی۔ لاہور سے بھی مہمان شادی میں شریک ہونے آگئے تھے، اس میں رقیہ خالہ کے سسرالی ہی تھے ہم نے اپنی طرف سے کسی کو نہیں بلایا تھا...... میری ایسی کیفیت تھی کہ نہ خوشی کا احساس ہورہا تھا نہ غم کا...... میں نے یہ قدم اماں کی خوشی کے لیے اٹھایا تھا...... سوان کو خوش باش دیکھ کر مطمئن تھا۔

کچھ کام بادلِ ناخواستہ کیے جاتے ہیں...... میں بھی جیسے زبردستی خود کو گھسیٹ کر رات گئے اپنے کمرے میں گیا جہاں سائرہ دلہن بنی بیٹھی تھی...... کمرے میں جانے سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میں سائرہ کو صاف صاف بتادوں گا کہ وہ اماں کی خواہش پر میری دلہن بنی ہے سو وہ اماں کی خدمت کرے ان کو خوش رکھے...... لیکن مجھ سے کسی صلے کی امید نہ رکھے...... اس قسم کے جملوں کو دل میں ترتیب دیتے ہوئے میں پلنگ پر اس کے پاس بیٹھ گیا...... ابھی میں بات شروع کرنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا کہ سائرہ جو پلنگ کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھی تھی اس کے سر سے سرخ زرتار آنچل ڈھلک گیا......

ارے یہ کیا......؟ مجھے لگا جیسے میں سائرہ کو نہیں...... کسی جنت سے نکلی ہوئی حور کو دیکھ رہا ہوں...... سائرہ کو میں نے ہزار بار دیکھا ہوا تھا...... اچھی خاصی خوبرو لڑکی تھی...... لیکن اس وقت تو اس کا حسن حوروں کو شرما رہا تھا...... لگتا نہیں تھا کہ یہ وہی سیدھی سادی سی سائرہ ہے...... میں تو ساری باتیں بھول گیا...... اور ایک ٹک اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا...... ہوش میں تب آیا جب اس کا نازک سراپا میری بانہوں میں تھا...... اور میں سب کچھ بھول گیا تھا سوائے اس کے کہ یہ پھولوں سے گندھی لڑکی میری بیوی ہے اور میں اس پر پورا پورا اختیار رکھتا ہوں۔

☆☆☆

اس رات نے میری کایا ہی پلٹ دی...... سائرہ نے پہلی رات ہی میرے دل میں براجمان جاوید صدیقی کا بت پاش پاش کردیا تھا اور اب ہر طرف وہ فخر سے دندناتی پھر رہی تھی...... وہ ذرا بھی میری نظروں سے اوجھل ہوتی تو میں آوازیں دے دے کر اس کا ناطقہ بند کردیتا...... اماں میری بے قراریوں پر ہنستی رہتیں...... فیضی ماموں بھی اپنی بیوی کے ساتھ بے حد خوش اور مگن تھے...... میری جاب بھی بہت اچھی جارہی تھی...... اب میں اور اماں دونوں ہی چاہتے تھے کہ الگ گھر میں رہیں لیکن فیضی ماموں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہمیں کہیں نہیں جانے دیں گے کہ وہ بہت عرصے تک ہم سب کے پیچھے بہت ترسے ہیں...... اب وہ بہنوں کے بغیر نہیں رہیں گے۔

''ہاں اگر آپ لوگ اس طرح رہنا نہیں چاہتے تو اس فلیٹ کا کرایہ ففٹی ففٹی کی بنیاد پر دے دیا کریں گے لیکن یہاں سے جانے کی بات آپ بالکل نہ کریں۔''

یہ تجویز سب کو پسند آئی، طے یہ ہوا کہ جب تک ہماری فیملی میں اضافہ نہیں ہوتا ہم سب اکٹھے رہیں گے ہم نے اپنا لاہور والا گھر کرایے پر دے دیا تھا...... فلیٹ کی دنیا محدود سی تھی...... ہمیں تنہائی ملتی بھی تو بس اپنے کمرے میں ملتی...... سو ہم ہر دوسرے تیسرے دن باہر چلے جاتے...... میں اور سائرہ گھومتے، سیر کرتے، شاپنگ کرتے اور باہر سے کھانا کھا کر واپس آجاتے۔

اس دن بھی میں آفس سے لوٹا تو سائرہ جانے کے لیے تیار تھی اسے اپنے لیے چند سوٹوں کے ساتھ میچنگ جوتے لینے تھے...... مارکیٹ میں بہت رش تھا اور اندر جوتوں کی دکان میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی...... لگتا تھا جوتوں پر سیل لگی ہے میں باہر کھڑا رہ گیا...... سائرہ اندر چلی گئی...... میں بے مقصد ہی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا بلاشبہ وہ جاوید صدیقی ہی تھا...... وہ ایک

دکان سے باہر آرہا تھا...... میں یقیناً اس کی نظروں سے چھپ جاتا لیکن مجھے اس کا موقع نہیں ملا...... اس نے مجھے دیکھ لیا تھا وہ لپک کر آیا اور میرے گلے لگ گیا۔

''ارے گھامڑ...... تم کراچی میں ہو اور میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا...... لاہور کا کوئی بازار کوئی مارکیٹ کوئی پلازہ نہیں چھوڑا...... موبائل پر فون کر کے ہار گیا...... غالباً تم نے سم چینج کر لی تھی...... یہ بتا...... اس قدر ناراضی کی وجہ کیا تھی...... میں تو سوچ سوچ کر ہار گیا پر ایسی کوئی وجہ دکھائی نہیں دی۔'' میرے ماتھے پر خفت سے پسینہ آگیا۔ میرے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر جاوید صدیقی مجھے مل گیا تو میں اسے اپنے گریز کی کیا وجہ بتاؤں گا۔

''بول نا...... میں آج تجھے اس طرح نہیں چھوڑوں گا...... بتا......'' اس کے وجیہہ چہرے پر آج نرمی نہیں غصہ تھا...... وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا...... میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کوئی خاص وجہ نہیں تھی...... اماں کراچی جانے پر زور دے رہی تھی...... میں نے سوچا اگر تجھ سے دوستی اسی طرح برقرار رہی تو اماں کی خواہش پوری نہیں ہوسکے گی اس لیے......'' جانے وہ مطمئن ہوا یا نہیں لیکن مجھے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے بولا۔

''آ...... میں تجھے تیری بھابی سے ملاتا ہوں۔'' پھر اس نے کسی لڑکی کو آواز دی۔

''بیلا...... ذرا ادھر تو آنا۔'' ایک گھریلو سی لڑکی جو حسن میں اس کے پاسنگ بھی نہیں تھی ہمارے پاس آئی...... جاوید محبت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ بیلا ہے تمہاری بھابی...... اور بیلا یہ احسن ہے...... میرا بھگوڑا دوست۔'' ہم دونوں نے ایک دوسرے کو آداب کیا تو جاوید سرگوشی میں مجھ سے کہنے لگا۔

''بیلا نے میرے مکان کو گھر بنا دیا ہے...... بس اب تو بھی اپنے مکان کو گھر بنانے کی سوچ۔''

اتنے میں سائرہ جوتوں کے لاتعداد ڈبے اٹھائے شاپ سے باہر آگئی...... مجھے جاوید سے بات کرتے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔

''ارے سائرہ...... آؤ نا......'' میں پہلی بار بشاشت سے جاوید سے کہنے لگا۔

''میں بھی مکان کو گھر بنا چکا ہوں، یہ سائرہ ہے تمہاری بھابی۔'' جاوید حیران سا ہوا...... پھر اس نے سائرہ کو آداب کیا اپنی مسز کا اس سے تعارف کرایا...... جاتے جاتے جاوید نے مجھ سے میرا موبائل نمبر لے لیا اور اپنا نمبر دے دیا...... سائرہ نے انہیں کھانے پر انوائٹ کیا لیکن رات کو ان کی لاہور کی فلائٹ تھی...... جاوید اپنے کسی کام سے دو دن کے لیے آیا تھا...... جاوید چلا گیا...... لیکن آج مجھے اس کے جانے یا آنے سے کوئی سروکار نہیں تھا...... وہ ویسے ہی پہلے کی طرح دلکش تھا لیکن مجھے آج وہ عام سا مرد لگا تھا جیسے مارکیٹ میں اور مرد تھے...... بالکل ان کی طرح... میں نے دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہوئے خود سے کہا۔

فطرت کے قانون کے خلاف اگر بندہ کچھ کر لے تو ذلت وخواری اس کا نصیب بن جاتی ہے۔ اچھا ہے خدا نے مجھے جلدی سنبھال لیا تھا...... سائرہ سے جوتوں کے ڈبے لے کر میں نے دل ہی دل میں کئی بار خدا کا شکر ادا کیا۔



سوگ

ثمینہ عظمت علی

''اچھا! وہ مغل صاحب والوں کا کارڈ لکھ لیا تم نے؟'' امی نے پوچھا۔

''جی۔'' عائشہ نے کہا۔

''اور نورین والوں کا؟''

''جی امی۔'' عائشہ نے کارڈ ٹٹولتے ہوئے نورین والوں کے کارڈ کی تصدیق کی۔

''دیکھو کوئی رہ نہ جائے، خیال رکھنا۔''

''آپ بے فکر رہیں امی۔ اتنی مرتبہ تو لسٹیں

بن چکی ہیں پہلے بھی...... بلکہ ایک مرتبہ تو کارڈ بھی......" عائشہ ذرا افسردہ ہوگئی۔

"بس اب کوئی ایسی ویسی بات نہ کرو۔ اللہ خیر کرے، میری بیٹی کی شادی خیریت سے ہوجائے۔ کرن ہے کہاں؟"

"اپنے کمرے میں لیٹی ہے۔ پارلر سے آکر بہت تھک گئی ہے۔ اتنا وقت لے لیتے ہیں توبہ!" وہ اکتا کر بولی۔

"بس ایک ہی ہفتہ رہ گیا ہے اب۔"

"ہاں۔" عائشہ نے کارڈز سمیٹتے ہوئے کہا۔

"باقی سارے کام پورے ہوگئے ہیں؟" امی نے پوچھا۔

"امی! کام تو ایک عرصے سے مکمل ہیں۔" عائشہ نے جواب دیا۔

"اچھا، چلو اب سویا جائے۔ تم بھی تھک گئی ہو گی۔" انہوں نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں امی...... تھکن کیسی۔" اس نے بشاشت سے جواب دیا۔ "ایک ہی تو بہن ہے میری۔ ابو کب آئیں گے امی؟" اس نے پوچھا۔

"وہ تو اب کل پرسوں ہی آئیں گے۔ وہاں کچھ انتظامات دیکھنے تھے۔ اسد کی کچھ شاپنگ باقی تھی اور تمہارے تایا کی طبیعت بھی کچھ خراب ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔" عائشہ نے جھرجھری لی۔

"ارشد آگیا ہے؟"

"ہاں، امی وہ تو کب سے اپنے کمرے میں بند پڑھ رہا ہے اس کے پیپرز اس قدر نزدیک ہیں۔" عائشہ نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے...... بس کرن کی شادی خیر سے ہو جائے۔ ایک بار اگر...... کم نمبر لے لیے تو کوئی حرج نہیں، ویسے بڑا ذہین ہے میرا بیٹا۔" انہوں نے فخر سے کہا۔

عائشہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور کارڈ سمیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ کرن آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ پلکیں ہولے ہولے سے لرز رہی تھیں۔ اس کے پاس رکھا موبائل ابھی تک چمک رہا تھا اس کے چہرے کی طرح۔

"اسد بھائی سے بات ہوئی ہے!" عائشہ نے چھیڑا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"توبہ ہے، صبر نہیں ہوتا اسد بھائی سے۔"

"صبر؟" کرن نے شکوہ کناں آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی، صبر تو تم لوگوں نے بہت کیا ہے۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو جاتی ہے...... کرن۔" عائشہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟" کرن نے پوچھا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" عائشہ نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ تایا کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی لیکن یہ بات زبان پر لانے سے گریزاں تھی۔

"سو جاؤ، اللہ سب ٹھیک کرے گا۔"

☆☆☆

دروازہ اتنی زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا کہ کرن اور عائشہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"الٰہی خیر۔" دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

دروازے پر امی بوکھلائی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے حیران پریشان ارشد۔ امی نے فوراً کرن کو گلے سے لگا لیا پھر بولیں۔

"بیٹا تمہارے ابو کا فون آیا ہے۔ انہوں نے ہمیں فوراً کراچی بلایا ہے۔"

کرن اور عائشہ کے اوسان خطا ہوگئے۔

"امی! اس وقت...... کیوں؟ خیریت، کیا ہوا ہے......؟" عائشہ چلائی۔

"پتا نہیں، انہوں نے کچھ نہیں بتایا، میں نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو مجھ پر برس پڑے اور کہا بس ارشد کے ساتھ فوراً کراچی پہنچو۔"

کرن نے پریشان ہو کر ارشد کی طرف دیکھا۔ فرسٹ ایئر کا طالب علم...... شہر کے اندر تو ضرور تا وہ گاڑی چلا لیتا تھا لیکن ابو اسے بڑے سفر پر ابھی اجازت نہیں دیتے تھے۔

"کون؟" کرن کے دماغ میں سوال گونجا۔

"تایا؟"

☆☆☆

سپر ہائی وے پر وہ کراچی کی طرف گامزن تھے۔ ارشد ہونٹ بھینچے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ امی مسلسل درود شریف پڑھ رہی تھیں۔ رو رو کر عائشہ کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس نے بڑے دکھی دل کے ساتھ کرن کی طرف دیکھا جو سپاٹ چہرے اور خالی آنکھوں کے ساتھ باہر دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ بھی تھا، یہ تو طے تھا کہ کراچی میں کوئی اچھی خبر اُن کی منتظر نہیں ہے۔

"کرن! میری پیاری بہن اور اسد بھائی میرے اتنے اچھے کزن اور ہونے والے بہنوئی۔" عائشہ سوچ رہی تھی کہ آخر کیا مسئلہ ہے۔ اسد ان کی پھوپی کا بیٹا تھا۔ کرن اور اسد کی منگنی کو آٹھ سال ہو چکے تھے جب کرن نے ایف ایس سی کیا تھا اور اسد بھائی میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں تھے۔ ان کا ایم بی بی ایس مکمل ہوتے ہی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تایا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ پھوپی کی تین بیٹیاں اور اسد بھائی اکلوتے سب کو ان کی شادی کا بے حد ارمان تھا۔ ابھی شادی میں ایک مہینہ باقی تھا کہ پھپھو کی نند کے شوہر کا انتقال ہوگیا اور ان کی شادی ملتوی کر دی گئی۔

"امی شادی چھ ماہ ملتوی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک ماہ آگے کر دیں۔" اسد نے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو اسد! ایک ماہ میں تو اُن کا چہلم بھی نہیں ہوگا اور تمہیں اپنی پھوپی کا خیال نہیں ہے۔ وہ عدت میں ہوں گی اور تم شادی کرو گے؟"

اسد بھی یہ سن کر ذرا شرمندہ ہوگیا۔

"لیکن امی عدت تو چار ماہ اور......" اس نے کہنا چاہا۔

"لو، تو کیا عدت ختم ہونے کے اگلے دن ہی شادی کریں؟" اس کی امی نے اعتراض کیا۔

یوں ان کی شادی چھ ماہ آگے کر دی گئی۔ اسد اور کرن نے زیادہ پروا بھی نہیں کی۔ اسد ہاؤس جاب کر رہا تھا اور کرن کا ماسٹرز ادھورا تھا۔

چھ ماہ بعد ان کی شادی کی تاریخ پھر طے ہوئی۔ آدھی تیاریاں تو پہلے ہی ہو چکی تھیں۔ اب مزید ہونے لگیں۔ شادی کے دن نزدیک آگئے۔ یہاں تک کہ مایوں کا دن آپہنچا۔ عائشہ اور اس کی سہیلیوں نے گھر کو خوب سجایا ہوا تھا کہ تایا کے گھر سے فون آیا کہ دادی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے، انہیں اسپتال لے جایا گیا ہے اور وہ آئی سی یو میں ہیں۔ اس اطلاع کے آدھے گھنٹے بعد ہی دادی کی وفات کی خبر آگئی۔ ساری شادی درہم برہم ہوگئی، کرن جو مایوں بیٹھنے والی تھی روتی دھوتی دادی کے گھر پہنچی۔ ماحول بے حد سوگوار تھا۔

اگلے دن سارے بڑے اکٹھے بیٹھے تھے۔ خاندان کے زیادہ تر مردوں کی رائے تھی کہ مایوں، مہندی وغیرہ چھوڑ کر سوئم کے بعد مقررہ تاریخ پر اسد اور کرن کا نکاح اور رخصتی کر دی جائے۔ تایا بھی رضا مند تھے لیکن کرن کے والد ہاشم صاحب راضی نہ ہوئے۔

''میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں فوراً اپنی بیٹی کی شادی کیسے کر سکتا ہوں؟''

''لیکن نکاح کی تاریخ تو سوئم کے بعد ہی پڑ رہی ہے، شرعی سوگ تو تین دن کا ہوتا ہے۔'' اسد کے والد نے کہا۔

''اچھا! جب اپنی بہن کی عدت کے لیے آپ نے چھ ماہ آگے کی تھی؟'' ہاشم نے طنز کیا۔

''عدت کا معاملہ اور ہے بھائی صاحب! اسد اپنی پھوپو کا بے حد لاڈلا ہے۔ ہم ان کے بغیر کیسے شادی کر لیتے۔'' پھوپا نے کہا۔

''کرن بھی اپنی دادی کی بے حد لاڈلی تھی۔'' انہوں نے کہا۔

''دیکھیں ہم تو لڑکے والے ہیں، ہماری پہلی خوشی ہے لیکن ہم سادگی سے کرنے پر تیار ہیں۔ قربانی تو ہم دے رہے ہیں۔'' پھوپا نے کہا۔

''کیسی قربانی؟'' کرن کے والد بھڑک اٹھے۔ وہ تو پہلے ہی غصے کے تیز تھے۔

اس وقت دیگر لوگوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ کرن بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے ابو اور پھوپا دونوں ہی تیز مزاج کے تھے۔ اسد نے اسے تسلی دی اور نہ گھبرانے کی تلقین کی اور ان کی شادی دادی کے چہلم تک ملتوی کر دی گئی...... گو کہ اسد بھی یہ چاہتا تھا کہ سادگی سے نکاح کر دیا جائے لیکن اس کی ماں، بہنیں بھی اس پر آمادہ نہیں تھیں۔ یہاں تو اسد کی ماں بھی اپنے بھائی کی ہم نوا تھیں اور بہنوں کا اصرار تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بھائی کی شادی سادگی سے نہیں کریں گی۔

دادی کا چہلم ہوتے ہوتے گرمیاں آ گئیں اور شادی مزید دو تین مہینے لیٹ کر دی گئی۔ ابھی گھر والے دوبارہ سے تاریخ طے کرنے کا سوچ رہے تھے کہ اسد کی بہن جس کی شادی کو تین سال ہوئے تھے اس کے شوہر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بعد ڈاکٹرز نے کینسر کا انکشاف کیا جس سے سب سناٹے میں آ گئے۔ اسد کا بہنوئی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے علاج کی ساری تگ و دو اسد کو ہی کرنا تھی۔ وہ دوڑا دوڑا ادھر سے اُدھر ہوتا رہا۔ کراچی، لاہور جا کر شوکت خانم حتیٰ کہ لندن تک جانے کے باوجود کوئی علاج نہ ہو سکا کیونکہ کینسر بہت تیزی سے پھیل چکا تھا۔ حتیٰ کہ کچھ ماہ کے اندر اندر وہ اس دنیا میں نہ رہا۔ اس حادثے اور جوان جہان موت نے سارے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، ہر فرد غمگین تھا۔ کئی دن تو اسی طرح گزر گئے۔

☆☆☆

کرن کے گھر والے بھی صدمے کی حالت میں تھے لیکن کرن کی امی اب چاہتی تھیں کہ سادگی سے ہی کرن کی شادی ہو جائے۔ اب عائشہ کے رشتے بھی آ رہے تھے اور کرن کی شادی بار بار ملتوی ہونے سے ان کو عجیب عجیب وہم ستاتے تھے۔ انہوں نے یونہی ایک دن اپنی نند سے بات چھیڑی۔

''اب کیا ارادہ ہے......اسد کے لیے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کیا، اس کی شادی کا؟''

''تم ہوش میں تو ہو؟'' وہ سخت طیش میں آ گئیں۔

''ابھی نائمہ کے میاں کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟'' ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''مجھے احساس ہے۔'' کرن کی امی نے کہا۔ ''نائمہ ہماری بھی بچی ہے ہمارا دل بھی اس کے غم میں شریک ہے لیکن دیکھیے شادی تو کرنی ہی ہے اور سنت تو نکاح ہے، باقی سب تو معاشرے کی غیر ضروری رسومات ہیں۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔

''ایسی کون سی عمر نکلی جا رہی ہے اسد اور کرن کی؟'' پھپھو نے غصے سے کہا۔ حالانکہ کرن اور نائمہ ہم عمر تھیں۔

''تم بھول گئی ہو اپنا زمانہ، کسی کی موت ہو جاتی تھی تو ہم برسی تک شادیاں کرنا تو کجا غیروں کی شادیوں میں بھی شرکت نہیں کرتے تھے، نئے کپڑے نہیں بنواتے تھے۔''

''لیکن اب شعور اور آگہی بڑھ گئی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ایسا کرنا درست نہیں اور شادیوں پر بے جا ڈھول دھپا بھی ہم نے خود ہی بڑھا لیا ہے۔'' کرن کی امی نے کہا۔

''جو بھی ہو......ایسا گبرو جوان، میری بچی اس عمر میں بیوہ ہو گئی اور میں اپنے بیٹے کی شادی کر دوں؟ برسی سے پہلے تو ہرگز نہیں۔'' نائمہ جو اس گفتگو کے دوران سوگوار سی حالت میں آ بیٹھی تھی بول پڑی۔

''ممانی ٹھیک کہتی ہیں امی، میری قسمت میں جو لکھا تھا ہو گیا۔ اسد کو خوشی سے کیوں دور کر رہی ہیں اور برسی؟'' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''کیا برسی کے بعد میرا غم ختم ہو جائے گا امی؟ ایک سال سوگ منائیں یا دس سال۔ میرے دل پر زخم تو ہمیشہ رہے گا پھر کیا فائدہ دیر کرنے کا......؟''

اسد کو بہن کے صدمے کی وجہ سے خود بھی بے حد

...غمگین تھا لیکن اس کی بھی خواہش تھی کہ شادی سادگی سے ہی ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ گھر میں تبدیلی آئے گی تو گھر پر چھایا ہوا جمود بھی ٹوٹ جائے گا۔ نائمہ اور کرن کی بہت دوستی بھی تھی۔ دونوں ساتھ ہوں گی تو نائمہ کا دل بھی بہل جائے گا لیکن اس کی امی ہرگز راضی نہ ہوئیں اور شادی برسی تک التوا کا شکار ہو گئی۔

☆☆☆

ارشد کا موبائل بجنے سے عائشہ کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ فون اٹینڈ کرتے ہی ارشد کے ہاتھ ڈگمگا گئے اور اس نے زور سے بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ سب نے دیکھا اس کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا! خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ؟“ امی نے کہا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست کا فون تھا۔“ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر ایک نزدیکی ہوٹل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی! آپ، بجو اور آپی کچھ کھا لیں، صبح ایسے ہی نکل آئے۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں...... تم چلو۔“ کرن نے فوراً کہا۔

”آپی!“ اس نے کرن کی طرف دیکھا۔ ”چائے پی لیں آپ کم از کم۔“

انہوں نے گاڑی میں منگوا کر ہی چائے پی۔

”کیا ہو سکتا ہے؟ کیا چھپایا جا رہا ہے؟“ کرن نے چائے پیتے ہوئے سوچا۔ ”تایا کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ ہی اتنے بیمار تھے۔ کچھ دن اور زندہ رہ لیتے۔“ پھر وہ اپنی سفاک سوچ پر خود ہی شرمندہ ہو گئی لیکن شادی اتنی بار ملتوی ہوئی تھی کہ فطری طور پر وہ ایسا سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

”اب پتا نہیں کیا فیصلہ ہو گا؟ تائی کی عدت یا برسی؟“ وہ چائے سے فارغ ہو کر کب سے دوبارہ سفر پر روانہ ہو چکے تھے لیکن وہ اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”اسد کا کیا ری ایکشن ہو گا؟“ اس نے سوچا۔ رات ہی فون پر باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”یار! اس بار بھی شادی نہ ہوئی تو اگلی موت میری ہو گی۔“ کرن اس سے کتنی خفا ہوئی تھی۔ یہ بات کہنے پر اور وہ ہنس ہنس کر معافی مانگتا رہا۔

اسد نے کتنے شوق سے اس سے منگنی کی تھی۔ ہنستا، کھلکھلاتا، خوش مزاج اسد جو اس کے مزاج کے سارے موسموں کا ساتھی تھا۔ جو اس کی بات بن کہے سمجھتا تھا۔ جو اس سے بے حد، بے تحاشا محبت کرتا تھا۔

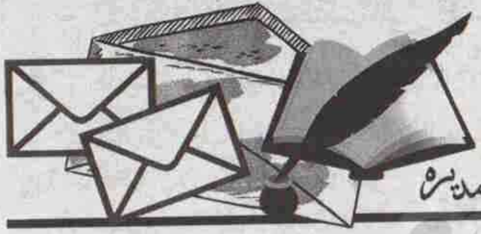
وہ جتنا سوچتی جاتی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوتی جاتی۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو وہ چونک گئی...... لوگوں کا ہجوم سامنے نظر آیا...... لیکن یہ کیا؟ وہ بوکھلا گئی۔ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں...... گاڑی تو پھپو کے گھر کے آگے کھڑی تھی اور سامنے ہی وہیل چیئر پر تایا نظر آ رہے تھے۔

”پھر...... پھپو...... پھوپا؟“ اس کا ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو رہا تھا۔ ارشد نے اسے سہارا دیتے ہوئے نیچے اتارا اور اس سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔

”آپی! رات اسد بھائی کا خوفناک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں چھوڑ گئے آپی!“





بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! آج مجھے آپ کو ایک چھوٹی سی مگر بے حد اہم بات بتانی ہے۔ ہمارے ہاں تقریبات میں خاص طور پر قریبی شادیوں میں ائیں شادی والے گھر میں اپنی جوان بیٹیوں کو پہلے سے رہنے کے لیے بھیج دیتی ہیں کہ وہ وہاں پر رونق کریں گی۔ اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ مائیں اپنے ساتھ اپنی بیٹیوں کو لے کر جا کر رہیں تو اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے مگر براہِ کرم اپنی جوان بیٹیوں کو اکیلے کسی کے گھر بھی مت بھیجیں۔ تھوڑی دیر پہلے میرے پاس ایک ماں کا روتا سسکتا فون آیا ہے کہ کس طرح اس کی بیٹیوں کی عزتیں پامال ہو گئیں اور انہیں پتا بھی نہیں چلا...... یاد رکھیے کہ ہماری بیٹیاں، ہماری سب سے بڑی دولت ہیں اور ان کی ہمیں حفاظت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے، آمین۔ ایک ضروری بات اپنی نئی مصنفات سے بھی کہنی ہے۔ آپ ہمیں فوٹو اسٹیٹ تحریریں ارسال مت کریں۔ افسانے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ حاشیہ چھوڑ کر اور صفحے کی ایک جانب لکھیے۔ اپنا مکمل پتا اور فون نمبر...... آخری صفحے پر ضرور لکھیں تاکہ آپ کو اعزازیہ بروقت بھیجا جا سکے۔

☆ عزیز بہنو! روحانی مشورے کے صفحات میں حتی الامکان بے حد محتاط ہو کر جواب دیتی ہوں مگر بشر ہونے کے ناتے بہت سی غلطیاں مجھ سے بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے اور آپ سب بھی گزشتہ ماہ روحانی مشوروں میں جہیز کی وجہ سے شادی میں تاخیر کے جواب میں سورۃ الغاشیہ، پارہ ۳۰ کی جگہ سورۂ فاشیہ شائع ہو گیا ہے جو غلط ہے۔ اس میں آپ کو آیت نمبر ۸ (آٹھ) پڑھنی ہے۔ جب کہ پاکیزہ میں آیت نمبر ۸۸ شائع ہو گیا جو کہ غلط ہے۔ بہت ساری بہنوں نے مجھ سے فون پر پوچھ لیا تھا مگر بہنوں کی محفل میں اس وجہ سے لکھ رہی ہوں کہ جو نہیں پوچھ سکی ہیں وہ بھی تصحیح کر لیں۔

***

اور آئیے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ ابھی پڑھ لیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لاالہ الا انت سبحنک انی کنت من الظالمین

﴾ مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں ﴿

☆ پاکستان کی معروف سفر نامہ نگار سلمٰی اعوان، لاہور نے اپنی نئی کتاب کے سلسلے میں مالدیپ کا دورہ کیا۔ (ماشاءاللہ)

☆ آپ کی پاکیزہ ڈائری کی انچارج اور شاعرہ عظمٰی آفاق سعید کو مقامی فاؤنڈیشن اسکول کی پرنسپل نے بچوں کو پوئٹری سکھانے کے لیے انوائٹ کیا۔ عظمٰی نے نہ صرف بچوں کو آسان شاعری پر لیکچر دیا بلکہ انہیں عام فہم انداز میں نظمیں لکھنے کا طریقہ بھی بتایا۔ اسکول ہٰذا کی جانب سے عظمٰی کو توصیفی سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ (ماشاءاللہ)

☆ معروف مصنفہ نادیہ جہانگیر خان، آزاد کشمیر ایک پیاری سی بیٹی کی امی جان بن گئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ ہماری معروف مصنفہ رخ چوہدری گزشتہ ماہ پنجاب گئی ہوئی تھیں...... شاید موسم سرما کا ذائقہ چکھنے۔

☆ شاعرہ فریدہ فری لاہور گزشتہ ماہ ایک تقریب میں شرکت کرنے راول پنڈی گئیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق کے بیٹے اویس اور بہو کومل ان دنوں امریکا سے کراچی آئے ہوئے ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ پاکیزہ میں 26 ماہ سلسلے وار چلنے والا ہمارا ناول محبت ہم سفر میری کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ اس ضخیم ناول کے 576 صفحات ہیں اور قیمت صرف پانچ سو روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ۔ چوک اردو بازار، لاہور۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ، افسانہ نگار، تبصرہ نگار سمیرا اشتیاق، دوہا، قطر کا پہلا ناول سورج پر دستک شائع ہوگیا ہے۔ یہ بلند حوصلے کی کہانی ہے۔ صفحات۔ 136۔ قیمت صرف 300 روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ رب پبلشرز، 10 مہر ٹیرس۔ اسٹریٹ۔ 6۔ برنس روڈ، کراچی۔ سمیرا اشتیاق، دوہا، قطر کے حوالے سے دوسری نیوز یہ ہے کہ ان کے ڈیزائن کیے ہوئے عبایا کی کیٹ واک عنقریب کینیڈا میں ہوگی۔ (ماشاء اللہ)

☆ معروف مصنفہ راحت وفا کا ناول جانِ جاں تو جو کہے کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ جس کا انتساب فرحت آرا (مرحومہ) کے نام ہے۔ دلکش اسلوب محبت وفا اور دکھ سکھ میں گندھے ہوئے خوب صورت مکالمے رواں کہانی، صفحات 544 اور قیمت صرف 500 روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس خزینۂ علم و ادب۔ الکریم مارکیٹ۔ اردو بازار، لاہور۔

☆ شازیہ افتخار مصنفہ بھی ہیں اور خوب صورت ٹی وی اینکر بھی۔ ان کی تین کتابوں کو نیشنل بک فاؤنڈیشن سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ فوڈ اسٹریٹ کے ذائقے ان کی مزے داری کتاب ہے۔ جس میں تمام مشرقی کھانوں کی تفصیل...... تصاویر کے ساتھ شامل ہیں کہ یہ کتاب ہر کچن کی ضرورت ہے۔ قیمت صرف 225 روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ ولید پبلی کیشنز E - 5 سول ایوی ایشن اتھارٹی، گلبرگ، 111۔ لاہور۔ فون نمبر: 0345-4171310۔

☆ معروف مصنفہ تانیہ رحمان گزشتہ دنوں لندن سے پشاور آئیں۔ اسلام آباد میں ان کی کتاب ویران ہیں دل کی گلیاں کی تعارفی تقریب ہوئی۔ جسے اردو ادب میں اضافہ قرار دیا گیا۔ ماہنامہ پرواز لندن میں تانیہ کی کتاب کے بارے میں مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ بفضل خدا میرے نواسے محمد ایمان آفاق کا ختم قرآن ہوگیا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور تبصرہ نگار مہ وش سمرن راجپوت، سیالکوٹ کے بھائی ڈاکٹر امجد علی کی شادی عائشہ کے ساتھ گزشتہ ماہ سیالکوٹ میں ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی کی بہن سلمٰی کی شادی گزشتہ دنوں خوب دھوم دھام سے ہوئی۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شہلا نواز نے ہمیں لاہور سے اطلاع دی ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی حیدر علی کے گھر ایسا بینگن نکلا ہے، جس پر اسم مبارک اللہ لکھا ہوا ہے اور بے حد صاف پڑھا جا رہا ہے۔ (سبحان اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار تسنیم رضا ذوالفقار علی، فیصل آباد کے بیٹے اویس علی نے ایف ایس سی کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور بیٹی تحریم علی میڈیکل کے تیسرے سال میں آگئی ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ فریدہ افتخار، پشاور اپنے بچوں کے پاس پہلے دبئی جائیں گی پھر وہاں سے امریکا...... (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار انجم گلزار، کراچی ان دنوں بیمار ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ گزشتہ دنوں بیگم ظفر سلیم ہاشمی کی پیاری بیٹی عائشہ کی شادی سلمان کے ساتھ مغل اعظم فورٹ، لاہور میں ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ افسانہ نگار، مستقل تبصرہ نگار نویدہ تبسم، پشاور کی شادی گزشتہ دنوں پشاور میں ہوئی۔ ایک ماہ بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا چلی جائیں گی۔ (بہت ساری دعائیں)

☆ امینہ عندلیب، سلانوالی تاحال شدید بیمار ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار نسرین لغاری، ٹنڈو باگو نے اپنی سہیلی کے ہاں تقریب میں اپنی پسندیدہ نظم سنائی۔ جس کو سب نے بے حد پسند کیا۔ (ماشاءاللہ)

سالگرہ مبارک

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ریحانہ شہزاد بوزدار، کراچی کی چھوٹی خالہ صنم بلوچ کی اس ماہ سالگرہ ہے۔

☆ ڈاکٹر ناہید ندیم...... اسلام آباد کی اس ماہ سالگرہ ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شگفتہ ملک، علی پور کا چودہ سالہ بھتیجا اسامہ ملک فوت ہوگیا ہے۔

☆ پاکیزہ کے مستقل قاری ریاض احمد فوت ہوگئے۔

نوٹ: مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

* * *

✍ **سلمیٰ اعوان، لاہور سے۔** ''انجم بے حد مبارک باد کہ تم پاکیزہ کو نمبر ون تک لے جانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ بہنوں کی محفل میں اتنے ذوق وشوق سے پڑھتی ہوں جیسے کہ یہ کوئی ناول ہو۔ میری ڈھیر ساری مبارک باد عمیرہ احمد کو پہنچا دو...... یہ لڑکی کیا غضب کا لکھتی ہے۔ حقیقتاً افسانے، ناول کی بُنت سے بخوبی آگاہ ہے۔ بہت ہی اچھا ناول ہے عمیرہ کا۔ اس مرتبہ نمرہ احمد، عتیقہ محمد بیگ، رخ چوہدری، عنیزہ سید، سکینہ فرخ کی تحریریں دل کو چھو گئیں۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول دیکھ کر دل کو بے حد خوشی ہوئی۔ ناہید بھی اے ون رائٹر ہیں۔ ہاں تمہارا کانچ سی لڑکی بھی پڑھ کر تو میں بہت ہنسی......'' (پسندیدگی کا شکریہ۔ پاکیزہ کی کامیابی، پسندیدگی میں اللہ کے کرم کے بعد سارا کریڈٹ میری مصنفات کا ہے جو بے حد دل کے ساتھ پاکیزہ کے لیے لکھتی ہیں اور اس میں سینئر مصنفات کے ساتھ ساتھ نئی مصنفات بھی شامل ہیں)

✍ **اقبال بانو، ویہاڑی سے۔** ''جنوری کا پاکیزہ اداریے سے شروع کیا اور تمہارا یہ جملہ 2011ء یوں گزر گیا جیسے تیز ہوا کا کوئی جھکڑ...... دل کو چھو گیا، ذیشان رسول کی تصویر بے حد پسند آئی اور دیگر لوگوں کی بھی...... اور پھولوں بھری تقریب واقعی پھولوں بھری تھی پڑھ کر مسحور سی ہو گئی...... اس کے بعد جلترنگ پڑھا۔ اس ماہ کا جلترنگ واقعی اسپیشل لگا۔ سب سے پہلے عنیزہ سید کا افسانہ پڑھا بے حد اچھا لگا۔ کانچ سی لڑکی اچھا ناولٹ ہے جس میں سسپنس بھی ہے اور موضوع بھی ندرت لیے ہوئے ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کے ناول کی پہلی قسط اچھی تھی یوں بھی وہ منظر نگاری کی ماہر ہیں۔ نمرہ احمد نے بھی اچھا لکھا اور دیگر تحریریں بھی پسند آئیں۔'' (نوازش)

✍ **نادیہ جہانگیر، آزاد کشمیر سے۔** ''انجم آپا آپ تو مجھے نہیں جانتیں مگر میرا اور آپ کا رشتہ بہت پرانا اور بہت پکا ہے میری طرف سے۔ میں بچپن سے آپ کو پڑھتی آ رہی ہوں اور اسی نسبت سے آپ سے محبت بھی انتہا کی ہے اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی میں آپ سے بات کر سکوں گی، آپ کی آواز سن سکوں گی مگر اب جب پچھلے ماہ آپ سے بات کی اور آپ کی آواز سنی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی سچ کہہ رہی ہوں آپا میں بہت سے رسالوں میں کئی سالوں سے لکھ رہی ہوں مگر بے قاعدگی سے کہ وقت بہت کم ہوتا ہے میرے پاس۔ پاکیزہ میں بھی لکھنے کا سوچتی تو تھی مگر اپنی ازلی سستی اور ٹائم نہ ہونے کی وجہ سے صرف سوچتی ہی تھی کبھی عمل نہ کر پائی مگر اس بار تو ہمت ایسی کی کہ ایک افسانہ لکھ ہی ڈالا اسپیشل پاکیزہ کے لیے۔ آپا میرا تعلق آزاد کشمیر کے ایک چھوٹے سے مگر پیارے سے گاؤں ''مومبر'' سے ہے۔ ناولز، ناولٹ اور افسانوں کے علاوہ اسکرپٹ لکھنے کی طرف بھی آ چکی ہوں۔ آپا میں میرڈ ہوں، تین بچوں کی ماما جانی بھی ہوں۔ آپا میں اور میری بہن ثوبیہ جہانگیر (مرحومہ) آپ سے بہت محبت کرتی تھیں آپ کا لکھا ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے، ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے آپ سے...... سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کچھ کہہ دوں باتیں بہت، الفاظ کم اور جذبات کا تو مت پوچھیں۔'' (پیاری نادیہ اس محفل میں خوش آمدید، تمہارے آنے کی مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے، آمین)

✍ **ذکیہ ایوب، کراچی سے۔** ''اداریہ پڑھ کر اپنے آپ سے وعدہ کیا۔ نئے سال کا جلترنگ پڑھ کر

بہت ہنسی آئی۔ قیصرہ حیات بہت اچھے انداز میں اسمائے محمد ﷺ کے بارے میں لکھ رہی ہیں' جزاک اللہ عمیرہ احمد ویل ڈن، عکس زبردست جا رہا ہے۔ چڑیا ہی عکس ہوگی۔ ناہید سلطانہ ہمیں پسند ہیں، ان کے نئے ناول کا تعارف تو اچھا ہے۔ ثمینہ عظمت علی کی تراکیب پڑھنے کی حد تک مزے کی تھی۔ رخ چوہدری نے بھی گھر کا سکون لوٹا دیا۔ عنیزہ سید کو دیکھ کر خوشی ہوئی اور ان کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ رضوانہ پرنس کا اگر بھی اچھا رہا...... سکینہ فرخ نے مارننگ شو کی صحیح عکاسی کی ہے اور پھر نظریں آ گئیں...... کانچ سی لڑکی پر بہت اچھی تحریر ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے قلم میں مزید طاقت دے...... پڑھتے ہوئے قسط بہت جلد ختم ہو گئی۔ راحت وفا کی کہانی تھوڑی سی آگے بڑھی ہے...... عتیقہ اور عظمیٰ افتخار کے افسانے مناسب تھے۔ نمرہ احمد کا ناولٹ...... جھوٹی تہمت کے حوالے سے تھا...... پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر سب سے زیادہ سزا کا مستحق رضا تھا...... پھولوں والی تقریب کا احوال بہت اچھا تھا...... عظمیٰ کی بیٹی اجیہ آفاق تو بہت لمبی ہو گئی ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ اجیہ ابھی صرف تیرہ سال کی ہیں...... تو پانچ فٹ سات انچ ہے، میں تو دعا مانگتی ہوں کہ اب قد اور نہ بڑھے)

✉ افشاں قریشی، شکار پور۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا، کہاں غائب ہو گئیں۔

✉ صدف جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ۔ شیریں حیدر کا ناول خصوصی طور پر پسند کرنے کا شکریہ اور ہمارا ناولٹ بھی' آپ کی شاعری جان دار ہے۔ حوصلہ افزائی ضرور ہوگی۔

✉ ڈاکٹر زاہدہ پروین، لاہور۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے اپنے خط میں لیکوریا کے بارے میں لکھا ہے اگر آپ اس کو ایک مضمون کی شکل میں لکھ کر بھیجیں تو اسے ہم شکریے کے ساتھ پاکیزہ میں شائع کر دیں گے۔ ہاں آپ کو ہماری ساڑی والی تصویر پسند نہیں آئی تو سچی بات یہ ہے کہ ہمیں بھی اچھی نہیں لگی۔ آپ کے مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں تو عنایت ہوگی۔

✍ **مسز سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔** ''اس ماہ کے شمارے میں پڑھنے کا میٹریل زیادہ ملا۔ ناہید سلطانہ اختر کے ناول کی قسط اچھی تھی۔ عکس تو ہے ہی بہت مقبول ناول...... کانچ سی لڑکی کی دوسری قسط پہلے کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگی۔ نمرہ احمد، عنیزہ سید، سکینہ فرخ کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ عابدہ خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ ڈاکٹر ضیا کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عظمیٰ آفاق کی تحریر مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ ان سے کہنا ہے کہ بے شک مختصر سا سہی مگر اپنا کوئی افسانہ ضرور دیں۔ سالِ نو کا جلترنگ بہت عمدہ رہا۔'' (نوازش)

✍ **ثمینہ وحید، پنجاب سے۔** ''سب سے پہلے میری مبارک باد عذرا باجی کو بیٹا حاجی بن گیا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ آپ نے ذیشان کے چھ ماہ سے آج تک کا احوال بے حد سادہ اور بڑے محبت بھرے انداز میں یوں کھینچا ہے کہ ہمیں یوں لگا ہے کہ جیسے ہم کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ کتنی بار یہ مضمون پڑھا...... شاید میں آپ کو تعداد بتا بھی نہ سکوں...... پاکیزہ میرا، میرے خاندان، میرے احباب کا پسندیدہ ماہنامہ ہے۔ اچھے ناول، ناولٹ، افسانے تو بہت سی جگہ پڑھنے کو مل جاتے ہیں مگر انجم انصار آپ کے پیار کی خوشبو اس میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہے جو کہیں نہیں ہے۔'' (پیاری ثمینہ...... محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوا کرتی ہے۔ یہ آپ کی محبت ہے جو آپ کو پاکیزہ کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی ہے۔ آپ یقین کیجیے مجھے بھی آپ سے ایسی ہی محبت ہے جیسی آپ بہنوں کو مجھ سے ہے۔ ہاں عذرا رسول...... خیر مبارک کہہ رہی ہیں)

✍ زبیدہ حبیب، لاہور سے۔ ''اس ماہ کتابت کی غلطیاں کافی نظر آئیں۔ نمرہ احمد، عنیقہ محمد کی آمد اچھی لگی۔ بہت عرصے بعد عنیزہ سید اور رخ چوہدری کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میری فرمائش ہے کہ آپ ناہید انصاری کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔ کانچ سی لڑکی ایک نئے سے موضوع پر ناولٹ لگ رہا ہے اور پسند آرہا ہے عکس نمبر ون جارہا ہے۔'' (شکریہ)

✍ مسز رانا، اسلام آباد سے۔ ''ان دنوں امریکا سے اسلام آباد آئی ہوں ہوں۔ عمیر اور ثمینہ کی شادی کا احوال پسند آیا۔ ذیشان کی پھولوں بھری تقریب کا احوال پڑھ کر یوں لگا جیسے میں نے بھی اس میں شرکت کرلی ہو۔ جولائی میں میرا کراچی آنے کا ارادہ ہے۔ کیا آپ سے ملاقات ہوسکے گی؟'' (جی ضرور)

✍ ندرت، کراچی سے۔ ''میں اپنی بہنوں کو ایک کارآمد بات بتانا چاہتی ہوں۔ گھر میں اکثر خواتین اور بچے جل جاتے ہیں مجھے ایک مقامی کلینک کی ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ جسم کا جل جانے والا متاثرہ حصہ سادہ پانی میں آدھے گھنٹے تک رکھیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر کو بھی ضرور دکھائیں مگر اس طریقے سے آپ کو ابتدائی طبی امداد مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر پریشانی سے ہمیشہ بچا کر رکھے۔'' (بالکل، اللہ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے)

✍ شکیلہ قمر، سندھ سے۔ ''پاکیزہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میری پسندیدگی کی وجہ اس کی بہنوں کی محفل ہے۔ افسانے، ناول پڑھنے سے بھی دلچسپی ہے مگر بہنوں کی محفل سرِ فہرست ہے۔ آج آپ بہنوں سے ایک بات معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ بعض بیماریاں شیطانی ہوتی ہیں۔ جس میں 'ذات الجنب' بھی شیطانی بیماری ہے۔ کیا کوئی قاری بہن اس بارے میں مجھے بتاسکے گی کہ یہ کون سی بیماری ہے اور اس کی کیا علامات ہوتی ہیں۔'' (بہنیں توجہ دیں)

✉ سیدہ بشریٰ عباس نقوی، سرجانی، کراچی۔ خوش آمدید۔ آپ نے بہ عنوان الوداع ایک بہت خوب صورت نظم ہمیں بھیجی ہے۔ اس میں شاعر کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے جو خوب صورت سی دلہن کی تصویر بھیجی ہے۔ اس کا نام بھی نہیں لکھا ہے۔ آپ کی تحریر ہمارے پاس محفوظ ہے۔ آپ بے شک ہمیں فون پر یہ دونوں باتیں بتادیں۔ شکریہ

✍ مہوش مشتعل، احمد پور شرقیہ سے۔ ''کانچ سی لڑکی بے حد پسند آئی۔ آپ کا اندازِ تحریر دل کو چھو لیتا ہے۔ میری بہن کو بھی آپ کی کہانی پسند آتی ہے۔ گزشتہ دنوں میرا بھتیجا ہوا ہے۔ جس کا نام ارسلان خضر رکھا گیا ہے۔ عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ اختر کو میری مبارک باد پہنچادیں۔ ہاں ایک بات پوچھنی تھی کیا نمرہ احمد ہماری عمیرہ احمد کی بہن ہیں (نہیں) یہ دونوں ہی بے حد اچھا لکھتی ہیں اور مجھے ان دونوں کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔'' (بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... یہ ہماری مایہ ناز مصنفات ہیں)

✍ زاہدہ اشرف، راول پنڈی سے۔ ''سب سے پہلے میں پاکیزہ کا اداریہ پڑھتی ہوں، آپ کی مثبت سوچ سامنے آتی ہے اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ انجم باجی آپ ہماری مبارک باد عمیرہ احمد تک پہنچادیں۔ ہمیں ان کا ناول عکس بہت بہت اچھا لگ رہا ہے۔ نمرہ احمد نے حد بھی بہترین لکھا۔ کانچ سی لڑکی کی قسط بھی پسند آئی مگر اس ماہ آپ نے جلترنگ لکھ کر ہم سب کو خوب ہی ہنسنے پر مجبور کردیا ہے۔'' (پیاری زاہدہ اس محفل میں خوش آمدید...... تبصرے کے لیے ممنون ہوں، ہاں عمیرہ احمد شکریہ کہہ رہی ہیں)

✍ مسز نزہت اشفاق، نارتھ کراچی سے۔ ''اس ماہ بھی عمیرہ احمد کے ناول عکس کی قسط سپرہٹ رہی۔ ناہید سلطانہ اختر کے ناول کی پہلی قسط تعارفی تھی مگر اچھی تھی۔ کانچ سی لڑکی کے ناولٹ کا اسلوب پُر اثر ہے۔ موضوع نیا ہے...... اور قسط ختم ہوئی تو بے چینی بڑھ گئی۔ عنیزہ سید کا افسانہ پسند آیا۔ عنیقہ محمد بیگ نے اچھا لکھا مگر نمرہ احمد نے مشاعرہ لوٹ لیا...... پڑھ کر مزہ آگیا۔ سکینہ فرخ نے بھی اچھا لکھا...... ایسی دلہن...... کیا ہوتی ہیں؟'' (اب ہر طرح کی دلہنیں ہیں)

✍ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ''جنوری کا پاکیزہ بہترین تھا۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ جلترنگ کا خصوصی خاکہ مجھے تو اتنا اچھا لگا کہ دل چاہا...... کہ اسے کوئی پروڈیوسر ٹی وی کے لیے ڈراما بنالے تو ففٹی ففٹی کا ریکارڈ توڑ دے گا۔ عمیرہ احمد کا ناول عکس اتنا اچھا ہے کہ دل چاہ رہا ہے ان کے ہاتھ چوم لوں۔ میری جانب سے گلاب کے دو ٹوکرے ان تک پہنچادیں (صرف ٹوکرے بس......) اس ماہ کئی نئی رائٹرز نے پاکیزہ میں لکھا ہے کہ وہ نئی نہیں ہیں مگر پاکیزہ کے لیے نئی ہیں مگر ان سب نے بہت اچھا لکھا ہے۔'' (جی ہاں...... ہماری تمام مصنفات نے جنوری کے شمارے............ کے لیے بے حد عمدہ لکھا ہے۔ رہی ہمارے جلترنگ کو ٹی وی پر شوٹ کروانے کی بات تو دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں ہی پروڈیوسر بنادے...... تاکہ ہمارے خاکے ٹی وی پر تو آسکیں گے)

✍ زاہدہ عالم، کراچی سے۔ ''پھولوں بھری تقریب میں پھول سے چہروں کا ذکر تھا۔ ہماری جانب سے بے حد مبارک باد...... عمیرہ احمد کا ناول پڑھ کر مزہ آرہا ہے تو کانچ سی لڑکی بھی ہماری پوری توجہ لیے ہوئے ہے۔ باجی آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ اسے کسی اچھے سے چینل پر دیجیے گا۔ میمونہ خورشید علی کا چاندسی ناولٹ کتنا اچھا تھا...... مگر اس کا بنا ہوا سیریل اتنا اچھا نہیں لگا جتنا کہ ڈائجسٹ میں پڑھ کر اچھا لگا تھا۔ ہاں نمرہ احمد کا مکمل ناول حد پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ تمام مستقل سلسلے بھی بہت پسند آئے۔'' (شکریہ)

✍ ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس سے۔ ''میں اپنی دعاؤں میں باجی آپ کے لیے پاکیزہ کے لیے، پاکیزہ کے تمام اراکین کے لیے، تمام مصنفات کے لیے اور اس کے تمام قارئین کے لیے ہمہ وقت دعا گو رہتی ہوں کہ تحریر کے ذریعے ہمارا سب سے ہی رشتہ ہے۔ کانچ سی لڑکی بہت خوب صورت ناولٹ ہے۔ آپ کا لکھنے کا طریقہ اتنا سادہ اور دلنشین ہے کہ مکالمے دل پر اثر کرتے ہیں۔ ذیشان رسول کے بچپن سے لے کر اب تک کا احوال اچھا لگا۔ تصویریں .... بھی پسند آئیں۔ ماشاء اللہ ذیشان بہت پیارا بچہ ہے۔ عذرا باجی کو اللہ ان کی خوشیاں دکھائے۔'' (آمین)

✍ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ''ان دنوں اپنی فیملی کی شادیوں میں مصروف ہوں ورنہ مجھے کراچی آنا تھا۔ آپ سے ملنے کی بے حد خواہش بھی ہے۔ جنوری کا پاکیزہ کسی طرح بھی سالنامے سے کم نہ تھا۔ نمرہ احمد کی آمد اچھی لگی...... اور بے حد نازک مسئلے پر بہت اچھی طرح انہوں نے لکھا۔ عمیرہ احمد تو ہیں ہی ہماری فیورٹ ...... ان کو ہمارا سلام کہیے گا...... کانچ سی لڑکی آپ کے سابقہ ناولوں سے آگے جارہا ہے۔ بہت اچھے انداز میں آپ اس کو لے کر چل رہی ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر، عنیزہ سید، رضوانہ پرنس اور سکینہ فرخ کی تحریریں بھی بے حد عمدہ تھیں۔ ہاں بہنوں کی فیس بک تو کسی مقابلے میں شامل ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ تو ہے ہی نمبر

ون۔'' (پسندیدگی کا شکریہ، ہاں عمیرہ احمد آپ کو سلام کہتی ہیں)

✍ دھنک علی، اسلام آباد سے۔ ''جنوری کے پاکیزہ میں عمیرہ احمد کا عکس پڑھا، اے ون رہا۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ شیریں حیدر کی ناول کی قسط بھی پسند آئی اور کانچ سی لڑکی بھی اچھا لگا۔ مجھے افسانوں کے مقابلوں میں سلسلے وار ناول زیادہ اچھے لگے اور یہ تینوں ناول مجھے بے حد پسند آئے ہیں۔ والدہ کی بیماری اور پھر ان کے انتقال کے بعد میں بہت عرصے کے بعد اپنی رائے دے رہی ہوں۔ پاکیزہ ماشاءاللہ ہر ماہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا ہے۔'' (شکریہ)

✍ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال کراچی سے۔ ''دین کی باتیں اور قیصرہ حیات کی تشریح بصیرت افروز تھی۔ عکس بہت اچھا جا رہا ہے۔ چڑیا کے ساتھ بہت برا ہوا مگر یہ تلخ حقیقتیں ہیں خیال آیا تھا کہ کاش ڈی سی کی نقاب کشائی ہو اب لگتا ہے یہ ہونے جا رہا ہے۔ ہم کہاں کے دانا تھے گوارا تحریر تھا۔ زندگی کی پہلی قسط ہے لگتا ہے مسائلِ زندگی پر مبنی ایک اچھی تحریر ہوگی۔ ثمینہ عظمت علی اچھا لکھ رہی ہیں۔ مہرباں کیسے کیسے دلچسپ تحریر تھی۔ انجم بہت اچھا لکھ رہی ہو۔ کانچ سی لڑکی کی دوسری قسط زبردست ہے۔ شیشوں کا مسیحا بھی روز بروز نکھر رہا ہے۔ البتہ رانی کی والدہ کی بے پروائی ذرا عجیب ہے۔ محبت جی کے دیکھو اور گو یم مشکل گوارا کہانیاں ہیں۔ رضوانہ پرنس کی اگر اچھی تھی۔ واقعی ایک اگر سے کتنا فرق پڑتا جاتا ہے۔ نمرہ احمد کی حد غیر حقیقی سی لگی۔ سکینہ فرخ کی ہلکی پھلکی تحریر دلچسپ تھی مگر ایک رات کی دلہن کچھ زیادہ ہی بے باک تھی۔ ایک تھی نیناں یہ قسط پڑھ کر لگا کہ یہ عجیب و غریب قسم کی محبتیں جو اُن کے کردار کر رہے ہیں موروثی بیماری ہے، رابعہ جی نے تو حد ہی کر دی۔ آوارہ رکھوالا... سبق آموز تحریر ہے۔ بہنوں کی محفل اپنے منفرد انداز میں شروع ہوئی مصنفات اور قارئین کی مصروفیات سے آگاہی ہوئی۔ جن کو خوشیاں ملی ہیں اللہ تعالیٰ اور خوشیاں دکھائے، آمین۔ جن کے پیارے بچھڑ گئے ان کے لیے صبر کی دعا اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت۔ عمیرہ کے ناول کو ٹی وی کے لیے لیا گیا ہے یہ جان کر اچھا لگا ساتھ یہ بھی خیال آیا کہ کون سا چینل ایک ڈی سی کے اس کردار کو ٹی وی پر دکھائے گا؟ تبصرے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ جو شکایت ہمیں عالیہ بہن سے ہوئی وہ اکثر قارئین کو ہوئی۔ اتنے اچھے ناول کے انجام کے ساتھ عالیہ نے کچھ اچھا نہیں کیا...... تمہاری بھابی نے واقعی عمیر اور ثمینہ کی شادی کی بہت اچھی کوریج کی...... شگفتہ شفیق کو کامیابی مبارک۔ پھولوں بھری تقریب کی مہک ابھی تک تازہ ہے۔ اس محفل میں شریک ہو کر بہت خوشی ہوئی سادہ اور پُرخلوص لوگوں سے ملاقات کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔ ذیشان کے بچپن سے اب تک کے سفر کا بہت اچھا بیان کیا تم نے۔ اللہ اس کو والدین کے زیرِ سایہ دین و دنیا کی خوشیاں دکھائے، آمین۔ عذرا ان کی بھابیاں اور آپ جس طرح مہمانوں کا خیال رکھ رہی تھیں اس کا بے حد شکریہ، خاص کر نزہت نے تو بہت ہی خیال رکھا اسی لیے ہم نے بھی حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر اپنی آئسکریم میں سے انہیں ایک چمچ کھلا دیا۔ اس دفعہ کا جلترنگ بہت اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری اور دیگر سلسلے بھی۔'' (شکریہ)

✍ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ''خوب صورت شمارہ ہاتھ میں لیتے ہی ختم کرنے کے بعد رکھا ہے کہ اس میں خوب صورت افسانوں کی برکھا برس رہی تھی اور ان افسانوں، ناولٹ اور سلسلے وار ناولوں میں ہمیں سب سے زیادہ اچھے عکس، زندگی، کانچ سی لڑکی اور اگر لگے۔ مجھے کچھ کہنا ہے بے حد پسند آیا۔ پھولوں بھری تقریب

میں ذیشان بہت اچھے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان کا حج قبول فرمائے...... تصاویر اور احوال دونوں ہی اچھے لگے۔ پاکیزہ ڈائری بہت اچھی تھی۔ جلترنگ بہت زیادہ پسند آیا۔'' (شکریہ)

✍ گلفام بی بی، مالاکنڈ ایجنسی خیبر پختونخواہ سے۔ ''میں ایک دور افتادہ مقام سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ یہ میری پہلی کوشش ہے اور اگر آپ نے حوصلہ افزائی نہ فرمائی تو آخری بھی ہو سکتی ہے۔ پیاری آپی میں بہت بچپن سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ جب کسی سہیلی سے کوئی پرانا شمارہ مل جاتا تو میں پڑھ لیتی تھی چوری چھپے کیونکہ ہمارے گھر کا ماحول بہت سخت تھا۔ لڑکیوں کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور اکثر ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ان کی زندگی اجیرن کر دی جاتی تھی۔ میں نے بھی زندگی زندہ درگور ہو کر گزاری ہے۔ کچھ تقدیر نے اتنے زخم دیے کہ جسم اور روح لہولہان ہو گئے اور کچھ لوگوں نے سنگ باری کی۔ پیاری آپی اس بھری پُری دنیا میں، میں اکیلی اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ جی رہی ہوں۔ میرے حالات اجازت نہیں دیتے لیکن پھر بھی میں پاکیزہ خرید کر ہر ماہ پڑھتی ہوں۔ مجھے اس کے سارے سلسلے پسند ہیں لیکن خاص کر بہنوں کی محفل میں پہنچ کر میں بھی اپنے آپ کو اس کا حصہ سمجھنے لگتی ہوں۔ ساری رائٹرز بہنیں مجھے بنا دیکھے ہی اپنی سی لگتی ہیں اور آپ سے تو مجھے بے پناہ عقیدت ہے۔ آپی اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی زندگی کی کہانی لکھ کر آپ کو بھیج دوں اگر آپ کو مناسب لگے تو آپ اسے اپنے الفاظ میں ڈھال کر شائع کروائیں۔ میرا دل تو بہت کچھ چاہتا ہے کرنے کو لیکن نہ مناسب ماحول ملا اور نہ کبھی کسی نے حوصلہ افزائی کی۔ جس کی وجہ سے میں احساسِ کمتری کا شکار رہی ہوں۔'' (گلفام بی بی، خوش آمدید۔ اپنی کہانی آپ لکھ کر مجھے بھیجیں میں پہلے اسے پڑھ لوں پھر بتاؤں گی۔ ہاں، آپ کی حوصلہ افزائی لازمی ہوگی)

✍ سیدہ رقیعہ ابدالی، نارتھ کراچی سے۔ ''سلسلے وار ناول تینوں ہی اچھے جا رہے ہیں۔ نیا سلسلے وار ناول زندگی بہت اچھا لگا گھریلو انداز کے لکھے ہوئے ناول نے دل موہ لیا ویسے بھی ناہید سلطانہ اختر کے لیے یہی کہنا بہت ہے کہ نام ہی کافی ہے۔ ناولٹ دونوں ہی بہت زبردست ہیں ویسے یہ نمرہ احمد کیا عمیرہ احمد کی بہن ہیں۔ افسانوں میں عظمیٰ سید افتخار کی تحریر نے آنکھیں پُرنم کر دیں۔ ثمینہ عظمت علی کا افسانہ پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ رخ چوہدری نے بہت خوب صورت افسانہ لکھا اس کا اینڈ بہت پسند آیا۔ رضوانہ پرنس کے افسانے نے آخر میں چونکا دیا۔ عنیزہ سید نے بھی اچھا لکھا۔ سکینہ فرخ کا افسانہ گڈ مارننگ بیڈ مارننگ پڑھ کر بے حد لطف آیا مگر ہم نے تو ایسی دلہن کہیں نہیں دیکھی ہے۔ عتیقہ محمد بیگ کا آوارہ رکھوالا بہت مزے کا تھا، اس ماہ کی یہ سب سے بہترین تحریر تھی۔ پھولوں بھری تقریب پڑھ کر ہم پھول کی طرح کھل گئے۔ تصویریں دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ ماشاءاللہ اجیہ آفاق نے تو اپنی امی سے بھی زیادہ ہائٹ نکالی ہے۔ اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔ (آمین) یادوں کی پٹاری کھلی تو ہم اس میں گم ہو گئے۔ جلترنگ میں نئے سال کے پہلے دن پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح شاندار سجی تھی۔ یہ محفل ہمیشہ ہی دل موہ لیتی ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں رفاقت جاوید سے ملاقات اچھی لگی۔'' (شکریہ)

✍ نور جہاں نقوی، سرجانی کراچی سے۔ ''ہم پاکیزہ کے بہت پرانے قاری ہیں جب سے پاکیزہ اسٹارٹ ہوا تب سے لے کر اب تک کوئی ایسا ماہ نہ ہوگا جب پاکیزہ مجھ سے دور ہوا ہو۔ جب شادی ہوئی پھر

ماں اور اب تو انجم ہم نانی، دادی بن گئے اب جا کے فرصت ملی تو دل نے کہا چلو ہم بھی پاکیزہ میں کچھ لکھتے ہیں شاید ہماری شرکت قبول فرمائی جائے۔ جی انجم بیٹا میں سیدہ شفق عامر زیدی کی والدہ ہوں۔ دو بچوں کے بعد وہ بہت مصروف ہوگئی ہے۔ ہر ماہ تبصرہ لکھ کر رکھتی ہے مگر پوسٹ کرنا بھول جاتی ہے۔ پاکیزہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے ہمارا پاکیزہ ہمارے گھر والوں کے لیے دوسری ماں کی طرح ہے جو لڑکیوں کو خود ہی اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے ان کو پتا چل جاتا ہے کہ دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ اللہ تم سب کو خوب ترقی دے۔" (نور جہاں اس محفل میں خوش آمدید، آپ ہر ماہ اس محفل میں شرکت کیجیے، مجھے خوشی ہوگی)

رفعت مبین رفی، کراچی سے۔ "اپنا نام پاکیزہ میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ کا ناولٹ کانچ سی لڑکی اور نمرہ کا حد دونوں بہت لاجواب ہیں۔ شیریں حیدر کا ناول بھی اچھا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا ان کے ناول ہوا کرتے ہیں۔ افسانہ آوارہ رکھوالا بہت اچھا لگا۔ ہم کہاں کے دانا تھے، اچھا ہے۔ محبت جی کے دیکھو بہت مزیدار لگا اکثر گھروں میں اگر لڑکے اپنی پسند سے شادی کرتے ہیں تو یہی سچویشن ہوتی ہے۔ عنیزہ سید کا گویم مشکل بھی بہت اچھا لگا۔ رضوانہ پرنس کا اگر لاجواب تھا۔ نئے سال کی ابتدا کے سلسلے میں روحانی مشورے بہت خوب بہترین جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔" (شکریہ)

مہناز کرن، پشاور شہر سے۔ "خوشبو کا سفر ایک بہترین ناول تھا عالیہ جی کو مبارک باد۔ آنٹی معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ کچھ عرصے سے بہنوں کی محفل میں تنقید برائے تنقید ہونے لگی ہے۔ خوشبو کا سفر کے بارے میں اکثریت کی رائے پڑھ کر افسوس ہوتا تھا۔ رائٹرز کے ذہن میں جو پلاٹ ہوتا ہے وہ اسی کے مطابق کہانی کو رواں رکھتے ہیں نا مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم رائٹرز سے ناول لکھوا رہے ہوں۔ ایک تھی نیناں پر بھی اس قدر اعتراضات، بھئی جس کو پسند نہیں وہ نہ پڑھے، اچھا خاصا ناول ہے مگر...... بہنوں سے درخواست ہے کہ پلیز رائٹرز کی دل شکنی نہ کریں کہ لکھنے والے "وکھرے" ہی لوگ ہوتے ہیں جو شیشے جیسا دل رکھتے ہیں۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

یاسمین کنول راجپوت، پسرور ضلع سیالکوٹ سے۔ "کانچ سی لڑکی نے بے حد متاثر کیا افسانوں میں محبت جی کے دیکھو بہترین افسانہ تھا۔ عکس اور زندگی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، ایک تھی نیناں بھی اچھے ہیں، ان چاروں سلسلے وار ناول کو پڑھنے کے لیے اگلے شماروں کا انتظار کیا جاتا ہے میں تو صرف رسالہ لاتی ہوں میری بہنیں اور بچیاں قبضہ کر لیتی ہیں اور اپنی اپنی پسند کی کہانیاں پڑھنے بیٹھ جاتی ہیں۔ میں مصروفیات کی بنا پر بروقت کہانی نہیں پڑھتی بعد میں جب وقت ملتا ہے تب دیکھتی ہوں، پانچ بچوں کی ماں جو جاب بھی کرتی ہو، اس کے پاس کتنا ٹائم ہوتا ہے آپ بہتر جانتی ہیں۔ اجیہ آفاق کی تصویر دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی، عظمیٰ سے بھی لمبی ہوگئی ہے اس کی بیٹی اللہ نظر بد سے بچائے، بڑی پیاری ہے۔ پھولوں بھری تقریب اور یادوں کی پٹاری، بہترین تحریریں ہیں۔ عذرا رسول صاحبہ بڑی خوش قسمت ہیں اتنا لائق بیٹا ملا۔ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز فرمائے اور ماں کو اس کی خوشیاں دکھائے۔ (آمین ثم آمین) 1995ء کی پٹاری بڑی مزیدار تھی، اسی سال میں نے ایم اے کا امتحان دیا تھا اور اسی سال میری شادی ہوئی تھی۔" (اپنی شادی کی اور پاس ہونے کی ایک بار پھر مبارک باد۔ ہاں شادی کی سالگرہ خوب ٹھاٹ سے منایا کرو)

فاطمہ ڈسکہ سے۔ "پاکیزہ ڈائجسٹ ملا، بہت شاندار لگا جلترنگ بہت مزے کا تھا۔ عمیرہ احمد کی قسط بہت اچھی لگی، عتیقہ محمد اور نمرہ احمد کا اضافہ بہت اچھا لگا۔ عتیقہ نے ہمیشہ منفرد پلاٹ دیا ہے درود پاک پر افسانہ بہت کمال کا لگا۔ حد نمرہ احمد کا ناولٹ سبق آموز تھا، اچھا لگا رخ چوہدری نے بھی کمال کا لکھا۔ رخ چوہدری میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ رضوانہ پرنس ...... کا افسانہ سو سو لگا۔" (شکریہ)

ماہ نور، انور، ڈسکہ سے۔ "پاکیزہ ڈائجسٹ جنوری 2012ء کا بہت بہت اچھا لگا۔ ٹائٹل کمال کا تھا اور رائٹرز بھی زبردست نظر آئے۔ میں عتیقہ محمد کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس کی وجہ وہ نیا پلاٹ ہمیشہ لے کر پیش کرتی ہیں۔ نمرہ احمد کی کیا بات ہے۔ حد ایک بہت اچھا ٹاپک تھا۔ رخ چوہدری کا کیا کہنا۔ رضوانہ پرنس کی تحریریں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ عمیرہ آپی کو میرا آداب، عمیرہ آپی عکس ایک شاندار ناول جا رہا ہے۔ میرے پاس آپ کی تعریف کے لیے الفاظ منتخب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انجم آپا جلترنگ بہت اچھا تھا اور آپ کا ناولٹ بھی بہت سادگی سے ہر بات سمجھا رہا ہے۔ آپا میں نے آپ کو ایک افسانہ کاغذ کی کشتی بھیجا ہے۔ پلیز بتا دیں کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کا افسانہ تا حال ہمیں نہیں ملا ہے۔ ہم سے اکثر بہنیں صرف یہ پوچھنے کے لیے خط بھی لکھا کرتی ہیں کہ آپا ہم افسانہ بھیج سکتے ہیں تو آپ سب کے لیے جواب ہے کہ جی ہاں ضرور بھیجیں)

روشانے عبدالقیوم۔ بونیری سے۔ "کسی ایک تحریر کی تعریف کرنا، دوسری تحریر کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ ماہنامہ پاکیزہ اِک صاف ستھرا اور معیاری رسالہ ہے۔ جس میں جس تحریر یا سلسلے کو جگہ مل جائے تو اس پر معیاری ہونے کا لیبل چسپاں ہو جاتا ہے۔ آپ کے پرچے کی اِک اِک تحریر اور ہر ایک سلسلہ ہی اپنی مثال آپ ہے۔ نئی اور پرانی تمام لکھاری بہنیں بے حد اچھا لکھ رہی ہیں۔ لکھنا، پڑھنا میرا جنون ہے اور ادب کی دنیا سے وابستہ ہونا میرا خواب۔ انجم باجی! جس طرح سے آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ جس طرح سے رہنمائی کرتی ہیں۔ ایسے ہی ہے جیسے ماں اپنے معصوم بچے کو انگلی سے پکڑ کر چلنا سکھاتی ہیں۔ اس کے لیے دل سے دعا ہی نکل سکتی ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کے ادارے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔" (روشانے خوش آمدید۔ آپ کے افسانے مل گئے ہیں مگر ابھی پڑھے نہیں)

ذکیہ ناز آفریدی، پشاور۔ آپ کے خواب کا واضح مطلب یہی ہے کہ خوشیاں، کامیابیاں آپ کو ملنے والی ہیں اور آپ کی پریشانی کا دور ختم ہونے کو ہے۔ اس لیے آپ روزانہ دو نفل شکرانے کے پڑھنا شروع کر دیں...... اور درود ابراہیمی کثرت سے پڑھیں۔

نیلوفر، لاہور۔ اس محفل میں خوش آمدید ...... عمیرہ احمد اور عنیزہ سید کو میں آپ کی مبارک باد پہنچا دوں گی۔ جلترنگ کے لیے بھی شکریہ...... آپ نے بے وجہ صرف پانچ صفحات جلترنگ کی تعریف میں لکھ دیے۔ بس ٹھیک تھا۔ اب اتنا خاص بھی نہیں تھا...... خیر گڑیا...... اس محفل میں کسی بھی بہن کا مکمل خط شائع نہیں ہوسکتا کہ مجھے اس میں زیادہ سے زیادہ بہنوں کی رائے شامل کرنی ہوتی ہے، ہاں دور دراز گاؤں سے آنے والے خطوط کو میں کافی حد تک تفصیل سے شائع کرنے کی خواہش رکھتی ہوں یا وہ بہنیں...... جن کا پلیٹ فارم صرف یہی بہنوں کی محفل ہے۔ مجھے یہاں تک یقین ہے کہ اگر اس کے صفحات پچاس بھی کر دوں تب بھی

آپ لوگ یہی کہیں گے کہ صفحات اور بڑھا دیں۔

ثمینہ عرفان، کراچی۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ بیٹی کی شادی کی مبارک باد قبول کرو۔ آپ اپنی شاعری مجھے ضرور بھیجیں۔ آپ نے ہمارے ناولٹ کانچ سی لڑکی میں استعمال کیے گئے ایک لفظ تو فگی کا مطلب پوچھا ہے تو اس کا مطلب فخر سے ہے بلکہ ایسا فخر جو زعم آمیز ہو...... آسان لفظوں میں آپ یوں سمجھ لیں کہ گھمنڈی فخریہ انداز...... ہاں نشاط خان ہماری بھی دوست ہیں۔

صائمہ ناز ملک، نوشہرہ ضلع خوشاب۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ اللہ تعالیٰ آپ کے خوابوں کو پورا کرے۔ آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ پاکیزہ میں ہر ماہ ضرور تبصرہ بھیجیں۔ ہمیں انتظار رہے گا۔

ناہید صدیقی، کراچی سے۔ ''پیاری آپی بہنوں کی محفل میں اپنا خط دیکھ کر بہت بہت خوشی ہوئی۔ آپ کتنا خیال رکھتی ہیں اپنی بہنوں کا عکس اب کھل کر سامنے آ رہا ہے اور سمجھ آ رہا ہے۔ کانچ سی لڑکی زبردست حقیقت سے قریب تر...... آپی نمرہ احمد نے تو حد ہی کر دی۔ زبردست، جلترنگ آپی ایسے سچے اور پیارے آئیڈیے صرف آپ ہی بیان کر سکتی ہیں۔ آپی ایک سچی کہانی میں نے لفظوں سے جوڑ کر آپ کے پاس بھیجی ہے کیا یہ قابلِ اشاعت ہے۔'' (جی ہاں)

نسرین لغاری، ٹنڈو باگو۔ پھولوں بھری تقریب کا احوال پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کی مبارک باد ناہید سلطانہ اختر، عمیرہ احمد، نمرہ احمد اور رضوانہ پرنس تک پہنچائی جا رہی ہیں۔

تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ''سلسلے وار ناول پڑھے۔ عکس میں چڑیا معما ہی بنی رہی اور شیر دل عکس کا سایہ بنا رہا۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں میں کلثوم ظلم کی بھٹی میں جل رہی ہے تو رانی کا کارنامہ پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ ان کلیوں کی حفاظت فرما۔ سلمیٰ غزل کی ناشکری میں اقرا کے بھائیوں نے بروقت صحیح قدم اٹھایا۔ عذرا آفتاب نے گھونسلہ میں اس قدر خوب صورت آشیانے کی تصویر کشی کی ہے کہ میں نے دوبارہ پڑھا لیکن اختتام اداس کر گیا۔ ناہید فاطمہ حسنین کی راستے زندگی کے میں مستقیم بہت ہی مستقل مزاج رہا اور نو مولود کو بھرپور جوان بنا دیا۔ شمع خانم کی مما کو نہ ساس نے سراہا نہ شوہر نے سوتیلا بچہ پالنے پر اور آخر میں خود یاسر نے بھی کوئی صلہ نہ دیا۔ ان تکلیف دہ کہانیوں کے بعد سویٹ ڈش کے طور پر جلترنگ پڑھا جو کہ لبوں کے لیے بہترین ٹانک ہے۔ مسکراتے لب خوب صورت ہی لگیں گے ناں۔'' (شکریہ)

عارفہ کنول، پنجاب سے۔ ''میرا نام عارفہ کنول ہے اور میں پاکیزہ کی ایک خاموش قاری ہوں لیکن آج خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ آنٹی پاکیزہ ایک اچھا اور معیاری رسالہ ہے۔ جس میں سب لوگوں کو جگہ ملتی ہے۔ یہ رسالہ ایک فیملی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ آنٹی جی! میں آپ کو اپنی شاعری بھیج رہی ہوں اگر مناسب لگے تو شائع کر دیجیے گا۔ شکرگزار رہوں گی۔'' (آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی)

تسلیم امجد، خیابانِ سرسید کراچی سے۔ ''باجی آپ نے پاکیزہ مئی 2011ء میں بہنوں کی محفل میں بہن غزالہ یاسمین سرگودھا کو مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے روحانی مشورے پر عمل کر کے ان کی بچے دانی کی رسولیاں ختم ہو گئیں۔ مجھے وہ روحانی مشورہ پوچھنا ہے، میں ایک دفعہ آپریشن بھی کروا چکی ہوں اب پھر ڈاکٹر کہتے ہیں کہ رسولی پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر نے آپریشن بتایا ہے مگر

اب مجھ میں ہمت بھی نہیں۔'' (پیاری بہن آپ پورے یقین کے ساتھ پانی پر 41 بار سورۂ فاتحہ اول و آخر درودِ ابراہیمی دم کر کے 40 دن تک پئیں۔ اس کے بعد الٹرا ساؤنڈ کروالیں۔ رسولی غائب ہوگی)

ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ''دین کی باتوں میں آنحضرتؐ کے اسمائے گرامی پڑھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے اور معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ اس سے پہلے میں نے قیصرہ صاحبہ کی کتاب نہیں پڑھی۔ اب پاکیزہ کے ذریعے پڑھ رہی ہوں اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ باقی سلسلے وار ناول تو زبردست ہیں ہی لیکن عکس ایک بہترین ناول ہے عمیرہ احمد کا جسے وہ کامیابی کے ساتھ آگے لے کر جا رہی ہیں۔ ان زبردست سلسلوں میں خوشی کا جھٹکا ہمیں اس وقت لگا جب ہم نے کانچ سی لڑکی کے آگے انجم آپی کا نام دیکھا زبردست۔ رضوانہ پرنس کا افسانہ اگرنہ پڑھا لیکن یہ اگر مگر نہیں چلے گا پلیز کسی حقیقی فسانے کے ساتھ آئیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

کرن صابر، جنڈانولہ سے۔ ''میں پاکیزہ کی خاموش قاری تھی مگر اب عالیہ باجی نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا کہ اب تم نے خاموش نہیں رہنا۔ میری طرف سے عالیہ باجی کو اتنا زبردست ناول لکھنے پر مبارک باد ہو۔ آپ نے تمام ناول بہت زبردست انداز میں لکھا، ناول بہت دلچسپ انداز میں چل رہا تھا کہ آپ نے اختتام ایک زبردست جھٹکے سے کر دیا کہ میں ساری کی ساری ہل کر رہ گئی کہ یہ کیا ہوا بہت سارے سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں اور میرے خیال سے تمام قارئین کے بھی کچھ اسی طرح کے خیالات ہوں گے مگر خیر آپ کی مرضی، آپ رائٹر ہیں، ہم سے زیادہ علم رکھتی ہیں۔ اب آتے ہیں راحت وفا کے ناول کی طرف ایک تھی نیناں بہت زبردست ہے ریحان اختر اور مدیحہ کی پھپھو یہ دو ایسے کردار ہیں جو اپنے اندر بہت سے بھید لیے ہوئے ہیں۔ راحت آپی کے لکھنے کا انداز انتہائی دلچسپ ہے اور اسی طرح آپی شیریں حیدر کا ناول بھی بہت زبردست ہے مگر کرداروں کی بھرمار ہے جن سے اچھا خاصا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اب آتے ہیں عمیرہ احمد کی طرف کیا بات ہے عمیرہ احمد کی بہت ہی زبردست ناول ہے چڑیا کا کردار مجھے بہت پسند ہے اینڈ پر آ کر دل بہت پریشان ہوا اللہ کرے یہ ایبک کا خواب ہو۔ اب رخ کرتے ہیں سدرہ صاحبہ کے ناولٹ محبت کی شام کی طرف بہت زبردست ناولٹ رہا ہے باقی تمام کہانیاں اپنے اندر بہت بڑے بڑے سبق سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہر کہانی کے اندر ہمارے لیے نصیحت ہوتی ہے۔ پورا پاکیزہ انتہائی شاندار ہے ہر ہر سطر ہر تحریر ناقابلِ فراموش ہے۔ پورے پاکیزہ میں میرا سب سے فیورٹ سب سے اچھا کردار انجم آپی آپ کا ہے۔ پُرشفقت دھیما اور نرم لہجہ مجھے بے انتہا پسند ہے۔ آپ میرا آئیڈیل ہیں اللہ آپ کو ہزاروں لاکھوں کروڑوں خوشیاں دے، آمین ثم آمین۔ میرا بہنوں کی محفل میں شرکت کرنا آپ کو کیسا لگا، مجھے ضرور بتائیے گا میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گی۔'' (پیاری کرن...... اس محفل میں خوش آمدید۔ تمہاری شرکت سے مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین)

نسیم نیازی، لاہور سے۔ ''عالیہ کا ناول ختم ہوا بہت خوب صورت ناول کا اینڈ تیز رفتاری کے باعث متاثر ہوا۔ ویسے مجموعی طور پر ناول خوب صورت رہا، ناول کی کہانی اپنے تمام تر اتار چڑھاؤ کے باعث شروع سے ہی قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رہی۔ نئے ناول کی پہلی قسط پڑھ کر میں کچھ نہیں کہوں گی اور پرانے

ناول پر تبصرہ اس لیے نہیں کروں گی کہ میں نے انہیں ابھی پڑھا نہیں ہے۔ اس مرتبہ نمرہ احمد، عنیزہ سید دونوں ہی پاکیزہ کی جان ہیں۔ باقی رخ چوہدری کی تحریر پر پرانی تحریر کا گمان گزرا..ہوسکتا ہے نئی تحریر ہو مگر مجھے جانے کیوں ایسا لگا۔ ہم کہاں کے دانا تھے، مہرباں کیسے کیسے بھی خاصے کی تحریریں تھیں۔ حصہ غزل میں یمنیٰ احمد کی غزل کے ہر بند پر ہم سر دھنتے رہے، یمنیٰ جی شادی کا احوال بمعہ تصاویر کب دے رہی ہو پاکیزہ میں۔" (وہ جب بھی دیں گی، ہم اسے ضرور شامل کریں گے)

✍ ڈاکٹر کومل ستار، لیاقت میڈیکل یونیورسٹی جام شورو سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح اچھا تھا اور بہت ہی اچھا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر حرف اثر کرتے ہیں۔ عمیرہ احمد بلاشبہ بہترین...... پہلے منظر میں جو لڑکی دکھائی ہے وہ چڑیا ہی ہوگی اور لڑکا شاید ایبک...... ناہید سلطانہ جی نے بھی اچھا لکھا مگر سمجھ نہیں آیا کہ نومولود کو وہ شرارتی اور نالائق دکھاتے دکھاتے اک دم سے اتنی بڑی قربانی پر کیسے آمادہ کر گئیں۔ راحت بے وفا اچھا لکھ رہی ہیں۔ سوری سوری، میرا مطلب راحت وفا صاحبہ...... کھی کھی کھی شمع خانم...... ہائے اللہ جی ایہہ کی کتاں تسی...... اچھی خاصی کہانی چل رہی تھی کہ انہوں نے فل اسٹاپ لگا دیا۔ میں .... تو کافی دیر تک باقی آئندہ ہی ڈھونڈتی رہی کھی کھی کھی...... کانچ سی لڑکی تبصرہ محفوظ ہے ناول ختم ہونے تک۔ عاشفہ مسعود نے بلاشبہ اچھا لکھا۔ سلمٰی یونس کے لفظ اچھے تھے بلکہ بہت اچھے تھے مگر کہانی سوسو تھی۔ فرزانہ گیلانی کا بہت ہی پرانا ٹاپک تھا تو بالکل مزہ نہیں آیا۔ سدرۃ المنتہٰی کی تو کیا ہی بات ہے۔ دل چاہ رہا تھا بھاگ کے ٹنڈو جا کر شاباش دے کر آؤں۔ اللہ زورِ قلم کرے اور زیادہ عذرا آفتاب کا افسانہ تھا عجیب فلمی سا لگا۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ فریدہ فری، لاہور سے۔ "آپ کے ناولٹ کی پہلی قسط کانچ سی لڑکی پڑھی تھی بے حد پسند آئی اور دوسری قسط بھی پڑھ لی پڑھنے کے لیے کس طرح پورا ماہ انتظار کیا۔ افسانوں میں ہم کہاں کے دانا تھے آوارہ رکھوالا...... نمرہ احمد کا ناولٹ خوب تھا اور عمیرہ احمد کا نادل .... خوب سے خوب تر جا رہا ہے۔ اگر رضوانہ پرنس کی بہترین تحریر لگی۔ عنیزہ سید کا افسانہ بھی کمال کا تھا۔ محبت جی کے دیکھو اور مہرباں کیسے کیسے سب کے سب بے حد پسند آئے۔ ہم نے نماز کے بعد جو دعا آپ نے بتائی تھی زبانی یاد کرلی ہے اب ہم وہی پڑھتے ہیں شکریہ، پھولوں بھری تقریب تو بے حد اچھی تھی۔ عذرا رسول کو بے حد مبارک باد ان کے بیٹے نے اتنی چھوٹی عمر میں حج کی سعادت حاصل کی اور اس تقریب کا احوال پڑھ کر بے حد اچھا لگا اور تصاویر بھی بے حد اچھی تھیں۔ پاکیزہ ڈائری میں سب نے اچھا لکھا۔" (شکریہ)

✍ ام طیفور، گوجرانوالہ سے۔ "پہلی دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، کیا لکھوں؟ سمجھ نہیں آرہا۔ چلیں، پہلے آپ کو بتاتی چلوں کہ میری امی 1975ء سے پاکیزہ پڑھ رہی ہیں۔ جب وہ محض بیس سال کی تھیں۔ بہت چھوٹی عمر سے ہم نے گھر میں پاکیزہ ہی آتے دیکھا ہے۔ بڑے بڑے معتبر نام آپ کے ڈائجسٹ کی زینت بنتے رہے ہیں۔ میری عمر اس وقت 28 سال ہے۔ دو بچے ہیں۔ اس کے باوجود سخت ترین مصروفیت میں بھی پاکیزہ لازمی پڑھتی ہوں اور مجھے تقریباً تیرہ، چودہ سال ہو چکے ہیں اس سے جڑے۔ اس لمبی تمہید کا مقصد یہ ہے کہ میں آپ سے آپ کے ڈائجسٹ میں شمولیت کی اجازت چاہتی ہوں۔ انجم آنٹی! میں افسانے لکھتی ہوں۔ میرے افسانے مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں مگر میری آج تک ہمت نہیں ہوسکی کہ

میں اپنی کوئی کاوش آپ کو ارسال کروں کیونکہ جہاں اتنے بڑے بڑے اور اونچے نام ہوں وہاں میں کبھی کوشش کے باوجود آپ کو کچھ بھی ارسال کرنے کی جرأت نہیں کر سکی مگر اب مجھے آپ سے اجازت درکار ہے۔ میں آپ لوگوں کے قریب ہونا چاہتی ہوں۔ مجھے مایوس مت کیجیے گا۔ کیا میں آپ کو اپنا افسانہ بھیج سکتی ہوں جو میں نے خاص پاکیزہ کے لیے لکھا ہے۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ اپنے افسانے فوراً سے پہلے بھیج دیں)

✍ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ "زم زم بورے والا کا خط پڑھ کر دل بہت دکھی ہوا۔ جب انسان کو دکھ زیادہ ملتے ہیں تو وہ تپ کر کندن بن جاتا ہے اور بہت بہادر ہو جاتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے ان کی زندگی میں خوشیاں آئیں، ناامید نہ ہوں۔ ناہید فاطمہ حسنین نے راستے زندگی کے اچھا لکھا۔ عورت تو اولاد کے لیے بہت قربانیاں دیتی ہے لیکن مردوں کا حوصلہ بہت کم ہوتا ہے۔ مردوں میں صبر و برداشت کا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ کانچ سی لڑکی کا اسٹارٹ بہت اچھا تھا، واقعی ہر لڑکی کانچ ہوتی ہے اور حساس ہوتی ہے مگر یہ احساسات صرف ہم اپنی ہی بیٹیوں کے لیے کیوں رکھتے ہیں۔ دوسرے پر اپلائی کیوں نہیں کرتے۔ عذرا آفتاب نے اچھا لکھا، گھونسلہ واقعی عورت کا گھر تو گھونسلہ ہی ہوتا ہے۔ ساری عمر ہی اس گھونسلے کے تنکے سنوارتے گزر جاتی ہے اور آخر میں اس کو بکھرنا ہی ہوتا ہے کیونکہ گھونسلہ تو گھونسلہ ہی ہوتا ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ تابندہ جبیں، ملتان سے۔ "میرا نام آپ کے لیے نیا سہی لیکن نو آمد لکھاریوں کی صف میں شامل مت کیجیے گا۔ کچھ عرصے قبل قلمی نام سے دوسرے کئی رسائل میں میری تحریریں چھپتی رہی ہیں۔ درمیان میں کچھ تعطل آ گیا تھا۔ پہلی بار پاکیزہ میں شرکت کر رہی ہوں اپنی اصل شناخت کے ساتھ پاکیزہ میں بے شک پہلے کبھی نہیں لکھا لیکن اس کی خاموش قاری ضرور رہی ہوں دیکھتے ہیں کہ آپ کی جانب سے کیسا رسپانس ملتا ہے۔ بہنوں کی محفل میں جو اپنا پن جھلکتا ہے اس سے تو یہی اندازہ لگا پائی ہوں کہ بہت جلد میں بھی آپ کے 'اپنوں' میں شامل ہو جاؤں گی۔ امید ہے افسانہ آپ کے معیار پر پورا اترے گا اور آئندہ بھی پاکیزہ میں لکھنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔" (اس محفل میں خوش آمدید، آپ کا افسانہ میں نے پڑھ لیا ہے اچھا ہے۔ شائع ہو جائے گا دیگر باتوں کے لیے آپ مجھ سے فون پر بات کرلیں)

✍ عنبرین علی، کراچی سے۔ "ایک لمبے عرصے بعد آپ سے فون پر بات ہوئی۔ یقین کریں اتنا اچھا لگا۔ ویسی محبت اور پیار جب پہلی بار 1992ء میں آپ سے بات ہوئی تھی۔ عمیرہ احمد میری بہت ہی پسندیدہ رائٹر ہیں۔ ویسے ہی وہ ہمارے شہر کی ہیں۔ کالج میں دو سال سینئر تھیں ان کا یہ ناول بھی اتنا زبردست ہے جیسے باقی سب...... دربارِ دل جسے میں نے بہت پڑھا اور جب بھی پڑھا بہت رونا آیا۔ ان کا ہر ناول اپنے اندر ایک میسج لیے ہوئے ہے۔ میرا یہ پیغام ان تک ضرور پہنچا دیجیے گا۔ آپا مجھے لکھنا آپ نے سکھایا ہے اس کے لیے آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ کے تعریفی جملے میرے لیے ایک انرجی کا کام دیتے ہیں۔ جب میں نے اپنے میاں جی کو بتایا کہ آپا کو میری پوئم پسند ہیں تو وہ یقین نہیں کر رہے تھے۔" (آپ کی رائے عمیرہ احمد تک پہنچائی جا رہی ہے...... ہاں اپنے میاں کو بتا دو کہ پاکیزہ میں تمہاری بہت اہمیت ہے)

✍ جبیں ہاشمی، بھیرہ ضلع سرگودھا سے۔ "ماہنامہ پاکیزہ کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ فریش اپ کرتا رہتا ہے۔ دیکھیں نہ جن کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے ان رائٹرز سے ملوا دیا۔ یادوں کی ایسی پٹاری کھولی جسے دیکھ کر

دنگ رہ گئے۔ ماہنامہ پاکیزہ ایک بہترین رہبر اور نیک دوست کی طرح ہماری زندگی میں روشنی بکھیر رہا ہے۔ روحانی مشوروں میں آپی انجم ایک اچھے استاد کی طرح گائیڈ کرتی ہیں۔ استانی جی آپ بہت اچھی ہیں اور میں اچھے بچوں کی طرح آپ سے وعدہ کرتی ہوں آپ جو وعدہ لے رہی ہیں نئے سال کی ابتدائی کا میں اس وعدے کو پورا کروں گی اور کم از کم میری ذات سے کسی کو دکھ نہیں ہوگا۔ سلسلے وار ناول میں عکس ٹاپ پر جا رہا ہے۔ عمیرہ احمد کتنی خوب صورتی اور دل جمعی سے آگے سے آگے بڑھ رہی ہیں، ویل ڈن عمیرہ احمد! آپی جی آپ کا ناولٹ کانچ سی لڑکی میں الفاظ کا خوب صورت چناؤ، جملوں کی روانی، بے ساختگی دھیرے دھیرے من کے اندر اترتی چلی جاتی ہے۔ باقی سلسلے وار ناول، افسانے اپنی اپنی جگہ اچھے تھے۔ پاکیزہ ڈائری ہمیشہ کی طرح شاندار رہے۔ پھولوں بھری تقریب میں ہم بھی بن بلائے مہمان شامل ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں ہر طرف پھول اور پھول جیسے چہرے، ذیشان اور عذرا رسول لگ ہی نہیں رہے کہ یہ ماں، بیٹا ہیں، کتنا نور ہے دونوں کے چہروں پر۔ شائستہ اعجاز، اجیہ آفاق، عظمیٰ آفاق، یاسمین رشید، ہما بیگ، حمیرا سب کے چہرے کھل رہے ہیں۔" (شکریہ)

✍ گیتی آرا، کراچی سے۔ "عمیرہ احمد کے خوب صورت ناول عکس کی پانچویں قسط پڑھنے کو ملی جس کی کہانی اپنے اندر ڈھیروں سسپنس لیے بڑے منفرد انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ شیر دل کا عکس کی طرف اٹھتا بڑھتا قدم کہانی کو مزید دلچسپ بنائے دے رہا ہے اور پڑھنے والے کی بے تابی.... اسے اگلی قسط کے لیے مزید بے تاب اور بے چین کیے دے رہی ہے۔ عقیلہ حق نے رنگ کیسے کیسے میں اس معاشرے کی ایک بہت بری برائی کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے ہماری کم ظریف فطرت کا احساس اجاگر کر دیا۔ عائشہ مسعود نے یہ زندگی

ہے میں زندگی کی ایک اہم حقیقت اور بدی کی طرف بڑی خوب صورتی کے ساتھ نشاندہی کی۔ دوسروں کے لیے منفی سوچ رکھنے والا انسان کبھی کسی کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتا اور اب باری ہے اپنی زبردست رائٹر انجم انصار کی جن کی تحریر کانچ سی لڑکی کے آخری صفحے پر باقی آئندہ کا لیبل دیکھ کر دل خون کے آنسو رو کر رہ گیا۔ لو پھر اینڈ کے لیے پورے ماہ کا طویل انتظار! شگفتہ کنول کی یاد میں پڑھ کر بے حد دکھ ہوا اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ شادی عمیرا اور ثمینہ کی میں اتنا کم سن اور کم عمر کپل دیکھ کر مزہ آ گیا۔ واقعی میں صحیح عمر تو شادی کی یہی ہوتی ہے۔" (شکریہ)

☜ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ "اداریہ بہت پُراثر لگا۔ خاص طور پر آخری سطریں، کاش ہم سب اپنا اپنا محاسبہ کرلیں تو دکھ کی فضا قائم ہی نہ ہو۔ اسلامیات کی بصیرت افروز باتوں کے بعد عمیرہ احمد کے عکس میں حسین لفظوں سے سجی تحریر دکھائی دی۔ چڑیا کے ساتھ تکلیف دہ حادثہ دل دہلا گیا۔ اچھی صورتوں کے پیچھے کیسے بھیانک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ ہم کہاں کے دانا تھے، مہرباں کیسے کیسے، اگر مناسب تحاریر لگیں۔ آپ کی تحریر واہ...... کانچ سی لڑکی جملوں کی کاٹ اور حقیقت پسندی بہت زبردست رہی۔ زندگی، ناہید سلطانہ اختر پاکیزہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا ہر ناول پاورفل ہوتا ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو گرفت میں لینے کا فن جانتی ہیں۔ گویم مشکل گداز دل کی داستان آنکھیں نم کر گئی۔ زعیم کا کردار بھرپور انداز لیے ہوئے تھا۔ عنیزہ جی ویل ڈن، نمرہ احمد کی حد حدود کے پس منظر میں لکھی جانے والی تحریر مدتوں یاد رہے گی۔ آوارہ رکھوالا وفاداری کا ثبوت دیتا کتا نمک حلال کر گیا۔ کاش ہمارے گھروں میں ایسے حالات پیدا ہی نہ ہوں کہ لڑکیاں بد دل ہو کر سراب بھری خوشیوں کے پیچھے لپکنے لگیں اور تباہی و بربادی ان کا مقدر بن جائے۔ بھائی، مائیں ذرا توجہ فرمائیں...... بہنوں کی محفل میں ہر بہن خدا کرے مسکراتی رہے، فریدہ خانم اللہ اور ترقی دے، بہنوں کی آمد بہت اچھی لگتی ہے مگر مصروفیت کی وجہ سے نہیں آپا رہیں ان سے استدعا ہے کہ تھوڑا سا ٹائم نکال کر آجایا کریں۔ آخر اپنوں سے اتنی دور کون رہ سکتا ہے۔ پھولوں بھری تقریب، باجی آپ تو نیلا گلاب لگ رہی تھیں۔ ذیشان کی قابلیت قابلِ تحسین تھی۔ بہت ہونہار بچہ ہے۔ عذرا جی کی آنکھوں اور آرزوؤں کا ترجمان۔ اجیہ نے تو عظمیٰ کے قد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ماشاء اللہ بہنیں لگتی ہیں ماں بیٹی، ایسی تقاریب آپس کی محبت کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جلترنگ میں آپ نے جو مناظر کشید کیے کیا کہنے، یہ آپ کا ہی خاصہ ہے کہ آپ کیسے کیسے کرداروں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کر کے ہمارے لیے لطف و ہنسی کا سامان پیدا کرتی ہیں، یہ بھی صدقہ جاریہ ہے کہ اداس لمحوں کو مسکراہٹ کا جامہ پہنا کر انہیں چند لمحوں کے لیے دکھ کی کیفیت سے نکالا جائے۔" (شکریہ)

پیاری بہنوں! پاکیزہ کا مارچ کا شمارہ بہار نمبر ہوگا اور اپریل و مئی کے خصوصی شمارے سالگرہ نمبرز ہوں گے۔ بہار نمبر کے ساتھ ساتھ آپ سالگرہ نمبرز کے لیے اپنے انٹرویوز خوب صورت افسانے اور مراسلات ہمیں فوری ارسال کردیں۔ ہمارا ایڈریس یہ ہے۔ مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ 63-C فیز 11 ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ 75500 اور اب اجازت دیجیے۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی وسماوی آفات تمام پریشانیوں، بیماریوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین ثم آمین

دعا گو آپ کی اپنی باجی۔

انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

موج صبا چھو جاتی ہے
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
خوشبو دل میں اتر جاتی ہے
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
سورج شہر جگاتا ہے جب
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
چاند چھتیں چمکاتا ہے جب
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
دن جب رات میں ڈھل جاتا ہے
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
موسم کوئی بدل جاتا ہے
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
روح کی پیاس نہیں بجھتی ہے
دل کہتا ہے کوئی تو ہے
ذہن کو راہ نہیں ملتی ہے
اپنی سوچیں تھک جاتی ہیں
عقل کی بانہیں تھک جاتی ہیں
دل کہتا ہے کوئی تو ہے

شاعر: محمود شام

مرسلہ: مسز شمع حسین، کینیڈا

ربِ کائنات

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک کھانا تناول نہیں فرماتے تھے جب تک کوئی مہمان دستر خوان پر موجود نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن کوئی بھی مہمان نہیں آیا تو وہ مہمان کی تلاش میں بستی سے باہر گئے۔ وہاں ایک بوڑھا راہ گیر جارہا تھا حضرت ابراہیمؑ اسے لے آئے اور کھانے میں شریک کیا لیکن کھانا شروع کرتے وقت اس نے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دل میں ارادہ کیا کہ ایسے ناشکرے کو کبھی آئندہ اپنے دستر خوان پر نہیں بلاؤں گا۔ اسی لمحے غیب سے آواز آئی۔

"اے ابراہیمؑ! اس بوڑھے نے ایک دفعہ شکر ادا نہ کیا تو تم نے آئندہ کے لیے اسے نہ کھلانے کا عزم کرلیا ذرا میری فیاضی کا اندازہ لگاؤ کہ بچپن سے لے کر اب تک اس نے ایک مرتبہ بھی میرا نام نہیں لیا لیکن آج تک میں نے اس کا رزق بند نہیں کیا۔"

مرسلہ: ریحانہ شہزاد، کراچی

سونا اور ہیرا

کسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا دوست اور بھائی میں کیا فرق ہے؟ آپ نے فرمایا۔ "بھائی سونا ہے اور دوست ہیرا ہے۔" اس نے پھر پوچھا کہ سونے اور ہیرے میں کیا خوبی ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "سونا ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے مگر ہیرا ٹوٹ کر نہیں جڑتا۔"

مرسلہ: کنول عبدالستار عاصم، لاہور

خیال رکھو

یہ نہ سوچو کہ کسی نے مجھے کیا دیا ہے اور کیا نہیں دیا بلکہ ہر دفعہ اس بات کا خوب خیال رکھو کہ میں

نے فلاں کو کیا دیا ہے اور فلاں کو کیا نہیں دیا۔
مرسلہ: سیدہ شفق عامر زیدی، کراچی

ذرا سوچیں

امتحان کے تمام پرچے آؤٹ کر دیے جائیں، پرچوں میں آنے والے سوالات اور ان کے جوابات بھی بتا دیے جائیں۔ اس کے باوجود کوئی شخص فیل ہو جائے تو اس سے بڑا بدقسمت کوئی نہ ہوگا۔ بالکل یہی نقشہ آخرت کا ہے۔ اللہ رب العزت نے تمام سوالات اور جوابات ہمیں امتحان سے پہلے ہی بتا دیے ہیں اور یہ سب جانتے ہوئے بھی اگر ہم فیل ہو جائیں تو اسے کیا کہیں گے۔

مرسلہ: نگینہ ضیا بخش، کراچی

دنیا

"اے لوگو! تم کس دنیا پر فخر کرتے ہو جس کا بہترین مشروب مکھی کا تھوک (شہد) ہے اور بہترین لباس کیڑے کا تھوک (ریشم) ہے۔ مجھے اس دنیا سے کیا لینا جس کے حلال میں حساب اور حرام میں عذاب ہے۔"

(حضرت علیؓ)

مرسلہ: حمیرا کلیم، ملتان کینٹ

مجھ سے ملیے

میرا نام ہے آر کے خان
آرائیں خاندان
منہ میں پان
دیکھو میری شان
پاکیزہ میرا مان
نرالی ہے اس کی آن
میں انجم انصار پہ قربان
جو ہیں سب پہ مہربان
عذرا رسول ہیں پاکیزہ کی روحِ رواں
قاری و مصنفات بہنوں سے چلتا ہے یہ کارواں
مسیحا کرے سب کی مشکلیں آساں
اس کے ٹائٹل کا کیا کہوں اندازِ بیاں
انوکھا ہے اس کا ہر رنگ
بھاتا ہے سب کو جلترنگ
زندگی ہوگی دبنگ
چلو گر اس کے سنگ
اس کے ناول اور افسانے
سکھاتے ہیں گھر بسانے
لاتا ہے خواب سہانے
تبھی تو ہیں ہم اس کے دیوانے
ہیں اس کے سلسلے بے شمار
ہوتے ہیں پکوان مزیدار
رہتا ہے ہر ماہ شدت سے انتظار
شعر و شاعری ہے اس کا نکھار
اب یہی دعا ہے
لب پہ ہے یہ صدا
دے عروج تجھے خدا
ہو نہ تو کبھی ہم سے جدا

شاعرہ: عارفہ کنول، پنجاب

لفظوں کی مالا

☆ اگر اللہ معاف کر دے تو گناہ کیا ہے اگر اللہ نا منظور کر دے تو نیکی کیا ہے۔

☆ اگر آپ نے کسی کو قبول نہیں کیا تو یہ سمجھ لیں کہ کسی نے آپ کو قبول نہیں کیا۔

☆ شیطان اس لیے شیطان بنا کہ اس نے عبادت کو تو مانا لیکن معبود کو نہ مانا۔

☆ اپنے آپ کو بدنصیب کہنے کے گناہ سے بچتے رہو۔

☆ ہمارا ہونا کس کام کا اگر ہمارے نہ ہونے

سے کسی کو کچھ فرق نہ پڑے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ آسان کام نصیحت کرنا ہے اور سب سے مشکل کام نصیحت پر عمل کرنا ہے۔

☆ خواب نہ چھوڑے جا سکتے ہیں نہ پورے کیے جا سکتے ہیں بس دیکھے جا سکتے ہیں۔

☆ اچھے عمل کی یاد کو ایک برا لفظ ہمیشہ کے لیے تباہ کر سکتا ہے۔

مرسلہ: تانی چوہدری، آکسفورڈ یو کے

محبت

محبت یاد کرنے میں عجب سا لطف آتا ہے
دل ناشاد کرنے میں عجب سا لطف آتا ہے
تمہیں اپنا بنانے میں عجب سا لطف آتا ہے
تمہیں ملنے ملانے میں عجب سا لطف آتا ہے
تمہیں دن رات، صبح و شام دل سے یاد کرتے ہیں
بس یوں آہیں بھرنے میں عجب سا لطف آتا ہے
تم کاموں میں الجھے ہو یا راہوں میں کھوئے ہو
تمہیں آواز دینے میں عجب سا لطف آتا ہے
تمہارے بن میری دنیا کے سارے رنگ پھیکے ہیں
یوں فریاد کرنے میں عجب سا لطف آتا ہے
کچھ دشمنوں کے ساتھ بھی ہے پیار کا رشتہ
یہ چرچے عام کرنے میں عجب سا لطف آتا ہے
تمہاری الفتیں ساری ہمارے نام ہو جائیں
سو یہی تکرار کرنے میں عجب سا لطف آتا ہے
جو تم ساتھ ہو میرے تو خوشیاں رقص کرتی ہیں
یہ اقرار کرنے میں عجب سا لطف آتا ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

وجہ

اسپتال کے آئی سی یو وارڈ کے ایک پلنگ پر ہر اتوار کو موجود مریض کی انتہائی ڈرامائی صورت میں ٹھیک 11 بجے صبح موت واقع ہو جاتی ہے۔ سب ڈاکٹرز کی ٹیم نے میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ یہ کوئی غیر معمولی موت ہے جس کی وجہ معلوم کرنی چاہیے اس لیے اتوار کی صبح 11 بجے سے ٹھیک 8 منٹ پہلے ڈاکٹروں اور نرسوں کی ٹیم اس مخصوص پلنگ اور مریض کے گرد خاموشی سے گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئی 5 منٹ کے بعد وارڈ کا دروازہ کھلا اور پارٹ ٹائم جمعدار اندر داخل ہوا اور اس نے جلدی سے اس پلنگ کا لائف سپورٹ سسٹم پلگ سے نکالا اور اپنا موبائل چارج پر لگا دیا۔

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

محبت

محبت کی جنوں خیزی ہے کرتی راندۂ درگاہ
خواہش وصل کی ہو جاتی ہے تشنہ لبوں کی آہ
جو چھالے پاؤں کے پھوٹیں تو خوں بہتا ہے آنکھوں سے
کریں ہم کس طرح سے پار یہ تپتا ریتیلا صحرا
بھنور میں ناامیدی کے ابھر کر ڈوب جاتے ہیں
ہے ساحل آنکھ سے اوجھل سمندر درد کا گہرا
پیالہ زہر کا بھر کر کھڑی ہے زندگی اپنی
بہت بے درد لمحوں میں ہمیں ہے عشق نے چھوڑا
لبوں سے لگا لوں یا تمنا چھوڑ دوں اس کی
مجھے چاروں طرف سے موت کے سایوں نے آگھیرا
رہیں جو سانس تو شاید گھڑی ملنے کی پاؤں میں
دعا میں جب پکاروں میں لبوں پر نام ہے تیرا

شاعرہ: خالدہ نسیم
مرسلہ: سعدیہ سلیم۔ سڈنی

غزل

مختصر تجھ کو سناتی ہوں کہانی اپنی
تیرے دم سے ہے یہ سانسوں کی روانی اپنی
جتنی خوشیاں بھی ملیں تجھ سے ملی ہیں لیکن

تجھ سے منسوب ہے اشکوں کی کہانی اپنی
کوئی شام سنگ گزارو کہ امر ہو جاؤں
وار دوں تجھ پہ ہر اِک صبح سہانی اپنی
اسی کے نام سے سانسوں کی ڈور باندھی ہے
جو محبت کو سمجھتا ہے نادانی اپنی
کرن تو بات کسی اور کی سنتی ہے کہاں
کیا تجھے یاد ہے تونے بھی مانی اپنی
شاعرہ: مہناز کرن، پشاور

سماعت

مریض نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب میری سماعت زائل ہوتی جارہی ہے کچھ سنائی نہیں دیتا ہے۔''
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''آپ کی عمر کیا ہے؟''
مریض نے کہا۔ ''نوے سال۔''
ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ پہلے ہی بہت سن چکے اب مزید کچھ سننے کی ضرورت نہیں۔''
مرسلہ: رفعت مبین رنی، کراچی

کیا کرتے

جانے والے کا غم بھی کیا کرتے
اس کو جانا تھا ہم بھی کیا کرتے
بے سبب حادثہ نہیں ہوتا
کرتے پر چشمِ نم بھی کیا کرتے
ہم فقیروں کی سادگی پُرکار
لے کے جاہ و چشم بھی کیا کرتے
وقت کی ناروائی ہے ورنہ
اس طرح وہ ستم بھی کیا کرتے
ٹوٹنا تھا سو دل یہ ٹوٹ گیا
پتھروں کے صنم بھی کیا کرتے
شاعر: مشیر طالب
مرسلہ: آمنہ مشیر، نیویارک

کان کا بالا

شام ڈھلے غم ناک سڑک پر
برف سی رنگت والی لڑکی
کس کا رستہ دیکھ رہی ہے
کھڑکی کھول کے
میں کیا پوچھوں؟
کہہ دے گی وہ
نین چرا کر
دنیا کتنا شک کرتی ہے
کان کا بالا ڈھونڈ رہی ہوں
مرسلہ: ڈاکٹر کومل ستار، جامشورو

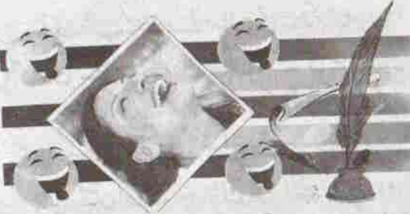
نہلے پہ دہلا

عارف نے اپنے دوست ساجد سے کہا۔ ''میرے پاپا پرندوں کو ڈرانے والے پتلے بنانے میں ماہر تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے ایسا پتلا بنایا کہ جب وہ کھیتوں میں کھڑا کیا گیا تو پورے ایک سال تک کوئی پرندہ ہمارے کھیتوں کے قریب سے نہیں گزرا۔'' ساجد نے یہ بات ہنس کر سنی اور کہا۔ ''یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرے ابا نے تو ایسا پتلا بنا کر کھیتوں میں لگایا کہ جو پرندے پچھلے سال ہمارے کھیتوں سے دانہ دنکا چگ گئے تھے وہ مارے ڈر کے سارے دانے واپس کر گئے۔''

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

سویٹ ڈیمانڈ

بچہ اپنی ماں سے پٹنے کے بعد گھر کے باہر بیٹھا تھا۔ پاپا نے پوچھا۔ ''یہاں کیسے بیٹھے ہو؟'' بچہ بولا۔ ''پاپا آپ کی بیوی کے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہوسکتا مجھے میری بیوی چاہیے۔''
مرسلہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر



جلترنگ

انجم انصار

دولھا کے بارے میں

ناصرہ کو یہ بات شادی کے بعد معلوم ہوئی کہ ساری نندیں جہاں آرا بتول ہوتی ہیں۔

شادی سے پہلے بشریٰ انصاری کے ایک بے حد پرانے ڈرامے کو دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوئی تھی کہ بشریٰ نے جہاں آرا بتول (نند) کا کردار بہت مزے سے ادا کیا تھا۔

پورا ڈراما دیکھ کر...... ناصرہ کی ھی، ھی...... کسی طرح رکنے میں ہی نہیں آرہی تھی مگر جب وہ یہی کرتوت اپنی نند کے دیکھا کرتی تو مارے غصے کے برا حال ہوجاتا۔

نئی، نئی شادی کے شب و روز، ایک دوسرے کے سوا جب کسی تیسرے کا وجود بھی برداشت کرنے کو دلہن کا دل نہ چاہے...... ایسے میں ان کی نند...... جو عرف عام میں آپا جان تھیں۔ وہ جب بھی بھائی بھاوج کو اکھٹے بیٹھے دیکھتیں ان کو ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے۔ بے وجہ، بے سبب...... روتیں تو روئے جاتیں کہ دل چاہ رہا ہے اور ان کا یہ پروگرام اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا۔ جب بھائی، بھاوج علیحدہ ہو کر ادھر اُدھر ہوجاتے...... وہ جب اپنا رونا اسٹارٹ کرتیں تو ناصرہ اپنے کمرے کی کنڈی چڑھالیتی اور ڈیک بھی لگالیتی کہ میاں جی بہن کی آواز سن کر باہر سرپٹ دوڑنے نہ پائیں۔

مگر وہ بھی کم نہ تھیں...... بند دروازے سے ٹیک لگا کر اپنے رونے کا آغاز پاٹ دار آواز میں مکالموں کے ساتھ کچھ اس طرح کرتیں...... ''ہائے میں مرجاؤں گی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا؟''

''دیکھو تو کہیں آپا جان کو ہوا کیا ہے؟''
میاں جی فوراً بے چین ہوجاتے۔

''میں کیا کروں، چکر کے مارے سارا گھر گھوم رہا ہے۔''
وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیتیں اور بھائی کو دیکھ کر ایک چھلانگ مار کر پاس آکر...... ان کے شانے سے سر ٹکا کر نیچے گرنے کی کوشش کیا کرتیں کہ کسی طرح بھی چوٹ لگنے نہ پائے۔

ایسے میں ان کی پسندیدہ ڈش...... بریانی فوراً بازار سے منگوائی جاتی...... چاہے وہ کھانا حلق تک کھا چکی ہوتی ہوں...... اس کے ساتھ رس ملائی کا پیالہ بھی خریدا جاتا۔ بھائی اپنے ہاتھوں سے اپنی آپا کو کھلاتے اور ناصرہ...... یہ مناظر جلتے ہوئے دیکھتی...... اور جب تک میاں جی ان کی دلداریوں سے فارغ ہوتے وہ سو بھی چکی ہوتی۔

میاں جی کی چھٹیاں تھیں...... ناصرہ کا دل چاہتا کہ وہ اپنے میاں کے ساتھ باہر گھومے پھرے کہ نئی، نئی دلہنوں کے شوق و ذوق یہی تو ہوا کرتے ہیں۔

''حالات خراب ہیں، کیا کروگی جاکر......''
نند صاحبہ فوراً دہائی دے دیتیں۔

اور جب حالات درست ہوتے...تب جہاں آرا بتول ان کے ساتھ ہوتیں۔

''سنیے ہنی مون منانے شمالی علاقہ جات چلتے

ہیں۔'' ایک شب ناصرہ نے میاں جی سے کہا۔ میاں جی بھی مان گئے مگر اگلے دن ہی صبح ناشتے کی میز پر آپا جان اپنے بھیا کو یہ سمجھا رہی تھیں کہ آج کل کے لڑکے بہت عقل مند ہیں فضول کے سیر سپاٹوں پر پیسہ برباد نہیں کرتے...... ان کی انگلیوں پر وہ مثالیں تھیں جو ہنی مون منانے نہیں گئے تھے۔

بھیا بھی بے حد سعادت مند تھے...... اپنی بہنا کی باتیں سن کر انہوں نے اپنا پروگرام اسی دن کینسل کر دیا۔

ناصرہ نے ابھی رو دھو کر اپنے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکالی تھی کہ اگلے ہی دن ان کی یہ نند صاحبہ بڑے تمسخر سے ناشتے کی میز پر ناصرہ سے بولیں۔

''اچھا ہوا تم بچ گئیں......'' بھوئیں اچکا کر کہا گیا۔ ''کیوں بھئی......؟'' ناصرہ نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''بھئی آج کے اخبار میں ہی پڑھا ہے، کسی دریا میں کوئی نئی دلہن گر گئی۔ بیچارے ہنی مون منانے گئے تھے۔ بے چارہ دولھا اپنی دلہن کی لاش لے کر آیا...... لو دیکھ لو اخبار میں تصویر تک چھپی ہے۔''

''یہ حادثہ تو کسی کے ساتھ، کہیں بھی ہو سکتا ہے۔'' ناصرہ کو غصہ ہی تو آ گیا۔

''میں نے اخبار میں ہمیشہ ہی پڑھا ہے کہ زیادہ تر دلہن ہی مرا کرتی ہیں۔''

''دولھا بھی مر جاتے ہیں۔'' ناصرہ نے سفاک نظروں سے نند کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہاں ناں...... دولھا نہیں مرتے...... وہ اپنی بہنوں کی دعاؤں کے حصار میں ہوتے ہیں ناں......'' ناصرہ نے غصے سے جہاں آرا بتول کو دیکھا اور تنک کر بولی۔

''آپا جان آپ نہیں جانتیں...... نئے دولھا تو روز مرا کرتے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے، کیسی بری بات اپنی زبان سے نکال رہی ہو تم، ذرا بھی لحاظ تک نہیں ہے کیا تمہیں ہیں......'' پھر انہوں نے آنکھیں پٹ پٹا کر اپنے بھیا کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ ڈانٹو...... اس منحوس کو...... ورنہ میں رو دوں گی۔ تب ناصرہ تمسخر سے ہنستے ہوئے دیوانگی میں بولیں (غصے کا گراف جو 100 درجے کو چھو گیا تھا)

''آپا...... ہر دولھا روز مرا کرتا ہے قسم سے۔''

''ارے نہیں تو......'' وہ پیلی سی پڑ گئیں۔

اور آپ کے بھیا بھی مرا کرتے ہیں۔''

''پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟''

''سچ کہہ رہی ہوں آپا...... آپ کے بھیا بھی مجھ پر مرتے ہیں...... روزانہ مرتے ہیں کہ ہر دولھا اپنی دلہن پر مرتا ہے اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔'' تب آپا دکھ سے اور بھیا جھینپ کر نظریں چرا رہے تھے۔

ایسا بھی ہوتا ہے

رقیہ کی شادی تو ان کی خاصی پکی عمر میں ہوئی تھی۔ بالوں میں مہندی اور تیز کلر لگا لگا کر وہ تھک چکی تھیں مگر شادی کے بعد اُن کی گفتگو کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ سب ان کو کہیں کہ آپ کتنی چھوٹی ہیں، آپ کتنی پیاری سی ہیں۔

''یہ نادر بھائی (ان کے میاں) کی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ان سے شادی کر لی۔'' وہ یہ جملے دوسروں کے نام سے منسوب کر کر کے اپنی سہیلیوں اور کزنز کو سناتیں اور سننے والے ایک دوسرے کو آنکھ مار کر کہنیاں ٹکرا کر ہنستے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے...... کہ وہ میزبان بہت اچھی تھیں۔

ہم بھی ان کے ہاں اس وجہ سے چلے جاتے

تھے کہ وہ ہماری مالک مکان تھیں۔ ہمارے سر پر سوار رہتی تھیں۔ (اوپر کی منزل میں جو رہتی تھیں) ان کی چاپلوسی کرنے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے سے وہ کرایہ آٹھ، دس دن تاخیر سے بھی...... بڑی خوش دلی سے وصول کر لیا کرتی تھیں اور یہ ہمارے لیے بہت بڑی بات تھی۔

گورنمنٹ اسکول کی ٹیچر ہونے کے باعث ہم میاں بیوی کو اپنی تنخواہ خاصی تاخیر سے ملا کرتی تھی۔

ایک شام وہ اپنے گھر میں محفل جمائے بیٹھی تھیں۔

نادر بھائی جو رخصت ہو کر...... (شادی کے بعد) ان کے گھر آ گئے تھے وہ رات کی ہنڈیا پکانے کے لیے سبزی کاٹ رہے تھے اور ان کی ہر چھچھوری بات سن کر زوردار قہقہہ بھی لگا رہے تھے اور وہ شادی سے پہلے گھر آئے رشتوں کا ذکر بڑا ہنس ہنس کر کر رہی تھی۔

''پتا ہے ایک رشتہ میرے لیے پائلٹ کا آیا تھا......'' کیا اس کو نکال دیا گیا تھا...... جملہ میرے منہ میں کلبلایا مگر میں اپنے ہونٹ کاٹ کر خاموش ہی رہی۔

''وہ پائلٹ بہت اچھا تھا...... مجھے تو پسند بھی آ گیا تھا...... مگر اس کی اماں نہ صرف بہت موٹی بلکہ کارٹون جیسی بھی تھیں۔''

''تو کیا ہوا......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکل ہی گیا۔

''اس کے ابا بھی جوکر جیسے تھے...... ہمارے ہاں لال پتلون اور پیلی شرٹ پہن کر آ گئے...... میری بہنوں کی ہنسی ہی نہیں رکی تھی...... ان کو دیکھ کر میرے بھائیوں نے تو فوراً کہہ دیا ہم اپنی فیملی کے لیے کوئی مزاحیہ سیریل تھوڑی ناں شروع کر رہے ہیں کہ لوگ ہماری بہن رقیہ کے سسرالیوں کو دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیں۔ ہم لوگ یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے اور بے چارہ پائلٹ اپنا منہ بسورتے ہوئے چلا گیا۔''

''ہائے بے چارہ......'' ان کے میاں نے زبردستی کا قہقہہ لگایا اور وہ زعم بھری ہنسی ہنس دیں۔

''ایک میرا رشتہ بہت بڑے بزنس مین کا آیا تھا۔'' تو فلی سے کہا گیا...... چاروں طرف چہرہ گھما کر آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دی گئی۔

''مگر اس بزنس مین میں صرف ایک خامی تھی۔''

''وہ لنگڑا ہوگا، نابینا ہوگا۔''

غزل

آنکھوں کے رستے دل میں اتر کر تو دیکھنا
اِک لمحہ وہاں ٹھہر کر تو دیکھنا

ہر وقت سمیٹے رکھتی ہو خوشبو
کبھی اس سے بکھر کر تو دیکھنا

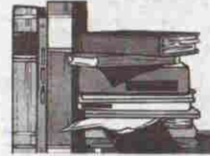
اِک آئینۂ وفا ہوں میں
مجھ میں سنور کر تو دیکھنا

آج بھی میں تیرا منتظر ہوں
کبھی اس راہ سے گزر کر تو دیکھنا

نہیں جانتے اگر غمِ جدائی خضر
چاہتے ہو جسے اس سے بچھڑ کر تو دیکھنا

شاعر: محمد امین خضر
مرسلہ: صائمہ امین، لاہور

"نہیں فالج زدہ؟"
"تو تلا؟"
"گونگا ہوگا۔"
سب نے اپنی اپنی دلی بات ایک ساتھ ہی کہہ دی۔
"نہیں بھئی۔" وہ ہنسیں۔
"تو کیا پاگل تھا؟" میرے منہ سے نکلا اور انہوں نے گھورا۔
"تو کون سی خامی تھی؟"
"وہ انگریزی بہت بولتا تھا۔" وہ پھر ہنسنے لگیں۔
"اے ہے، یہ کوئی خامی ہے؟ یہ تو خوبی ہے۔" میں نے کہا۔
"مگر ہمارے گھر والوں کو تو بہت وحشت ہوتی تھی۔ وہ سوائے انگریزی کے کچھ بولتا ہی نہیں تھا۔ مجال ہے کہ کوئی بھی بات اردو میں تو کرلے۔"
"یہ تو خوبی بھی بہت بڑی والی تھی کہ آپ جہاں جاتیں انگریزی بولتا شوہر ساتھ ہوتا تو سارا کا سارا خاندان ہکا بکا سا رہ جاتا۔"
"یہ بات تو صحیح ہے مگر اس کی انگریزی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔"
"انگریزوں کی طرح بولتا ہوگا؟"
"پتا نہیں وہ تو کوئی دوسری انگریزی بولتا تھا۔"
"دوسری انگریزی کیسی؟"
"اباجی انگریزی کے ماسٹر کو بھی بلالائے۔"
"ارے واقعی؟"
"ہاں بھئی، وہ بزنس مین بہت بڑا والا تھا نا......"
تو پھر......؟"
"انہوں نے بھی کہہ دیا کہ ایسی انگریزی کرہ ارض پر کہیں نہیں بولی جاتی۔"
"تو پھر اس نے کہاں سے جاکر سیکھی؟" نہ جانے میرے منہ سے کیسے نکل گیا مگر میری اس بات پر سب ہی ان کی خفگی کا اندازہ کرنے کے باوجود حلق پھاڑ کر ہنسنے لگے۔
"پھر تو آپ نے صحیح منع کیا......" ان کے چہرے کے بگڑتے جغرافیہ کو دیکھ کر...... میں اپنا قہقہہ حلق میں گھونٹ کر جلدی سے بولی۔
"اور کیا، منع کرنا ہی پڑا ورنہ ان کی امارت سے سارا گھر ہی متاثر ہوا تھا۔" لفظ امارت کو وہ چبا چبا کر بولیں۔
"میرے لیے ایک انجینئر کا رشتہ بھی آیا...... مگر اس کا رنگ بہت کالا تھا مگر بھلا ہو میری خالہ کا انہوں نے یہ کہہ کر رشتہ ریجیکٹ کردیا کہ میری شنیل کی رضائی میں بیٹھا ہوا وہ بہت برا لگے گا۔" تب ہم نے کالے سیاہ نادر بھائی کو دیکھا جو بہ مشکل ہنس رہے تھے یا کھسیا رہے تھے۔ کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہنس رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ بغور دیکھنے کے باوجود کچھ بھی پتا نہیں چل رہا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ اتنا سیاہ فام شخص ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ جو غیر تعلیم یافتہ بھی تھے، بے روزگار بھی تھے۔ (ظاہر ہے ہونا ہی تھا) ذات پات بھی...... ان کی باجی سے کوئی میل نہیں کھاتی تھیں۔ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ ان کی پہلی بیوی اور بچے گاؤں میں رہتے ہیں اور یہ ان کی دوسری شادی ہے مگر شاید...... نادر بھائی شادی کے ان اشتہارات سے سو فی صد مناسبت رکھتے تھے جن میں واضح لکھا ہوتا ہے۔ تعلیم، زبان، ذات پات کی کوئی قید نہیں، دوسری شادی کرنے والے بھی اپلائی کرسکتے ہیں۔
پہلے آیئے...... پہلے پایئے......



میرا انتخاب
آمنہ حماد

محبت سمندر کی گہرائیوں میں چھپا ایک گوہر ہے۔ جس میں چاہت جیسا انمول موتی موجود ہے...... محبت ایک دھنک ہے، جس میں ہر رنگ نمایاں ہوتا ہے...... محبت صرف عاشق کا مرتبہ ہی نہیں بڑھاتی بلکہ محبوب کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی اس غزل کا انتخاب فوزیہ مستقیم نے کراچی سے کیا ہے۔

غزل

سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
دل کو چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اب میں سوجان سے اس طرز تکلم کے نثار
پھر تو فرمایئے کیا آپ نے ارشاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد کیا
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب بھی کھلی
جھک کے میں نے کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا



جذبۂ عشق نئی دنیاؤں کی دریافت کا حوصلہ عطا کرتا ہے...... ایسی دنیائیں جن کے طلسم میں اگر کھو جائیں تو جذبۂ شوق کہیں رکنے نہیں دیتا...... محبوب کی یادیں اور باتیں فیض احمد فیض کی نظم "کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے" میں مجسم نظر آرہی ہیں۔ اس نظم کو حبیبہ نور نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے

گلشن یاد میں گر آج دم باد صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمر رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساس زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
ان کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا
گرد ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دم دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو



تنہائی ایک کیفیت کا نام ہے۔ دلِ گداز اسے کئی رنگوں میں محسوس کرتا ہے...... درد کے کتنے ہی عنوانات سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ درد کہیں کہیں شعروں میں ڈھل کر نغمے کی صورت صدا بن جاتا ہے...... یہ صدا شاعر کا لب ولہجہ کہلاتا ہے۔ رسا چغتائی کی اس غزل میں ان کی شاعری کی مخصوص کیفیت اور لب ولہجہ ہے، اس کا انتخاب میمونہ عزیز نے چکوال سے کیا ہے۔

غزل

ایک راہِ خیال پر تنہا
میں اِدھر اور وہ اُدھر تنہا
سوچتے ہیں وہ کیوں نہیں ہوتا
آ کہ سوچیں یہ بیٹھ کر تنہا
ہم نے دیکھے ہیں شام کے سائے
ہم نے کاٹی ہے دوپہر تنہا
زندگی اور اس قدر مصروف
آدمی اور اس قدر تنہا
بس یہیں تک ہے قصۂ درویش
اس سے آگے ہے اب سفر تنہا
پھر وہی دھوپ پھر وہی سائے
بستی بستی نگر نگر تنہا
پھر وہی موسمِ شجر کاری
پھر وہی شاخِ بے ثمر تنہا
خواب تھا وہ کہ جل رہا تھا رات
بیچ دریا میں کوئی گھر تنہا
کس بھری دوپہر میں بیٹھا ہے
راہ میں سایۂ شجر تنہا
انقلابات ہیں زمانے کے
ورنہ تم اور میرے گھر تنہا



زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک سرسری سی ملاقات ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ رات کے عمیق سناٹے میں کسی کی سرگوشی یا کسی کا پکارنا...... ہمیں ایک ایسی خوشی اور سرشاری کی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے...... کہ ہم ہمیشہ کے لیے اس ایک شوخ سی سرگوشی کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کا اظہار پروین شاکر اپنی نظم ردِعمل میں کرتی نظر آرہی ہیں۔ ریحانہ وسیع کا انتخاب کوئٹہ سے۔

ردِ عمل

گئے موسم کے کسی لمحے میں
تو نے اس طرح پکارا تھا مجھے
جیسے مدھم کا بہت میٹھا سُر
روح کا کوئی سرا چھو جائے
جیسے شبنم کا اکیلا موتی
عارضِ برگِ حنا چھو جائے
جیسے اِک موج ہوا کی صورت
رات کی رانی سے کچھ بات کہے
جیسے بچپن کی سہیلی میری
شوخ لہجے میں تری سی بات کہے



کبھی ایسا ہوتا ہے ہم ایسے لمحہ تسخیر میں کسی سے ملتے ہیں کہ اس لمحے کے سحر سے نکل نہیں پاتے۔ دل سے کوئی نقش کبھی مٹتا نہیں ہلکا یا گہرا ہوتا ہے۔ یہ

رنگ احمد فراز کی اس غزل میں بھی نمایاں ہے۔ اس کا انتخاب راحیلہ خان نے حیدرآباد سے کیا ہے۔

غزل

تھا عبث ترکِ تعلق کا ارادہ یوں بھی
عشق زندہ نہیں رہتا ہے زیادہ یوں بھی
اِک تو ان آنکھوں میں نشہ تھا بلا کا اس پر
ہم کو مرغوب ہے کیفیتِ بادہ یوں بھی
سوگئے ہم بھی کہ بیکار تھا رستہ تکنا
اس کو آنا ہی نہیں تھا شبِ وعدہ یوں بھی
کچھ تو وہ حسن پشیماں ہے جفا پر اپنی
اور کچھ اس کے لیے دل تھا کشادہ یوں بھی
کوچ کر جاتے ہیں ہم کوئے محبت سے فراز
ان دنوں چاک گریباں ہیں زیادہ یوں بھی



ادب معاملاتِ محبت کی طرح اپنے موضوع کے انتخاب میں آزاد ہے۔ کیا محبت کسی دل میں داخل ہونے کے لیے اجازت مانگتی ہے...... محبت ہر قانون و قاعدے سے بالاتر ہوتی ہے بلکہ محبت تو نام ہی قواعدہ ضوابط کو پاش پاش کرنے کا ہے۔ محبت وہاں ہوتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہیے، ویسے ہوتی ہے جیسے نہیں ہونی چاہیے اور تب ہوتی جب نہیں ہونی چاہیے۔ محبت کا یہی انداز ظریف احسن کی اس نظم میں پنہاں نظر آرہا ہے۔ اس کا انتخاب کیا ہے فرحانہ نے جہلم سے کیا ہے۔

محبت

سب اپنے چاہنے والوں کی خوشبو سے
دکانِ دل، متاعِ جاں سجاتے ہیں
تعلق کو نبھاتے ہیں
بہت سے لوگ اس کو
کھو بھی دیتے ہیں، بہت سے پا بھی لیتے ہیں
مقدر اپنا اپنا ہے
مگر یہ سب کا کہنا ہے
مجھے تم سے محبت ہے
مگر میں یہ نہیں کہتا
مجھے تم سے محبت ہے
میں جب بھی یہ نہیں کہتا
مجھے تم سے محبت ہے
تو پھر میں یہ نہیں سنتا
اسے مجھ سے محبت ہے
سب ہی یہ بات لکھتے ہیں
مجھے تم سے محبت ہے
سب ہی یہ بات پڑھتے ہیں
مجھے تم سے محبت ہے
مگر میں یہ نہیں لکھتا
مجھے تم سے محبت ہے
تو پھر یہ بھی نہیں پڑھتا
اسے مجھ سے محبت ہے
یہ سچ ہے میں نہیں کہتا
یہ سچ ہے میں نہیں لکھتا
مگر وہ سنتا رہتا ہے مگر وہ پڑھتا رہتا ہے
مجھے اس سے محبت ہے
محبت ہے...... محبت ہے!



سندیسے



مانگو تو سہی

کبھی اپنے بجائے
دوسروں کے لیے دعا
دل سے مانگ کر تو دیکھو
تمہیں اپنے لیے دعا
مانگنے کی کبھی بھی
ضرورت نہیں ہوگی

از: الیاس فاطمہ...... اسلام آباد

مت کرو

☆ مت خواہش کرو، اس چیز کی جو تمہیں زندگی سے دور کر دے۔

☆ مت چاہو کسی کو اتنا کہ اس کے بچھڑنے کا غم نہ سہہ سکو۔

☆ مت روٹھو کسی سے بے وجہ کہ سدا پچھتاتے ہی رہو۔

☆ مت ظلم کرو کسی پر اتنا کہ وہ برداشت نہ کر پائے۔

☆ مت گناہ کرو اس قدر کہ روزِ محشر معافی بھی نہ مانگ سکو۔

☆ مت کرو وہ بات جس کا حاصل کچھ نہ ہو۔

☆ مت قضا کرو نماز کہ پھر ادا نہ کر سکو۔

☆ مت کرو وہ کام جو تباہی و بربادی کا باعث بنے۔

مرسلہ: امینہ عندلیب...... سلانوالی

وجہ

شاہد نے جب منگنی کر لی تو اس نے اپنی منگیتر سے کہا کہ کسی کو ہرگز یہ مت بتانا کہ ہم نے منگنی کر لی ہے۔

منگیتر نے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی کو ہرگز یہ نہیں بتائے گی سوائے اپنی چچازاد بہن کے۔

وہ کیوں......؟ شاہد نے پوچھا۔

صرف اس لیے کہ وہ کہتی ہے کہ دنیا میں کوئی احمق ایسا نہیں ہے جو مجھ سے منگنی کرے گا۔

مرسلہ: صاعقہ ریاض...... حیدر آباد

غزالہ جلیل راؤ، فریدہ جاوید فری، نوشین اقبال نوشی کے نام

غزالہ جلیل آپ کو آپ کی کتاب محبت طاقِ دل پر شائع ہونے پر بے حد مبارکاں اور اگلے شاعری انتخاب کی اشاعت پر بھی۔ فریدہ جاوید آپی اور نوشین اقبال نوشی آپ دونوں کو بھی بے حد مبارک باد۔ آپ لوگوں کا کلام بھی کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ اللہ آپ لوگوں کو مزید کامیابیاں دے، آمین!

مرسلہ: بشریٰ باجوہ...... اوکاڑہ

علیشاہ کے نام

تیری اس ادا سے بھی ہوں آشنا تجھے جس پہ اتنا غرور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی مجھے زندگی کا شعور ہے
جو سمجھ لیا تجھے بے وفا تو اس میں تیری کیا ہے خطا
یہ خلل ہے میرے دماغ کا یہ میری نظر کا قصور ہے
کوئی بات دل میں ٹھان کے نہ الجھ پڑے تیری شان سے
وہ نیاز مند جو کہ سر بہ خم کئی دن سے تیرے حضور ہے

مرسلہ: ناہید صدیقی...... کورنگی کراچی

باجی عذرا رسول کے لیے

کاش کہ مل جائے مجھے مقدر کی وہ سیاہی اور قلم
ہر ہر لمحے لمحے کی خوشی لکھ دوں
آپ کی زندگی کے لیے love you
Aapi

مرسلہ: جبیں ہاشمی...... بھیرہ

خواب مت دکھاؤ

غضب کرتے ہو تم کیسا
یہ کیسا عذاب دیتے ہو
جن کی تعبیر ہی نہیں ممکن
میری آنکھوں کو خواب دیتے ہو

مرسلہ: تانی چوہدری...... آکسفورڈ، یو کے

عبداللہ کے نام

جنم دن مبارک ہو
کہ تیرے جنم دن پر خدا پاک
تجھے وہ سب کچھ عطا کرے
جس کی تمنا تیرے دل نے کی ہر وہ خواہش جو تیرے لبوں پر
مچلتی ہو پوری ہو
اور تیری یہ روشن آنکھیں ہمیشہ چمکیں
تیری معصوم مسکراہٹ سدا تیرے لبوں پر رہے
خوشیوں سے تیرا دامن ہمیشہ بھرا رہے
اور خدا پاک تیری عمر دراز کرے

مرسلہ: ذوالنورین...... ہری پور ہزارہ

کردار

شرافت یہ نہیں کہ لڑکی کو کمرے میں بند کر دیں اور کہیں کہ وہ شریف ہے بلکہ شرافت یہ ہے کہ اسے سڑک پر اکیلا چلنے دیں اور دیکھیں کہ وہ وہاں بھی اپنے کردار کی حفاظت کر سکتی ہے۔

اسے بگڑنے کا اختیار دیں، وہ نہ بگڑے تو یہی اس کا کردار ہے۔

مرسلہ: صبا نور...... لیہ

روزانہ

میں اپنی بہت ہی پیاری بہنوں کو یہ سندیسہ دینا چاہتی ہوں کہ وہ قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھا کریں۔ خواہ روزانہ تھوڑا ہی سہی۔

مرسلہ: تسنیم رضا ذوالفقار...... فیصل آباد



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆رابعہ سعید......خانیوال
چھوئیں گے اڑ کے فضاؤں میں ماہِ کامل کو
بلند ہو کے نہ دیکھیں گے اب وہ ساحل کو
لگا کے تیر کو ترکش میں ایسا لگتا ہے
نشانہ صرف بنائیں گے وہ میرے دل کو

☆فائزہ وہاب......کوئٹہ
جڑتے ہوئے دیکھا نہیں ٹوٹے ہوئے دل کو
گر جائیں جو آنسو تو اٹھائے نہیں جاتے

☆ساجدہ ریاض......چکوال
اس نے کہا کہ تمہیں مجھ سے کتنا پیار ہے
میں نے کہا ستاروں کا کوئی شمار ہے
اس نے کہا کہ کون سا تحفہ ہے من پسند
میں نے کہا وہ شام جواب تک ادھار ہے

☆زرینہ......کراچی
چبھتی ہے قلب وجاں کو ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے

☆فاخرہ سجاد......لاہور
شکست یوں تو قبول اس محاذ پر کی تھی
یہ بات ہم نے مگر تجھ سے پوچھ کر کی تھی
ہجوم ہم سفراں ساتھ تھا مگر پھر بھی
پسِ سفر بھی تو تنہائی اِک سفر کی تھی

☆میمونہ عزیز......اسلام آباد
ختم ہونے کو ہیں اشکوں کے ذخیرے بھی جمال
روئے کب تک کوئی اس شہر کی ویرانی پر



☆زہرہ......میاں چنوں
بہا جو آنکھ سے کاجل تو یہ سوال ہوا
وہ شخص کون تھا جس کا مجھے ملال ہوا

☆سلطانہ شبنم......منڈی بہاؤالدین
خشک آنکھوں سے بھی اشکوں کی مہک آتی ہے
میں تیرے غم کو زمانے سے چھپاؤں کیسے
پھول ہوتا تو تیرے در پہ سجا بھی دیتا
زخم لے کر تیری دہلیز پہ آؤں کیسے

☆شگفتہ شاذ......لاہور
یوں دل کے تڑپنے کا کچھ تو ہے سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی یا تو نے اِدھر دیکھا

☆عائشہ نعیم......کراچی
پھر اس کے بعد تمہیں اور کچھ نہ بھائے گا
ہمارے چہرے کو دیکھو کتاب رہنے دو
اب اپنی یاد کی خوشبو بھی ہم سے چھینو گے
کتابِ دل میں یہ سوکھا گلاب رہنے دو

☆نرگس حمید......شیخوپورہ
کہیں کوئی غم کوئی سلگتا خیال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
عجیب رُت ہے کسی کی یادیں سنبھال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
اسے یہ کہنا وہ مجھ سے ملنے کبھی نہ آئے کہ اس نگر میں
دلوں کو آباد بستیوں کی مثال رکھنا بھی جرم ٹھہرا

☆حفصہ......کراچی
جو رات کی ساعت ہے تو چمکے کوئی جگنو
گر صبح کا عالم ہے تو سورج کو نکالو

☆سعدیہ خاور......اوکاڑہ
خود سے روٹھوں تو کئی روز نہ خود سے بولوں
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رو لوں
تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

☆نہاں عزیز......کراچی
جب نئے موسم کے پہلو میں سکوں پاؤ نہ تم
میری تحریریں پرانی کاپیوں میں ڈھونڈنا
نارسائی کی اذیت جب کبھی سونے نہ دے
ہولے سے اٹھنا مجھے میرے خطوں میں ڈھونڈنا

☆رابعہ مریم......جہلم
تم آسماں کی بلندیوں سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

☆انجم شہزادی......شکار پور
بے شجر شہر میں گھر اس کا کہاں تک ڈھونڈوں
وہ جو کہتا تھا کہ آنگن میں صنوبر ہوگا

☆آصفہ غفار......حیدر آباد
جس طرح رنج میں آنکھوں میں نمی کا ہونا
ایسا ہوتا ہے محبت میں کسی کا ہونا
تیرا سورج کے قبیلے سے تعلق تو نہیں
یہ کہاں سے تجھے آیا ہے سبھی کا ہونا

☆زبیدہ ظفر......راول پنڈی
اے حسرتِ دیدار یہ کیا راز ہے آخر
وہ سامنے آتے ہیں تو دیکھا نہیں جاتا

☆فاطمہ......ٹوبہ ٹیک سنگھ
انا کی آگ میں چاہت کے پھول جھونکے گا
وہ اعتبار کی آنکھوں میں دھول جھونکے گا
جو اختلاف کی آتش کبھی بھڑک اٹھی
تو مجھ کو ڈر ہے وہ پہلے اصول جھونکے گا

☆فرحت زریں......لاڑکانہ
خدا کرے چمکو مثالِ انجم تم
جو ہر سو کر دے اجالا وہ آفتاب رہو
پڑھے جو تم کو وہ تم کو نہ بھولنے پائے
محبتوں سے جو مہکے وہ تم گلاب رہو

☆فرزانہ......چکوال
برسوں کا ساتھ چھوڑ کر وہ اس طرح گیا
جیسے کوئی ستون گرا ہو مکان سے

☆نازیہ کنول......گوجرانوالہ
رُتوں پہ بس نہ چلا ورنہ یہ چمن والے
ہوائیں بیچتے نیلام رنگ و بو کرتے

☆شازیہ غفار......لطیف آباد
کیا کہیں کیسے بسر ہجر کی راتیں کی ہیں
عمر بھر چاند سے اِک شخص کی باتیں کی ہیں

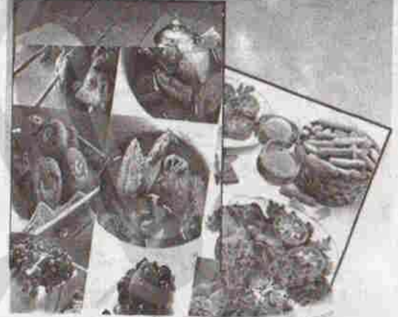
☆سائرہ ڈوگر......آزاد کشمیر
ہے بددعا سے بھی بدتر دعائے عمرِ دراز
اس ایک شخص کو جینے کی جس کو آس نہ ہو
نصیر کھیل نہیں شعورِ ذات و صفات
خدا شناس کہاں وہ جو خود شناس نہ ہو

☆ریحانہ فیاض......چکوال
ہمارے نام تو رسوائیاں ہی لکھی ہیں
وہ معتبر ہے اسے معتبر ہی رہنا ہے
کسی کے گھر کو گرا کر بنالیں اپنا مکاں
ہنر ہے یہ تو ہمیں بے ہنر ہی رہنا ہے

☆☆☆......☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



قیمہ انڈوں کی پوری

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ لال مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ میدہ، ایک کپ۔ دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سوجی، دو کھانے کے چمچ۔ دہی، تین چوتھائی کپ۔ تیل، ایک کپ۔ انڈے، دو عدد۔ ہری مرچ، تین عدد۔ آلو، دو عدد۔ گھی فرائی کے لیے۔ ہرا دھنیا،..... چار کھانے کے چمچ۔ پودینہ، دو کھانے کے چمچ (کٹا ہوا)۔ گرم مسالا، دو کھانے کے چمچ۔ سفید زیرہ (پسا ہوا)، ایک چائے کا چمچ۔ ادرک (کٹی ہوئی)، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: میدہ، سوجی اور نمک کو گرم پانی کے ساتھ سخت گوندھ لیں اور آدھے گھنٹے تک ڈھانپ کر رکھیں۔ انڈے اور آلو کو ابال کر ایک ساتھ مکس کرلیں۔ ہری مرچ، دھنیا اور نمک ملالیں۔ ایک کڑاہی میں تیل دو کھانے کے چمچ ڈال کر گرم کریں، اس میں زیرہ ڈال کر قیمہ اور سب مسالے شامل کردیں اور اس کو اتنا پکائیں کہ قیمہ گل جائے پھر اچھی طرح بھون لیں۔ اس کے بعد دہی شامل کریں جب پانی خشک ہوجائے تو اس پر ہرا مسالا، گرم مسالا، انڈے، آلو کا مکسچر سب ساتھ ملادیں۔ گوندھے ہوئے میدے کے گول پیڑے بنالیں اس کے درمیان میں قیمہ، انڈوں کا مکسچر رکھیں پھر گول پوری بیلیں۔ یہ دھیان رکھیں کہ اس پوری میں رکھا ہوا مکسچر باہر نہ نکل آئے۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے تل لیں۔ گولڈن ہونے پر نکال لیں۔ پوریوں کو املی کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

حنا عزیز...... کراچی

سبزیوں کے کٹلس

اشیا: گاجر درمیانی سائز کی، دو عدد۔ شلجم درمیانہ سائز کے، دو عدد۔ شملہ مرچ، ایک عدد۔ بند گوبھی، آدھا پاؤ۔ مٹر، ایک پاؤ۔ ہری پیاز، آدھا پاؤ۔ ہری مرچ، حسبِ ذائقہ۔ آلو، ڈیڑھ کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کارن فلور آدھا کپ۔ تیل، حسبِ ضرورت کٹلس تلنے کے لیے۔ مولی، ٹماٹر، کھیرا، چقندر، ایک ایک عدد (سلاد کے لیے)

ترکیب: آلو ابال کر اچھی طرح ہاتھ سے بھرتا کرلیں اس میں الگ سے ایک کھانے کا چمچ نمک، ایک کھانے کا چمچ کٹی مرچ اور بھنا ہوا سفید زیرہ کھانے کا ایک چمچ پیس کر ملادیں اور کارن فلور بھی ملائیں پھر تمام سبزیاں کاٹ لیں (زیادہ باریک نہ ہوں) اور ابلے ہوئے مٹر سمیت ذرا سے تیل میں فرائی کرلیں مگر سبزیاں زیادہ گلنے نہ پائیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کسی کاغذ پر پھیلادیں اور تیل خشک ہوجائے تو پسے ہوئے آلو کا کباب کی طرح پیڑا بنائیں اور اس میں تھوڑی سبزی ڈال کر تھوڑے سے پسے ہوئے آلو سے منہ بند کریں اور اس طرح تمام کٹلس تیار کرکے کباب کی طرح تل لیں۔ سلاد تیار کرکے

سبزیوں کے گول گول قتلے رکھ دیں اور گرم گرم کٹلس درمیان میں رکھ کر پیش کریں۔

ہما شیخ...... سرگودھا

چیز بالز اسنیکس

اشیا: آلو ابلے اور میش کیے ہوئے، دو عدد۔ بوائل چکن، ایک کپ۔ پنیر کدوکش کیا ہوا، چار چمچ۔ پیاز، ایک عدد باریک کٹی ہوئی۔ کالی مرچ پسی ہوئی، ایک چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ہرا دھنیا کٹا ہوا، دو چمچ۔ انڈے، دو عدد۔ بریڈ کرمز، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: ایک بڑے باؤل میں انڈے اور بریڈ کرمز کے علاوہ تمام اشیا ڈال کر خوب مکس کرلیں اور بالز بنالیں۔ انڈوں کو علیحدہ پھینٹ لیں پھر بالز کو پہلے انڈوں میں ڈبو کر پھر بریڈ کرمز میں لپیٹ کر سرخ تل لیں۔ چٹنی یا کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

شبانہ مجید...... حیدرآباد

شاہی کوفتے

اشیا: قیمہ (باریک)، ایک کلو۔ گھی، ڈھائی پاؤ۔ سرخ مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پیاز، دو عدد۔ بھنے اور چھلے ہوئے چنے، تھوڑے سے۔ دھنیا، آدھا چائے کا چمچ۔ ادرک، ایک چھوٹی گانٹھ۔ لہسن، دو پوتھی۔ ٹماٹر، دو عدد۔ سفید زیرہ، ایک چھٹانک۔ پسا ہوا گرم مسالا، تین تولہ۔ خشخاش، ایک تولہ۔ ہرا دھنیا، تھوڑا سا۔ ہری مرچیں، چھ عدد۔ دہی، ایک پاؤ۔

ترکیب: قیمہ سل پر پیس کر مزید باریک کرلیں پھر اس میں نمک، آدھی پیاز، لہسن کے آدھے جوے، آدھی ادرک، چنے اور خشخاش باریک پیس کر اور ہرا دھنیا اور ہری مرچیں کاٹ کر ملادیں۔ اس مرکب کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر رکھ لیں پھر فرائی پان میں گھی کڑکڑائیں اور کوفتے ایک، ایک کرکے اس میں تلنے کے بعد پلیٹ میں رکھ لیں پھر بچی ہوئی آدھی پیاز کو اسی گھی میں کوفتے تلنے تھے ڈال کر اسے لال کریں پھر گھی سے نکال کر پیس لیں۔ اس کے بعد لہسن کے باقی جوے اور آدھی ادرک کتری ہوئی وہ بھی گھی میں بھون لیں اس کے بعد پسی ہوئی پیاز، نمک، مرچ، دھنیا، سفید زیرہ، دہی اور ٹماٹر کا سالن تیار کریں اور تلے ہوئے کوفتے اس میں ڈال کر پکنے دیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو مناسب مقدار میں گریوی رکھ کر چولھے سے اتارلیں اور پسا ہوا گرم مسالا چھڑک کر پتیلی فوراً ڈھانک دیں۔ چند منٹ بعد شاہی کوفتے تناول فرمائیں۔

صائمہ امین...... لاہور

آلو اور مچھلی کے کٹلس

اشیا: آلو، ایک پاؤ۔ مچھلی، آدھا کلو۔ انار دانہ، آدھا پاؤ۔ لہسن، ایک پوتھی۔ خشک دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ اجوائن، ایک چھٹانک۔ کھٹائی پسی ہوئی، تین چائے کے چمچ۔ ٹماٹر، تین عدد۔ آٹا، آدھا پاؤ۔ گھی، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: مچھلی کے قتلوں کو دھو کر صاف اور خشک کرلیں اب انار دانہ، دھنیا، سرخ مرچ، اجوائن اور لہسن باریک پیس لیں۔ پسا ہوا مسالا مچھلی کے قتلوں پر اچھی طرح لگائیں۔ مچھلی پر خشک کھٹائی ملا کر آٹا لگائیں۔ فرائی پین میں گھی گرم کریں۔ گرم گھی میں مچھلی کے قتلے ڈال کر دھیمی آنچ پر تلیں۔ سرخ ہوجائیں تو ڈش میں نکال لیں پھر آلو چھیل کر لمبوترے ٹکڑے کرلیں۔ کٹے ہوئے آلو گھی میں ہلکی آنچ پر تل لیں ایک ڈش میں تلے ہوئے مچھلی کے کٹلس رکھیں۔ چاروں طرف آلو رکھیں آخر میں ٹماٹر کے گول ٹکڑے سجادیں۔ آلو اور مچھلی کے کٹلس تیار ہیں۔

روحانی مشورے

ادارہ



سب سے زیادہ عظمت والی آیت

حضرت ابی بن کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابو المنذر (یہ حضرت ابی بن کعبؓ کی کنیت ہے) کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس قرآن کریم میں سے کون سی آیت سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟ میں نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ارشاد فرمایا: اے ابو المنذر کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس اللہ کی کتاب میں سے کون سی آیت سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟ میں نے جواب دیا (**اللہ لا الہ الا ھوالحی القیوم**) یعنی آیت الکرسی سب سے زیادہ عظمت والی آیت ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اے ابو المنذر تمہیں علم مبارک ہو۔" (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۔185)

جھوٹ کی بدبو

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو (انسان کی حفاظت کرنے والے) فرشتے ایک میل دور چلے جاتے ہیں اس بات کی بدبو کی وجہ سے جس کا اس نے ارتکاب کیا۔ (رواہ، ترمذی، مشکوٰۃ۔ ص۔43)

تشریح: جس طرح مادی چیزوں میں خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اسی طرح اچھے اور برے کلمات میں بھی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے۔ جس کو اللہ کے فرشتے اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم مادی چیزوں کی خوشبو اور بدبو کا احساس کرتے ہیں اور کبھی کبھی اللہ کے وہ بندے بھی اس کو محسوس کرتے ہیں جن کی روحانیت ان کی مادیت پر غالب آجاتی ہے۔ (اصلاح معاشرہ۔ص۔55)

شادی میں بندش ختم کرنے کے لیے

سورۂ طٰہٰ دن میں ایک مرتبہ لازمی پڑھیں۔ خصوصاً وہ لڑکیاں، جن کے رشتوں پر بندش ہے یا کسی قسم کا بھی جادو ہو۔ انشاء اللہ ان کی شادی اچھی جگہ اور جلد ہوگی۔

وسعتِ رزق کے لیے

سورۂ مزمل کی آیت نمبر 07 دن میں دس مرتبہ پڑھنی ہے۔ کسی بھی وقت ایک ماہ تک پڑھنی ہے۔ انشاء اللہ آپ کے رزق میں کشادگی ہوگی۔

اولادِ نرینہ کے لیے

بے حد آزمودہ...... بے شمار پاکیزہ بہنوں نے بھی اس دعا سے فائدہ اٹھایا ہے۔ قبل از وقت حمل سے ہی سورۂ محمد نمازِ عصر کے بعد پڑھنی شروع کر دیں اور حمل کے نو ماہ تک روزانہ پڑھیں۔ بیٹے کا نام اسلامی رکھیں۔ نام سے پہلے محمد ضرور لگائیں۔ مراد پوری ہو جانے کے بعد شکرانے کے نفل پڑھیں اور کسی غریب کی مدد کریں۔

کام کی باتیں

1 - بچے کو اگر پیمپی سے ریشز ہو جائیں تو آدھا حصہ سرسوں کا تیل اور آدھا حصہ پانی ملا کر لگائیں اور پیمپر باندھ دیں۔ دونوں کو اتنا ملانا ہے کہ تیل اور پانی کی رنگت دودھیا ہوجائے۔

☆☆☆

2- اگر بچوں یا بڑوں کو گرمی دانے نکل آئیں تو ایک پاؤ دہی ململ کے کپڑے میں باندھ کر لٹکا دیں۔ جب پانی نچڑ جائے تو جتنا توتھ پک کے سرے پر نیلا تھوتھا آتا ہے اتنا اس میں ملا کر دانوں پر لگائیں۔ دو تین دفعہ لگانے سے ہی سکون آجائے گا۔

☆☆☆

3- بعض اوقات ایسا پھوڑا نکل آتا ہے جس کا منہ نہیں بنتا اور وہ سخت تکلیف دیتا ہے ایسے میں پتھر چٹ (ایک پودا) کا ایک پتا لے کر اوپر سرسوں کا تیل اچھی طرح لگا کر توے پر دونوں طرف سے گرم کر کے پھوڑے پر باندھ دیں۔ اگر صبح لگایا ہے تو شام کو دوسرا باندھیں۔ انشاء اللہ تین چار دفعہ کرنے سے منہ بن کر پھٹ جائے گا۔

☆☆☆

4- تین قطرے روغنِ کلونجی اور تین قطرے روغنِ نیم ایک ٹی اسپون شہد میں ملا کر منہ میں رکھ کر اوپر سے پانی پی لیں روزانہ استعمال کرنے سے بواسیر کو آرام آجائے گا اور وزن بھی کم ہوگا۔

☆☆☆

5- اگر سینہ ریشے کی وجہ سے جکڑا ہوا ہو تو دن میں دو دفعہ دیسی لہسن کے دو جوے چھیل کر خشک روٹی کے نوالے میں رکھ کر چبا کر کھالیں۔۔ بہت فائدہ ہوگا۔

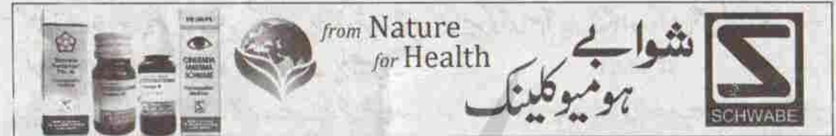
☆☆☆

6- دائمی نزلہ اور زکام ہو یا صبح سویرے اٹھ کر اگر بہت چھینکیں آئیں تو ثابت خشک ناریل لیں۔ اس کے اوپر والے حصے میں سوراخ کر کے اندر اسپغول کا چھلکا بھریں پھر میدہ گوندھ کر پتلی روٹی پکا کر ناریل کے اوپر اچھی طرح لپیٹ دیں۔ دیسی گھی میں فرائی کریں جب روٹی گلابی ہوجائے تو اسے کوٹ کر باریک کر کے بھونیں، ضرورت کے مطابق بادام، چاروں مغز، پستے، میوہ اور چینی ڈال لیں۔ ہر روز صبح نہار منہ ایک ٹی اسپون یا دل چاہے تو ٹیبل اسپون گرم دودھ کی پیالی کے ہمراہ لیں۔

رسولیاں اگر ہوجائیں تو......

اکثر خواتین کے بچے دانی میں رسولیاں ہو جاتی ہیں۔ جسے ڈاکٹرز کے مطابق بچہ دانی آپریشن کروا کے نکلوا دینی چاہیے۔ سورۂ فاتحہ اکتالیس بار پڑھ کر پانی پر دم کیا جائے اول و آخر درود ابراہیمیؑ کے ساتھ......اور وہی پانی تین ماہ تک پینے سے یہ رسولیاں اللہ کے حکم سے ایسی غائب ہوجاتی ہیں کہ جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔ تین ماہ بعد الٹرا ساؤنڈ کروا کر اپنی تسلی بھی کر لیں۔ پیاری بہنوں سورۂ فاتحہ اتنی بہترین دعا ہے کہ بے شک آپ صحت مند ہوں تب بھی روزانہ پانی پر دم کر کے پیا کیجیے۔

☆☆☆



اس بات کی ضرورت کافی عرصہ سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بچوں کی اچھی صحت کے لیے

ہومیو پیتھک علاج کی افادیت

ننھے مُنّے پھول سے بچے کسے اچھے نہیں لگتے اور کیوں نہ لگیں یہ ہمارا مستقبل ہیں کیونکہ آج کے

ان ہی پھول جیسے نرم و نازک بچوں کو کل مستقبل میں بھاری اور پُرخار ذمے داریوں کو سنبھالنا ہے۔ ان کی پرورش جتنی زیادہ احتیاط کے ساتھ صحت مند ماحول میں ہوگی یہ اتنے ہی اس قابل ہوں گے اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے۔

بچوں کی صحت کے متعلق جب ہم بات کریں گے تو اس کو ہم مختلف مدارج میں تقسیم کریں گے تاکہ بچے کی صحت ہم اچھے طور پر سمجھ سکیں۔

1۔ پیدائش سے پہلے
2۔ پیدائش کے بعد 3 ماہ تک
3۔ 4 ماہ سے 2 سال تک
4۔ پری اسکول بچے
5۔ اسکول جانے والے بچے

1۔ پیدائش سے پہلے

پیدائش سے پہلے عموماً بچے کی فکر اتنی نہیں کی جاتی یا اس کے متعلق اتنا نہیں سوچا جاتا جبکہ حمل ٹھہرنے کے بعد ہی بچے کے متعلق ضرور خیال کرنا

چاہیے۔ اس طرح نہ صرف ماں کی صحت کا خیال ہوگا بلکہ بالواسطہ بچے کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا اس کے لیے سب سے پہلے ماں کو ایک اچھا ماحول دیں، دین کی طرف راغب ہوں کیونکہ اس سے بچے کا ذہن اچھا ہوگا، ماں کے جسم میں اچھی تبدیلیاں ہوں گی جو بچے پہ اچھے اثرات مرتب کریں گی۔

ماں کی خوراک متوازن ہو اور اس میں آئرن اور کیلشیم والی غذائیں وافر ہوں تاکہ نہ صرف یہ کہ ماں کی ضرورت پوری ہو بلکہ ہونے والے بچے کی غذائی ضروریات بھی پوری ہوں۔ اس میں خون کی کمی نہ ہو، ہڈیاں اور دیگر اعضا صحیح رہیں۔

صاف ستھری ہوا میں چہل قدمی اور ورزش (ڈاکٹر کے مشورے سے) دورانِ حمل صرف اور صرف ہومیو پیتھک ادویات کا استعمال ڈاکٹر کے مشورے سے کریں کیونکہ یہ ادویات بچے پر کوئی برا یا کوئی سائیڈ ایفیکٹ نہیں کرتیں۔ بچے کی پیدائش میں آسانی کے لیے اور بسا اوقات آپریشن کے بغیر بھی زچگی ہومیو پیتھک ادویات سے ممکن ہے۔

2۔ پیدائش کے بعد

بچے کی پیدائش کے بعد ماں کے زخم، ٹانکے، درد، کمزوری وغیرہ کے لیے ہومیو پیتھک ادویات کا استعمال ماں اور بچہ دونوں کے لیے مفید ہوتا ہے۔ پیدائش یا اس کے کچھ عرصہ بعد ماں کو دودھ نہ آنے/کم ہونے کی شکایات عام ہیں۔ اس کے لیے ماں کو اچھا ماحول، اچھی غذا دی جائے اگر اس کے باوجود مسئلہ برقرار رہے تو ہومیو پیتھی میں اس کے لیے کئی ایک ادویات موجود ہیں۔

بچے کو پیدائشی یرقان کوئی خوف کھانے کی بات نہیں ہے۔ آج کل یہ بچوں میں بہت عام ہے اس



کے لیے بھی مؤثر ادویات ہیں جو 3 سے 7 دن میں اس کو بالکل ٹھیک کر دیتی ہیں۔ بچے کے پیٹ میں گیس/مروڑ پیدائش سے 4 ماہ تک کے بچوں میں یہ شکایت بھی بہت عام ہے، یہ عموماً شام سے شروع ہوتی ہے اور رات کو انتہائی شدید ہوجاتی ہے۔ ماں باپ ہی کیا سارا گھر پریشان ہوجاتا ہے۔ سکائی سے، دودھ دینے سے، گود میں لے کر چلنے/ٹہلنے سے، اوندھا لٹانے سے بچے کو وقتی آرام ہوتا ہے لیکن جب درد شدت سے ہو تو سارے حربے ناکام ہو جاتے ہیں۔ بچہ رو رہا ہوتا ہے اور اوپر کی طرف اپنی پیٹھ کو اٹھاتا ہے۔ ہومیو پیتھک دوا کی ننھی منی گولیاں یا قطرے بچے کی اس تکلیف کے لیے بھی اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں اور منٹوں میں بچہ گیس خارج کر کے سکون کے ساتھ بے خبر سو جاتا ہے۔

قے/الٹی کرنا

بچہ اگر دودھ پینے کے تھوڑی دیر بعد پھٹے ہوئے دودھ کی طرح قے کرے، تھوڑی مقدار ہو تو کوئی خاص بات نہیں لیکن اگر بار بار کرتا ہے اور روزانہ اور دودھ پیتے ہی کرتا ہے تو پہلے دیکھیں کہ بچے کو آپ نے ڈکار دلوائی ہے کہ نہیں اگر نہیں تو اچھی طرح دلائیں۔ اپنے کندھے سے لگا کر آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپتھپائیں جب ڈکار آجائے تو اس کو سیدھا لٹائیں سر تھوڑا سا اونچا کر کے۔ اگر اس کے باوجود آرام نہ آئے تو ڈاکٹر سے رجوع کریں، پُرسکون ادویات موجود ہیں۔

دست

یہ بھی ایک بڑا عام مسئلہ ہے جو عموماً صفائی نہ

ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یا دودھ کی وجہ سے۔ ماں اپنا دودھ پلانے سے پہلے اپنے نپل کو کسی صاف کاٹن کے کپڑے سے گرم پانی سے صاف کر لے اور اگر بچہ بوتل سے پیتا ہے تو اس کو دودھ دینے سے پہلے اچھی طرح صاف کر کے گرم پانی سے دھوئیں۔ اگر اس کے باوجود مسئلہ باقی رہے تو ڈاکٹر سے رجوع کریں تاکہ وہ دودھ کا تعین کر کے اس کے مطابق دوا دے (عام دودھ، ماں کے دودھ کی خرابی، کسی کھانے یا دوائی کی وجہ سے یا پاؤڈر والا دودھ بچے کو سوٹ نہیں کر رہا ہے، ماں یا بچے کو ٹھنڈ لگ گئی، کوئی انفیکشن وغیرہ) کان میں درد، نزلہ، بخار، کھانسی یہ بھی ان بچوں میں عام شکایات ہیں۔

3۔ 4 ماہ سے 2 سال تک

بچے کا وزن بڑھنا، اس کا قد بڑھنا، اس کا اوندھا ہونا، گھٹنوں کے بل چلنا، کھڑا ہونا، چلنا بھاگنا، بولنا، گردن کا ٹھہرنا، تالو کا بند ہونا، دانت نکالنا، دیکھنا، شناخت کرنا، سننا، بولنے کی کوشش کرنا، ہنسنا، یہ سب ایک نارمل بچے میں اس عرصہ میں آہستہ آہستہ شروع ہو جاتی ہیں اور اگر نہ ہوں تو یقیناً اپنے ہومیو پیتھک معالج سے رجوع کریں۔ وہ آپ کے بچے کو ادویات تجویز کرے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں گے۔

4۔ پری اسکول بچے

(2 سال سے 5 سال)

یہ بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا زمانہ ہے جس میں ان کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ان کی تعلیمی تربیت کا بھی آغاز کر دیا جاتا ہے۔ اس میں اگر بچے صحیح طور پر اپنی کارکردگی نہیں دکھا پا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں (i) غذائی کمی ہے (ii) ان کا وزن کم ہے (iii) ان میں خون اور کیلشیم کی کمی ہے (iv) زیادہ لاڈ پیار نے ان کو بگاڑ دیا ہے۔ (v) بھوک کی کمی (vi) نیند کی بے قاعدگی (vii) پیٹ کے کیڑے وغیرہ (viii) بستر پر پیشاب کرنا۔ یقیناً ہومیو پیتھک معالج سے مل کر آپ اس کے حل کے لیے ایک اچھا مشورہ اور دوا تجویز کرا سکتے ہیں۔

5۔ اسکول جانے والے بچے

(5 سال سے اوپر)

یہ دور بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا وہ اہم دور ہے جس میں نہ صرف وہ سیکھتے سمجھتے ہیں بلکہ اس کی نقالی بھی کرتے ہیں۔ یہ دور اُن کی جذباتی نشوونما کے لیے بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔ یہاں آپ اپنے بچے کو ذہین اور ہوشیار بھی بنا سکتے ہیں اور ایک نفسیاتی مریض بھی۔ بچوں کی زندگی کا یہ جُز ان کو زندگی کو سمجھنے کے لیے اپنے طور پر تجربات کے لیے اُکساتا ہے۔ وزن کی کمی، بھوک کی کمی، ضدی، پڑھائی سے بے رغبتی، اسکول سے جی چرانا یا کسی خاص مضمون سے نفرت یا چڑ (اسکول فوبیا) وزن کی زیادتی بہت زیادہ، ہر وقت کھاتے رہنا، پیٹ کے کیڑے، سر کی جوئیں، دانتوں کی خرابی، ٹانسلز، نزلہ زکام، دمہ کی تکالیف، قد نہ بڑھنا، سبق کا یاد نہ ہونا، حافظہ کی کمزوری، امتحان کا خوف۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کو حل کرنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ یہاں اس کے لیے والدین کو استاد اور معالج سے مل کر بچے کے مسئلے کے متعلق پہلے بات کرنی ہوگی۔ پھر وجہ کا تعین کرتے ہوئے اپنے اپنے کردار کو ادا کرنا ہوگا۔ یاد رکھیں مسئلہ کچھ بھی ہو اور بظاہر کتنا ہی مشکل ہو، اس کا حل موجود ہوتا ہے

بشرطیکہ ہم اس کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرنا چاہیں۔ رونے سے، گھبرانے سے، پریشان ہونے سے یا اس مسئلے سے نظر چرانے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے بلکہ مزید تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھیں بچوں کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے لیے ہومیو پیتھی میں ادویات موجود ہیں جو آپ کے بچوں کو:

1۔ بغیر کسی ضمنی اثرات و نقصانات کے فائدہ پہنچاتی ہیں۔
2۔ نہ صرف یہ کہ اس مسئلے کو حل کرتی ہیں بلکہ ...... دیگر بیماریوں کو بھی ٹھیک کر دیتی ہیں۔
3۔ بچوں کی قوتِ مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ جلدی جلدی بیمار نہیں ہوتے۔
4۔ کھانے میں خوش ذائقہ۔
5۔ دوا کھانا اور کھلانا دونوں آسان۔

ویسے تو کئی ادویات ہیں جو دورانِ علاج مختلف حالتوں/کیفیتوں/ میں جیسا کہ اوپر بیان کی گئی ہیں استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن ہم چند دوائیوں کے نام دلچسپی کے لیے دے رہے ہیں لیکن یاد رکھیں دوا بغیر ڈاکٹر کے مشورے کے استعمال نہ کریں۔

Bell, Bry, Cham , Calc. Phos, Fer. Met, Fer. Phos Colocynth, Ipecac, Cina, Lyco, Mag. Phos, Nat.Phos, Puls, Nux, Podo, China, etc.

کولیسٹرول
کیا ہے؟ کیوں بڑھتا ہے؟
جب یہ بڑھ جائے تو کیا کریں؟

آج کل کے موجودہ دور میں انسان نے اپنی تن آسانی کے لیے بہت ساری مشینیں بنائی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کا جسمانی مشقت کرنا کم



ہو گیا ہے اور ہماری ثقافتی روایت کے تحت جو کھانے استعمال ہوتے ہیں اور نئی نسل کے فاسٹ فوڈز (برگر و پیزا) ان میں بہت زیادہ نشاستہ اور چربی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نہ صرف ہمارے وزن میں بے تحاشا اضافہ بلکہ کولیسٹرول، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے دیگر امراض میں اضافے کا باعث بن رہی ہیں۔ ہر سال ہزاروں پاکستانی جن میں 40 سال سے کم عمر کے افراد بھی شامل ہیں دل کے دورے سے مر جاتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم یہ جانیں کہ کولیسٹرول کیا ہے؟

یہ ایک سفید موم جیسا چکنا مادہ ہے جو ہر انسانی جسم میں اس کا جگر کئی گرام کولیسٹرول تیار کر کے قدرتی طور پر خون میں شامل کرتا ہے۔ انسانی خون میں پائی جانے والی چکنائیوں میں کولیسٹرول، فاسفولیپڈز اور ٹرائی گلیسرائیڈز قابلِ ذکر ہیں۔ ان چکنائیوں میں کیلوریز کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔

غذا میں دو طرح کی چکنائیاں پائی جاتی ہیں۔
(ا) سیر شدہ (سیچوریٹڈ) اور دوسری غیر سیر شدہ (اَن سیچوریٹڈ)

سیر شدہ چکنائی سرخ گوشت، ڈیری مصنوعات، بیکری کی مصنوعات بعض نباتاتی تیلوں مثلاً پام آئل یا ناریل کے تیل وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ چیزیں کولیسٹرول بڑھانے کا سبب بنتی ہیں۔

غیر سیر شدہ چکنائیوں میں پولی اَن سیچوریٹڈ

چکنائیاں بھی شامل ہیں۔ یہ ہمیں سورج مکھی، زیتون، مکئی، سویابین، کینولا کے تیلوں، نرم مارجرین مچھلیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ خون میں کولیسٹرول کی سطح کو بڑھانے کا سبب نہیں بنتیں۔

واضح رہے کہ ہر قسم کی چکنائی میں کیلوریز کی بہت زیادہ مقدار ہوتی ہے جو وزن بڑھانے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انسانی جسم کو کولیسٹرول کی ضرورت ہوتی ہے نئے خلیوں کے بننے میں اور ہارمونز کی تیاری کے لیے لیکن اس کی زیادتی مسائل پیدا کر سکتی ہے۔

کولیسٹرول:

کولیسٹرول خون میں پائی جانے والی ایک اہم چکنائی ہے۔ یہ جگر میں بنتی ہے، کئی گرام کولیسٹرول روزانہ ہمارا جگر تیار کرتا ہے لہٰذا ایسی غذاؤں سے پرہیز کرنا چاہیے جن میں سیر شدہ چکنائی کی مقدار زیادہ ہو۔ ایسی غذاؤں کے استعمال سے جگر میں کولیسٹرول کی مقدار بڑھ سکتی ہے اور یہ اضافی کولیسٹرول خون میں شامل ہو سکتی ہے۔

کولیسٹرول کی اقسام:

ا۔ ایل ڈی ایل

Low Density Lipoprotein

کولیسٹرول کی اس قسم سے خون کی نالیوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے کیونکہ یہ خون کی نالیوں کی اندرونی دیواروں میں جمع ہونے لگتا ہے اس کو بلاک کہتے ہیں یہ خون کی نالیوں کو تنگ کرتا ہے جس کی وجہ سے نالیوں میں خون کا دوران ختم ہو جاتا ہے جو دل کے دورے کا باعث بن سکتا ہے۔ مرغن غذاؤں کے استعمال، پُرتعیش زندگی اس کے بڑھنے کے اسباب میں سے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک خراب کولیسٹرول ہے۔ اس کی نارمل حد 130 سے کم 160 سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ ٹرائی گلیسرائیڈز

Tryglycrides

یہ بھی چکنائی کی ایک قسم ہے۔ مردوں میں اس کی نارمل حد 160-40 ملی گرام فی سو ملی لیٹر ہے۔ عورتوں میں اس کی نارمل حد 135-35 ملی گرام فی سو ملی لیٹر ہے۔ جب چکنائی اور شکر کا زیادہ استعمال کیا جائے تو خون میں یہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے، خون کو گاڑھا کرتی ہے اور لوتھڑا بناتی ہے۔ جس سے دل کو جانے والے خون کا بہاؤ کم ہوتا ہے۔

۳۔ ایچ ڈی ایل

High Density Lipoprotein

یہ کولیسٹرول کی وہ واحد قسم ہے جس کے بڑھنے کا تو فائدہ ہے یعنی اس کے بڑھنے سے دل کے دورے سے محفوظ رہتے ہیں اس لیے یہ ایک اچھی قسم کی کولیسٹرول ہے۔ یہ ورزش یا ورزشی کام کرنے سے بڑھتی ہے۔ مچھلی، تازہ ہری سبزیاں اور فروٹ خصوصاً رس والے پھلوں سے اس کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے، وٹامن سی بھی اس کو بڑھاتا ہے۔ 20 سے 25 منٹ کی دھوپ بھی اس میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔